زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسو

جلد:۱۶ شمارہ مئی، جون ۲۰۰۷ء

مجلسِ مشاورت — قارئینِ چہارسو

زرِ سالانہ — دلِ مضطرب شکرِ گزارانہ

چہارسو کا زیرِ نظر شمارہ

جسدِ ارضی پر برق رفتاری سے مفقود ہوتی

محبت، مروّت، تحمل، تدبر، رواداشت

اور

رواداری سے منسوب ہے۔

بانی مدیرِ اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل

گلزار جاوید

مدیرِ معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537، ویسٹرج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیصل اسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہار سُو

ooo

نوائے پوٹھوار

قاری شا

نام: نند کشور دت

قلمی نام: نند کشور وکرم

والدین: شری رام لول دت، شریمتی کوشی دت

ولادت: ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ء راولپنڈی شہر (پاکستان)

تعلیم: بی اے (۱۹۵۷ء پنجاب یونیورسٹی)

ایم اے فارسی (۱۹۵۸ء پنجاب یونیورسٹی)

ایم اے اُردو (۱۹۶۶ء دہلی یونیورسٹی)

ادیب فاضل

ملازمت: ۳۰ ستمبر ۱۹۹۷ء کو سنٹرل انفارمیشن سروس سے سبکدوش۔

شادی: ۱۱ مئی ۱۹۶۱ء

اہلیہ: آشا دت

بچوں کے نام: تین بچے۔ رتو ملہوترا (بیٹی)، وکاس دت (بیٹا) جوہی بالی (بیٹی)

پہلی تخلیق: دسمبر ۱۹۵۷ء میں افسانہ "ادیب" ماہنامہ "ترقی" دہلی میں شائع ہوا۔

صحافت: ۱۹۴۸ء میں کانپور میں سیلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ "قومی اخبار" اور "مسرت" سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء میں کانپور ہی سے "ماہنامہ ارتقا" کا اجرا کیا جو جلد ہی بند ہو گیا۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں نئی کہانی کی ادارت کی۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۹ء سرکاری رسالے "آج کل" نئی دہلی میں بحیثیت سب ایڈیٹر/اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ رہے۔ ۱۹۸۵ء سے اُردو کے ادبی جریدے "عالمی اُردو ادب" کی ادارت کر رہے ہیں۔

انعامات و اعزازات: ۱۹۷۰ء میں کوہ پیمائی پر وزارت زراعت حکومت ہند کا انعام ۱۹۷۲ء میں سفید انقلاب مسودے پر وزارت زراعت حکومت ہند کا انعام ۱۹۸۲ء میں ناول یادوں کے کھنڈر پر دہلی اُردو اکادمی اور مغربی بنگال اُردو اکادمی کا انعام۔

۱۹۹۸ء میں افسانوی مجموعے آوارہ گرد پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام

۲۰۰۱ء میں تجرباتی ناول "انیسواں ادھیائے" پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام قبول نہیں کیا۔

اُردو سے ہندی میں ترجمے پر انوواد پریشد نئی دہلی کا ۹۹-۱۹۹۸ء کا دوی واگیش پرسکار۔

۱۹۹۶ء میں ہندی میں تخلیقی ادب اور صحافت میں نمایاں کارکردگی پر سکھوں کی آواز کی جانب سے فکی آڈیٹوریم نئی دہلی میں اعزاز دیا گیا۔

سیاحت: فرانس، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، نیپال

مطبوعات:

اُردو: غالب۔ حیات و شاعری (۱۹۶۹ء) کوہ پیمائی یادوں کے کھنڈر (۱۹۸۱ء) محمد حسین آزاد (۱۹۸۳ء) آوارہ گرد (افسانے ۱۹۹۸ء) انیسواں ادھیائے (۲۰۰۱ء) نئی افسانے ۱۹۸۲ء تا منتخب افسانے ۲۰۰۲ء (ہر سال انتخاب)

ہندی: یادوں کے کھنڈر (ناول ۱۹۹۶ء)

آوارہ گرد (افسانے ۲۰۰۰)

انیسواں ادھیائے (تجرباتی ناول ۲۰۰۲ء)

تراجم:

اُردو سے ہندی: آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر کا ناول ۲۰۰۰)۔

تصویریں:

(سعادت حسن منٹو کے تحریر کردہ خاکوں پر مبنی کتاب کا ترجمہ و تدوین ۲۰۰۱ء)، پاکستان کی شریشٹھ اُردو کہانیاں، اُردو کی سرو شریشٹھ کہانیاں، اُردو کی سرو شریشٹھ ہاسیہ کہانیاں کے علاوہ اُردو کتھا کار سیریز کے تحت پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، دیویندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اپیندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلراج مینرا، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، رام لعل، ممتاز مفتی، انتظار حسین وغیرہ پر کتابیں شائع کیں۔

ہندی سے اُردو: گرہ داہ (شرت چندر چٹرجی کا ناول ۱۹۷۶ء)

پنجابی سے اُردو: [illegible] (امرتا پریتم کا ناول) جنگی قیدی (کیسر سنگھ کا ناول)

انگریزی سے اُردو: گیانی ذیل سنگھ (۱۹۹۱ء)

پتہ: F-14/21-D کرشن نگر دہلی۔

☆

چچا سام کے نام دسواں خط

کرشن مہرؔدی F-14/21-D

چچا جان تسلیم و آداب!

امید کہ آپ خوش و خیریت سے ہوں گے کیونکہ آپ کی نظرِ کرم سے دنیا سے خیریت کا نام و نشان مٹتا جا رہا ہے۔ اور عراق پر آپ کے زبردستی قبضے کے بعد تو خوف و ہراس کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ آپ کسی بھی ملک پر آفت بن کر نازل ہو سکتے ہیں اور اس کی ہستی کو چند دنوں ہی میں نیست و نابود کر سکتے ہیں۔

محترم اسی خوف و ہراس کے عالم میں میں یہ دسواں خط آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ مگر آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے نو خطوط آپ کی خدمت میں کب ارسال کئے تھے؟ حیران مت ہوئیے جناب! کیونکہ اس سے پیشتر میں نے نہیں بلکہ اس برصغیر کے ایک ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اپنی رہائش گاہ "۳۱ لکشمی مینشن" ہال روڈ لاہور سے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۱ اور ۲۱ اپریل ۱۹۵۴ء کے دوران آپ کی خدمت میں ارسال کئے تھے مگر افسوس کہ آپ نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور وہ بے چارہ جواب کے انتظار میں ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گیا۔ مگر آپ نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ نظر آتا ہے کہ اس خط کا بھی یہی حشر ہو گا اور اب کی بار یہ بندۂ ناچیز بھی منٹو کی طرح اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائے گا اور آپ اپنی فرعون مزاجی کے سبب اس خط کو بھی بڑی حقارت و تحقیر سے صرف دیکھ کر ہی اپنی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں گے۔

لیکن میرے خط اور منٹو کے خطوط میں تھوڑا سا فرق ہے۔ منٹو نے تو آپ کو برصغیر کی صورتِ حال اور آپ کی توسیع پسندی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ آپ اسے ایک مرتبہ اپنے یہاں امریکہ آنے کی دعوت دیں اور تین مہینے اپنی "سات آزادیوں والی مملکت" کی سیر کرائیں مگر آپ نے اسے اپنے یہاں نہیں بلایا کیونکہ شاید آپ کو اپنے سفارت خانے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ ایک "عریاں اور فحش" افسانہ نگار ہے اور وہ کسی کو بھی عریاں کرنے سے باز نہیں آتا چاہے اس کے لئے اسے مقدمے اور قید و بند کا بھی سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور یہ بات اس نے اشاروں اشاروں میں آپ کو اپنے خطوط میں واضح بھی کر دی تھی کہ امریکہ کی سیر کرنے کا موقع ملنے پر وہ بندۂ آزاد آپ کی تمام منفرد صلاحیتوں اور خوبیوں کا اعتراف بڑے جاندار الفاظ میں کرے گا۔ اور اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کی ذہانت سے خوش ہو کر آپ اس کا حسنِ اعتراف سے محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب آپ کسی ملک یا فرد کو امداد دیتے ہیں تو اس کے پیچھے آپ کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور بالآخر اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اور آپ جانتے تھے کہ منٹو کو ڈالر دے کر آپ کو کچھ نہیں ملتا اس لئے آپ نے اس بے چارے کو ایک کہانی کے صرف تین سو روپے کی پیشکش کر کے ٹرخا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا کہ اس نے کہا تھا وہ سستی اور گھٹیا شراب پی پی کر موت سے دوچار ہو گیا۔ اپنے خطوط میں اس بندۂ آزاد نے آپ کو کئی نیک مشورے بھی دئے تھے جن میں سے ایک یہ تھا آپ پاکستان میں اپنا خیر سگالی وفد بھی بھیجیں جس میں اس دور کی مقبول ترین ایکٹرس ریتا ہیورتھ بھی شامل ہو۔ مگر آپ نے اس کے مشورے پر دھیان تک نہ دیا حالانکہ اس بے چارے نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جب آپ کا خیر سگالی وفد لاہور پہنچے گا تو وہ آپ کو لاہور کا ہیرا منڈی بازار بھی دکھائے گا۔ شاید اس لئے کہ وہ آپ کی اور رنڈی کی خصلت ایک سمجھتا تھا۔ رنڈی اپنے حسن و شباب کی دولت سے مردوں کو لبھا کر ان کی دولت اور جائداد پر قبضہ کر کے انہیں مفلس و نادار بنا دیتی ہے اور آپ بھی کمزور اور غریب ممالک کو مالی اور فوجی امداد دے کر بالآخر وہاں اپنا تسلط قائم کر کے انہیں تباہی و بربادی سے دوچار کر دیتے ہیں۔ اور جب دونوں کا مقصد ایک ہو تو دونوں میں فرق بھی کیا رہا۔

منٹو آپ کی شاطرانہ چالوں سے خوب واقف تھا اسی لئے اس نے اپنے خطوط میں کہیں کہیں آپ پر چھینٹے بھی اڑائے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے ہی اسے عراق کی بربادی کا کچھ کچھ احساس ہو گیا تھا تبھی تو جب ۱۹۵۴ء میں آپ نے عراق کو "غیر مشروط فوجی امداد" دی تھی تو اس نے طنز کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں تحریر کیا تھا کہ "چچا جان آپ میرے پاس ہوتے تو میں آپ کے پاؤں چوم لیتا۔ خدا آپ کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ اسلامی ممالک پر جو آپ کی نظرِ کرم ہو رہی ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت جلد مشرف بہ اسلام ہونے والے ہیں۔"

اور ہاں آپ کو حیرت ہو رہی ہو گی کہ میں یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں۔ دراصل جب سے آپ نے اقوامِ متحدہ کی تجاویز کو ٹھکرا کر عراق پر قبضہ جمایا ہے تب سے میری نیند غائب ہو گئی ہے اور مجھے یہ چنتا ستا رہی ہے کہ معلوم نہیں کہ کب آپ اپنی طاقت اور شاطرانہ چالوں سے ہمیں اپنی جارحانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا دیں۔ یہ احساس صرف مجھے ہی نہیں بلکہ برصغیر کے بڑے بڑے رہنماؤں کو ستا رہا ہے اور اس خدشے کا اظہار بھارت اور پاکستان کے کئی رہنما کر بھی چکے ہیں۔ خود پاکستان کے صدرِ مملکت جنرل مشرف اور ہندوستانی وزیرِ اعظم بھی گزشتہ دنوں اس خطرے کے لاحق ہونے کا اشاروں اشاروں میں اظہار کر چکے ہیں اور وہ بھی اندر سے پریشان دکھائی پڑتے ہیں۔

آپ کی اس جارحانہ فوجی کارروائی کے خلاف دنیا کے ڈیڑھ سو سے زائد ممالک نے آواز بلند ہی نہیں کی بلکہ ان ممالک کے دو ہزار سے زائد شہروں کے کروڑہا افراد نے آپ کے جارحانہ اقدام کے خلاف اور اس کے حق میں جلوسوں اور مظاہروں کی صورت میں اپنی آواز بھی بلند کی تھی۔ اور خود آپ کے ملک میں بھی لاکھوں افراد نے اس کے خلاف پُر جوش مظاہرے کر کے اس

جنگ کے خلاف اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کیا تھا لیکن اس کا آپ پر رتی بھر اثر نہیں ہوا۔ آپ کی اس داداگیری کو دیکھتے ہوئے دنیا بھر کے عوام کی زبان پر بار بار یہ فقرہ آتا تھا کہ کاش آج سوویت روس ہوتا۔ سوویت روس کی موجودگی سے کم از کم کوئی آپ کو روکنے کی جرأت تو کر سکتا تھا۔ اس کے خاتمے سے آپ کی دادا گیری بے لگام ہو کر رہ گئی ہے۔ اور آپ بے روک ٹوک اپنی من مانی کرنے پر تُل گئے ہیں۔ اور اب آپ نے عراق ایسے کمزور اور نہتے ملک پر اپنے فوجی تسلط سے ثابت کر دیا ہے کہ آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں عالمی قوانین اور اقوام متحدہ کی تجاویز کے پرخچے اڑا کر بلکہ انہیں پاؤں تلے روند کر دنیا کے کسی بھی ملک پر دھاوا بول سکتے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جب طاقتور ممالک کو اپنی من مانی کرنا ہے تو اقوام متحدہ کا کیا کردار رہ گیا ہے؟ کیا اس کا حشر بھی لیگ آف نیشنز جیسا نہیں ہوگا؟

آپ کی اس جنگجویانہ اقدام کے بارے میں بھی کو پہلے سے ہی احساس تھا کہ اس کا مدعا بے مقصود طاقت اور جارحیت کے ذریعے پٹرول کے ذخیروں کو اپنے قبضے میں لانا اور کمزور ممالک کو اپنے زیر تسلط لا کر انہیں اپنی نو آبادیوں میں تبدیل کرنا ہے۔ عراق کی بار کمزور اور ترقی پذیر ممالک کے لئے ایک خطرہ بن گئی ہے اور بھی اندر سے خوفزدہ ہیں کہ نہ جانے کب وہ آپ کی جارحیت کا شکار ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے حکمران اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کی خاطر آپ کی غلامی قبول کرنے کو تیار ہیں مگر ان ممالک کے کروڑوں عوام کو یہ تضحیک و ذلت ہرگز ہرگز گوارا نہیں مگر وہ بیچارے کر بھی کیا سکتے ہیں؟ کیونکہ اُن کے پاس طاقت نہیں اور آج طاقت صرف آپ کے پاس ہے جس کی وجہ سے آپ سپر پاور بننے کے بعد اب داداگیری پر اتر آئے ہیں۔ مگر چچا جان! جس دن اُن کے پاس طاقت آ گئی تو آپ کی خیر نہیں۔

عراق پر حملے سے پہلے آپ نے عراق کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر کے رائے عامہ کو اس کے خلاف کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ آپ صدام حسین کو ہٹا کر وہاں کے پٹرول کے ذخیروں پر تسلط جما سکیں۔ لیکن اندر سے آپ ڈرتے بھی تھے کہ اگر صدام حسین کے پاس جدید اور خطرناک ہتھیار ہوئے تو پھر کیا ہوگا۔ اس کے لئے آپ نے جنگ چھیڑنے سے پیشتر بڑی عیاری سے وہاں اقوام متحدہ کے آبزرور اور انسپکٹرز بھیج کر اور وہاں ہتھیاروں کو تباہ کر کے اپنے لئے میدان صاف کر لیا اور تسلی کر لی کہ اب عراق بالکل نہتہ ہو چکا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اور حملے کے دوران آپ کا یہ پروپیگنڈہ بھی جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوا کہ عراق جنگ میں کیمیکل ہتھیاروں کا استعمال کرے گا۔ حالانکہ دنیا نے دیکھ لیا کہ عراق کے پاس کوئی کیمیکل یا مہلک ہتھیار تھا ہی نہیں۔ وہ سب دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے آپ کا جھوٹا پروپیگنڈہ تھا۔

عراق پر حملے کے موقع پر مجھے اس روایتی معصوم میمنے اور خونی بھیڑیے کی کہانی بار بار یاد آتی تھی جس میں خونخوار بھیڑیا جھوٹی اور بے بنیاد الزام تراشیوں کے بعد آخر کار اس معصوم اور بے قصور میمنے کو ہلاک کر کے اپنی بھوک مٹا لیتا ہے کیونکہ عراق جیسا کمزور ملک بھلا آپ سے کیا مقابلہ کر سکتا تھا؟ جب کہ اس کا فوجی بجٹ صرف ڈیڑھ ارب ڈالر ہے اور آپ کا ایک ہزار چار سو ارب ڈالر۔ یعنی کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ لیکن پھر بھی صدام حسین کی ہمت اور جرأت کی داد دینی چاہیے کہ اس نے تین ہفتے تک اپنی حکمت عملی سے آپ کو عراق پر قابض نہیں ہونے دیا حالانکہ آپ کا دعویٰ تھا کہ آپ تین چار دن میں عراق پر قبضہ جمالیں گے مگر آپ ایسا نہیں کر پائے۔ اس بات کا آپ سے زیادہ مجھے افسوس ہے کہ آپ اس جنگ کو مختصر ترین بنا کر اپنا نام گنیز ریکارڈ بک میں درج نہیں کرا پائے۔ حالانکہ گنیز ریکارڈ بک کے مطابق دنیا کی سب سے مختصر جنگ آپ کے حلیف برطانیہ اور زنجی بار کے درمیان ۲۷ اگست ۱۸۹۶ء کو وقوع پذیر ہوئی تھی جو صبح نو بج کر دو منٹ پر شروع ہوئی تھی اور نو بج کر چالیس منٹ پر ختم ہو گئی تھی۔ یعنی برطانوی بیڑے نے ریئر ایڈمرل ہیری ہولڈزورتھ راسن کی سربراہی میں صرف (Rear_Adm. Harry Holdsworth Rawson) اڑتیس منٹ میں ہی وہاں کے خود ساختہ سلطان سعد خالد کے محل پر بمباری کر کے اس کی جگہ حامد بن محمد کو وہاں کا حکمران بنانے کا کمال کر دکھایا تھا مگر افسوس کہ آپ اس کا ریکارڈ توڑنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکے۔

ہو سکتا ہے بقول آپ کے صدام حسین نے اپنے ملک میں جبر و استبداد کا بازار گرم کیا ہو۔ لیکن کیا آپ وہاں کے عوام کے گارڈین تھے کہ آپ انہیں اس کی آمریت سے نجات دلانا چاہتے تھے اور بھلا اس کا کیا جواز ہے کہ اُسے ہٹانے کے لئے آپ بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کی تجاویز اور عالمی رائے عامہ کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ملک کو ہی تہس نہس کر دیں۔ یہاں تک کہ سکولوں، ہسپتالوں و رہائشی مکانوں کو تباہ و برباد کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے بے قصور شہریوں کو بھی لقمۂ اجل بنا دیں۔

کتنی افسوسناک بات ہے کہ بے شمار معصوم اور بے قصور افراد کو بموں اور گولیوں کا نشانہ بنانے کے باوجود بھی آپ کا دشمن صدام حسین جو کبھی آپ کا دوست تھا، آپ کے ہاتھ نہیں لگا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ صدام حسین اور اسامہ بن لادن کبھی آپ ہی نے اپنے مقاصد کے لئے میدان میں اُتارے تھے اور آج دونوں کو آپ اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ اسامہ بن لادن کو ہلاک کرنے یا زندہ گرفتار کرنے کے لئے آپ نے افغانستان پر طاقت کے بل بوتے پر تسلط جما کر اپنی من مرضی کی حکومت قائم کر ڈالی لیکن وہاں اتنی تباہی و بربادی پھیلانے کے باوجود بھی آج تک آپ اسامہ بن لادن کو ڈھونڈ کر اُسے عبرتناک سبق نہیں سکھا سکے۔ اسی طرح صرف صدام حسین کو ہلاک کرنے کے لئے آپ نے عراق کے بڑے بڑے شہروں، بغداد، بصرہ، کوفہ، کربلا، موصل، نجف کو تہس نہس کر دیا۔ اور اب آپ اُسے زندہ یا مردہ پکڑنے کے لئے پریشان ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ یا مردہ کبھی آپ کے ہاتھ لگ جائے مگر ہوگا کیا۔ میرا

خیال ہے کہ اُس کا زندہ یا مردہ بھوت آپ کے اور آپ کے حلیفوں کے سر پہ ہمیشہ منڈلاتا رہے گا اور ہوسکتا ہے کہ اُس کے ہاتھ نہ آنے سے آپ خبط الحواس کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ اور اب اس کا کیا بھروسہ کہ آپ اپنے جس چہیتے عراقی کے ہاتھ اُس ملک کی باگ ڈور سونپیں گے کل وہ آپ کے خلاف کھڑا نہیں ہو جائے گا۔ تاہم آپ کون سا اُسے آزادی سے حکومت کرنے دیں گے۔ حکومت تو آپ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہی ہوگی۔ اور جس دن اُس نے آپ سے بغاوت کی، آپ کے حکم سے انحراف کیا تو پھر اُس کا حشر بھی صدام حسین والا ہی ہوگا۔

عراق کی قدیم تہذیب کی نشانیوں کو نیست و نابود کرنے، بے شمار لوگوں کو تہہ تیغ کرنے اور بغداد پر فتح پانے کے بعد بھی جب صدام حسین آپ کے ہاتھ نہ آئے تو آپ نے اُس کے بھاری بھرکم بُت کو نشانہ بنا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ عراقی عوام نے غصے سے صدام حسین کے بُت کو توڑ دیا ہے۔ حالانکہ اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ پہلے آپ کے فوجیوں نے اُس پر امریکی جھنڈا لگایا اور بعد ازیں کرین کی مدد سے اُسے جو بچی موجودگی میں بڑی تگ و دو کے بعد توڑا اور پھر کچھ شر انگیز عناصر بھی آپ کے ساتھ ہو لئے۔ اگر آپ صرف بتوں کو توڑنے پر ہی اکتفا کرتے تو غنیمت تھا مگر آپ نے تو شر انگیز عناصر کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھوٹ دے کر ملک میں طوائف الملوکی کا ماحول پیدا کر دیا۔ حالانکہ آپ کا فرضِ اولین تھا کہ آپ بغداد اور ملک کے دیگر علاقوں کی سول حکومت کو مضبوط کرتے اور عراقی عوام کو پُر امن اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کی سہولیات فراہم کر کے ان کے دل جیتنے کی کوشش کرتے۔ آپ کے ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ہی آج عراق کے پریشان عوام اضطراب و بے چینی کا شکار ہو کر آپ کے خلاف مظاہروں پر اُتر آئے ہیں۔ اور عراق کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مجھے اس خطے کے عظیم حکمران ہارون الرشید کی یاد آ رہی ہے جو رات کو بغداد کے کوچہ و بازار میں گھوم کر اپنی رعایا کی حقیقی حالت کا پتہ لگانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی بے قرار روح آج بھی بغداد شہر کے بازاروں اور گلیوں میں گھوم کر آپ کی جانب سے کی گئی تباہی و بربادی پر خون کے آنسو بہا رہی ہوگی۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے خلاف آپ کے ملک کے عوام نے جو شدید غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اُس سے آپ اندر ہی اندر بے حد پریشان ہیں اور اب اتنے انسانوں کو ہلاک کرنے کے بعد بھی صدام کی لاش تک بھی ہاتھ نہ آنے سے آپ کی پریشانی اور بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس پریشانی کا خاتمہ شاید مستقبل قریب میں ممکن نہیں۔ کیونکہ آپ کی پریشانی سے آپ کی جارحیت میں مزید اضافہ ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ کل کوئی اور کمزور ملک آپ کی جارحیت کا شکار بن جائے۔

لیکن یہ مت سمجھئے کہ عراق پر قبضہ کر لینے کے بعد آپ کا مقصد پورا ہوگیا ہے اور آپ سرخرو ہو گئے ہیں۔ آج دنیا بھر کے عوام خصوصاً مسلمان عراق پر آپ کے قبضے اور وہاں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی سے بے حد غم و غصہ میں ہیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن میں پائے جانے والے انتہا پسند گروہوں کے اندر دہشت گردی کا ایک بہت بڑا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور خود کش گروہ اور افراد اس تحریک اور بے حرمتی کا بدلہ لینے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اور میرا تو خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو چین سے نہیں جینے دیں گے۔ اور مستقبل قریب میں اگر دنیا کے مختلف ممالک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر جیسے واقعات ظہور پذیر ہوں تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہوگی۔

اور آخر میں .... آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور یہ مشورہ منٹو کے مشورے سے الگ ہے۔ منٹو نے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ ایک بار اُسے امریکہ کی سیر کا موقع فراہم کر دیں لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتا کیونکہ آپ کی خوبیاں اور صلاحیتیں تو ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہیں۔ اور میں بھی آپ کے ملک میں چار پانچ مہینے رہ کر آپ کی خوبیوں سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں اور یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ آپ کے یہاں کتنی آزادی اور جمہوریت ہے۔ میرا تو بس اتنا سا مشورہ ہے کہ عراق خالی کرنے سے پہلے (خالی تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا) آپ بغداد میں اپنے جنگی کارناموں کی یاد میں "فتح العراق" نام کا میوزیم تعمیر کرا دیجئے تاکہ آپ نے وہاں جو قدیم نیشنل میوزیم اور لائبریری کو تباہ و برباد کیا ہے اُس کی کچھ تلافی ہو جائے اور ساتھ ہی آپ کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں روشن ہو جائے۔ میرا مختصر مشورہ ہے کہ اس میوزیم کو تعمیر کرا کے آپ اس میں اپنے تباہ کن ہتھیاروں اور اُن سے عراق کے وسیع و عریض علاقے میں کی گئی تباہی و بربادی سے متعلق ساز و سامان اور تصویروں اور شکستہ بتوں کی نمائش کا اہتمام بھی کر دیجئے تاکہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہو سکے کہ اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کے علمبردار، جمہوریت پسند اور انسان دوست کہلوانے والے چچا سام در حقیقت ہلاکو، چنگیز خان، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور گزشتہ نصف صدی میں ہیروشیما، ناگاساکی، کوریا، ویتنام میں جو کچھ ہوا وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ کی انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کیا ہے؟ آپ نے تو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اقوامِ متحدہ اور دنیا بھر کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے اس کمزور اور بے ساز و سامان ملک کو اپنے انتہائی جدید اور خطرناک ہتھیاروں سے تباہ و برباد کر کے اپنی فتح کا جھنڈا بلند کیا ہے اور اس یک طرفہ جنگ میں یہاں کی قدیم تہذیب و تمدن کے امین نیشنل میوزیم اور لائبریری کے علاوہ وہاں کی درسگاہوں اور ہسپتالوں کو بھی تہس نہس کیا بلکہ ننھے ننھے معصوم بچوں اور نہتے اور بے قصور انسانوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔

دعا گو ہوں کہ آپ کا خدا آپ کو عقل دے۔ آمین۔

آپ کا خوفزدہ بھتیجا ...... نند کشور وکرم

براہِ راست

آپ کے علم میں ہے جنابِ نند کشور وکرم کا آبائی تعلق راولپنڈی سے ہے جس کے باعث ادارہ "چہارسُو" پر اُن کی پذیرائی قرضِ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایسا قرض ہے جو استحقاق کی کڑی کسوٹی سے گذر کر ادا کیا جا رہا ہے !! جنابِ نند کشور وکرم کا نامِ نامی "اردو زبان و ادب" کے ایسے دیوانے 'عاشق اور مجذوب کے طور پر جانا پہچانا اور مانا جاتا ہے جس نے بچپن' جوانی اور بڑھاپے کی تمام قیمتی ساعتیں اپنی محبوب زبان و ادب کو سونپ کر اُس کی جلوہ گری کو اس قدر دلکش و دلربا بنا دیا ہے کہ اُس پر رشک اور حسد کے تمام پُل بہ آسانی عبور کئے جا سکتے ہیں!!!

گلزار جاوید

☆ ہستی برہمنوں کے گھر میں اردو ادب کب اور کس راستے داخل ہوا؟

☆☆ تقسیم سے پیشتر پنجاب' صوبہ سرحد اور افغانستان میں موہیال برہمن بڑی تعداد میں آباد تھے جو سات ذاتوں یعنی چھبر' موہن' ویدؔ' بخشی اور دت پر مشتمل تھے۔ آخر الذکر ذات 'دت' کے افراد کو حسینی برہمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ جنگِ کربلا میں ان کے ایک بزرگ "راہب" نے جن کی عرب کے علاقے میں حکومت تھی' جنگِ کربلا میں حضرت حسین کی امداد کی تھی اور اپنے ساتوں بیٹے قربان کر دیئے تھے۔ ان لوگوں نے پنجاب کے دیگر باشندوں کی طرح پہلے فارسی کو اور بعد ازیں اُردو کو اپنایا۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے اپنی تحقیقی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں حسینی برہمن شاعر "نامدار خان دت" کا ذکر کیا ہے جس نے ۱۷۷۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سپہ سالار رنجیت سنگھ کی خود اپنی بندوق کے پھٹنے سے اچانک موت پر ایک مرثیہ "افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر" لکھا تھا۔ حافظ شیرانی صاحب کا ارشاد ہے کہ "یہ نظم اس کی معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھیں' زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسینی برہمنوں میں لگ بھگ ڈھائی سو سال پہلے اُردو بھی خاصی رائج تھی اور انہوں نے اس زبان کے علم و ادب میں اضافہ کیا تھا۔ خود ہمارے دور میں بھی بہت سے موہیال ادیب' شاعر اور صحافی پیدا ہوئے ہیں جیسے برہم دت قاصر (شاعر)، جنا داس اختر (صحافی اور ناول نویس) گوری شنکر ساگر (ایڈیٹر روزنامہ ملاپ اور نئی دہلی)، امرناتھ موہن (شاعر) انند سروپ دت نادان (شاعر) دیپک قمر (شاعر)' وشوا ناتھ درد (شاعر) یوگیندر بالی (صحافی اور ادیب) آنند بخشی (فلمی شاعر)' سورج کنول سرور (شاعر' ایڈیٹر) کی ایس دتا ضیا (شاعر)' منگت رام دت (ایڈیٹر ریاست جموں) رنبیر سنگھ دت (ایڈیٹر گورو گھنٹال) ستیہ پال دت دلگیر شیرانی (شاعر' ایڈیٹر) امر چند بھوال' بخشی دیوان چند دت حشر (شاعر)' سری رام الفت' نوبت رائے شوخ' تقدیر چند سرحدی (صحافی اور انقلابی) کی ایل دتا۔ جوش وغیرہ وغیرہ۔

☆ اشتراکی نظریہ نے ساتن دھرم پر یوار میں کب اور کیونکر نقب لگائی؟

☆☆ ساتن دھرم میں پیدا ہونے کے باوجود ہوش سنبھالتے ہی مجھے ساتن دھرم کے گرنتھوں میں دیوی دیوتاؤں سے متعلق بیان کردہ مافوق الفطرت کارناموں اور معجزوں پر شک و شبہ ہونے لگا تھا اور چونکہ ہندو دھرم میں دیوی دیوتاؤں پر اعتراض کرنے کی آزادی' حاصل ہے چنانچہ ہم بچپن سے ہی اپنے بزرگوں خصوصاً عورتوں سے اس سلسلے میں بحث کیا کرتے تھے۔ لیکن جب میری ماں بیمار ہو گئیں اور تمام دیوی دیوتاؤں کی عبادت' جنتر منتر' تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں کے باوجود وہ بچ نہ پائیں تو میرا یقین متزلزل ہو گیا اور اس کے بعد جب تقسیم ملک میں ہزاروں بے گناہ ہندو مسلم مارے گئے اور کوئی کراماتی پیر' فقیر' ولی' سادھو سنت انہیں بچا نہ پایا اور نہ ہی انہوں نے یا کسی جیوتشی یا رمال نے اپنے علمِ غیب سے جس کے بارے میں اُن کا دعویٰ ہے کہ اس کے ذریعے مستقبل کے بارے میں انسان کو سب کچھ بتایا جا سکتا ہے' پیشین گوئی کی کہ جلد ہی ملک تقسیم ہو کر بھارت اور پاکستان دو ملکوں میں بٹ جائے گا اور ہزاروں معصوم بے گناہ افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے تو میرا اعتقاد جیوتشیوں' پیروں فقیروں' سادھو سنتوں ولیوں اور دیگر کرامات و معجزہ دکھانے والی ہستیوں سے اُٹھ گیا۔ اسی دوران کانگریس سے بھی جس سے میری آزادی کے دوران عقیدت رہی تھی' دوری شروع ہو گئی اور میں کمیونسٹ پارٹی کے قریب آنے لگا اور اس میں میرے عزیز دوست اور اُردو اور ہندی کے ممتاز نقاد اور افسانہ نگار دویندر اسر صاحب کا بھی بڑا ہاتھ ہے کیونکہ وہ تو لڑکپن ہی سے اشتراکیت سے وابستہ ہو گئے تھے۔

☆ ادب سے آپ کا تعلق ادیب' شاعر' محقق' نقاد' مترجم' مدیر یا ناشر میں سے کس حیثیت میں مضبوط اور مربوط ہے؟

☆☆ یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اوائل عمر میں میں نے شوقیہ طور پر شاعری اور افسانہ نگاری کی۔ میرا پہلا افسانہ تقسیم کے چند ماہ بعد ہی "ادیب" کے عنوان سے ماہنامہ "آزادی" دہلی میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد میں نے کئی درجن افسانے لکھے اور شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر جب روزی روٹی کا مسئلہ آیا تو میں نے اور دویندر اسر نے کانپور سے مشہور صحافی سیلا رام رتا کی

ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ "قومی اخبار" اور "امرت" سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ماہنامہ "آجکل" سے وابستہ ہو گیا۔ اور لگ بھگ پندرہ سال تک یعنی ۱۹۷۷ء تک اس سے وابستہ رہا۔ پھر آٹھ نو سال پریس انفارمیشن بیورو میں صحافتی ذمہ داریاں نبھائیں اور اس کے بعد "عالمی اُردو ادب" نکالتے ہوئے بھی آج بائیس تیئیس سال ہو گئے ہیں۔ یعنی گزشتہ پچپن چھپن سال سے صحافت سے بھی وابستگی رہی ہے اسی طرح ملازمت کے دوران ترجمہ بھی ڈیوٹی میں شامل تھا اور میں نے انگریزی، ہندی، پنجابی میں بے شمار مضامین اور لگ بھگ تیس کے قریب کتابیں ترجمہ کیں..... اور ناشر اس غرض سے بننا پڑا کہ اُردو میں کتابوں کی اشاعت ایک مسئلہ تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ناشرین کے در دولت پر حاضر ہو کر کتاب کی اشاعت کے لئے گڑگڑاتا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں میں نے ناول "یادوں کے کھنڈر" ۱۹۵۴ء کے قریب لکھا تھا مگر وہ اُردو کے بجائے ۱۹۶۰ء کے قریب پہلے ہندی میں چھپا تھا اور پھر بیس سال بعد ۱۹۸۰ء میں میں نے خود اسے اُردو میں شائع کیا تھا۔ چنانچہ اس میدان میں مجبوراً آنا پڑا۔ تاہم اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مستقبل میں مجھے اپنی اردو کتابوں کی اشاعت میں دقت نہیں ہوئی۔ اس لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس صنف میں حیثیت مضبوط و مربوط ہے۔ تاہم میں بطور فکشن نگار زیادہ تر جانا پہچانا جاتا ہوں۔

☆ کُل وقتی اور جز وقتی تخلیق کار میں کیا چیز الگ ہے اور آپ کا شمار کس صف میں ہوتا ہے؟

☆☆ کُل وقتی تخلیق کار تو وہ ہے جو تمام وقت تخلیقی عمل میں مصروف رہتا ہے اور یہی اس کا روزی روٹی کا بھی وسیلہ ہوتا ہے جبکہ جز وقتی تخلیق کار کو روزی روٹی کے لئے کوئی دیگر پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور وہ اپنے اوقات فرصت میں ہی تخلیق کاری کرتا ہے۔

☆ قصّہ اور سکہ بند افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار نہ ہونے کا سبب ناقدین کی بے اعتنائی ہے یا آپ کے مزاج کا لاابالی پن؟

☆☆ میں افسانے یا ناول ناقدین کے لئے نہیں اپنی ذہنی تسکین اور قارئین کے لئے لکھتا ہوں۔ جبکہ قصّہ اور سکہ بند افسانہ نگاروں میں شمار ہونے کے لئے کئی طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جو میرے بس میں نہیں۔ اس کے لئے بعض اوقات ناقدین کے گروہ میں شامل ہونا اور اُن کی جبہ سائی اور جی حضوری کرنی پڑتی ہے اور پھر زیادہ تر ناقدین گروہ بندی کے دلدل میں ایسے بُری طرح دھنسے ہوئے ہیں کہ ان کے لئے باہر نکلنا دشوار ہے۔ نیز اُن کا مطالعہ بھی محدود ہوتا ہے۔ چنانچہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح انہیں اپنے گروہ کے ادباء و شعراء کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اور وہ انہی کو پڑھتے اور انہی کو پروموٹ کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کار اُن سے دیباچے اور پیش لفظ لکھواتے ہیں اور اپنے مجموعے بغل میں دبائے اُن کی خدمت میں خود حاضر ہو کر بصد خلوص و احترام پیش کرتے ہیں کہ شاید اُن کی نظر کرم اُن پر بھی پڑ جائے مگر بے سود کیونکہ وہ تو صرف اپنے چہیتوں کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں ہی پروموٹ کرنے میں لگے رہتے ہیں اور میں نے کبھی قصّہ بند یا سکہ بند افسانہ نگار بننے کے لئے اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ اپنی تصانیف پر کسی بھی نقاد یا محقق سے کوئی دیباچہ یا پیش لفظ نہیں لکھوایا۔ درحقیقت محققین اور ناقدین کے چکر میں پڑنے کے بجائے میں نے صرف افسانے اور ناول لکھنے کی جانب ہی توجہ دی ہے اور اس میں میرا خیال ہے میری لا اور لاابالی پن کا ہی زیادہ ہاتھ ہے۔

☆ آپ کے خیال میں ایک نثر نگار بالخصوص افسانہ نگار میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟ اور آپ اپنی ذات میں کن کمالات سے باخبر ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں افسانہ نگار کو اپنے حقیقی ماحول پر مبنی کہانیاں تخلیق کرنی چاہئیں اور اس کا انداز و اسلوب ایسا دلچسپ اور پُرکشش ہونا چاہیے کہ قاری اس کے سحر میں کھو کر رہ جائے اور کہانی کی آخری سطر تک پڑھے نہ کہ بیچ میں ہی ادھورا چھوڑ دے۔ میری کہانیوں میں یہ خوبیاں کہاں تک موجود ہیں، میں نہیں جانتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میری کہانیاں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں اور ان میں کوئی کردار غیر حقیقی نہیں ہوتا اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کے اکثر کرداروں کا تعلق میری ذات سے ہے اور وہ بھی میرے ساتھ ہی اس ماحول میں جیے اور مرے ہیں تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔

☆ افسانہ کہانی تحریر کرنا کیوں ضروری ہے؟ بھارت کی اُردو ناشناسی اور تیسری دنیا کی شناسائی بڑی حد تک اس مستقل مزاجی کی متحمل ہو سکتی ہے؟

☆☆ افسانہ کہانی یا تحریر کرنا انسانی ضرورت اور فطرت میں شامل ہے جب آدمی لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا تب بھی وہ اپنے بچوں کی تفریح طبع، دلچسپی اور جانکاری کی غرض سے انہیں کہانیاں سناتا تھا۔ ان میں بچوں کے لئے علم بھی تھا، جانکاری بھی تھی اور سبق بھی۔ بعد ازاں انہیں کتھاؤں اور داستانوں کی صورت میں قلمبند کیا گیا اور یہ سلسلہ بھی لگ بھگ ایک ہزار سال سے جاری و ساری ہے۔ بہت پہلے بیتال، پنچ تنتر، الف لیلیٰ، طوطا مینا، طلسم ہوشربا، باغ و بہار، فسانۂ عجائب سے لے کر جدید افسانے کے دور تک ان گنت کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جنہیں لوگ آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور اپنی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ اپنے علم و جانکاری میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ بھارت کی اُردو ناشناسی کی بات سمجھ میں نہیں آئی جبکہ یہاں آج بھی چار کروڑ سے زائد افراد کی مادری زبان اُردو ہے اور پچاس سے زائد یونیورسٹیوں میں بے شمار طلبا ایم اے اور پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

☆ بھارت کی علاقائی زبانوں کے ادب میں کہانی، افسانہ یا کتھا کا

مستقبل کس قدر روشن دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ بھارت کی علاقائی زبانوں کے ادب میں کہانی/کتھا کا مستقبل انتہائی روشن ہے اور یہاں ہر سال بے شمار کہانیوں کی تخلیق منظرِ عام پر آتی ہے اور اس میدان میں بنگلہ، ہندی، پنجابی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، تلگو، گجراتی، اڑیا، آسامی اور تمل اور دیگر علاقائی زبانیں اپنا خاص کردار نبھا رہی ہیں اور ان زبانوں کے بعض کہانی کاروں کی شہرت تو ملکی حدود پھلانگ کر غیر ممالک تک جا پہنچی ہے۔

☆ آپ نے بیشتر ترقی یافتہ دنیا کی سیاحت کی ہے کہاں کا ادب زیادہ صحت مند، توانا، بامعنی ہونے کے علاوہ اپنے معاشرے کا صحیح عکاس ہے۔

☆☆ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں ترقی یافتہ، ترقی پذیر یا پسماندہ کی تخصیص کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہی نہیں، دیگر ملکوں میں بھی صحت مند، توانا اور بامعنی ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور وہی ادب زندہ بھی رہتا ہے جس میں معنویت اور توانائی ہوتی ہے اور جو اپنے معاشرے اور ماحول کی حقیقی عکاسی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم کچھ ترقی یافتہ ممالک اور وہاں کی زبانوں سے زیادہ متاثر و مرعوب ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ترقی یافتہ ممالک ہی اس دوڑ میں پیش پیش ہیں اور اسی بدعت کا نتیجہ ہے کہ ہم برطانوی، فرانسیسی، جرمن اور امریکی ادیبوں اور نقادوں کے حوالے دینے والے ادیبوں کو زیادہ پڑھا لکھا اور باشعور سمجھتے ہیں۔ شاید اس میں ہمارا احساسِ کمتری ہی کارفرما ہے کہ ہم مشرقی مفکروں، فلسفیوں اور عالموں کا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں حالانکہ ہمارے ہاں بھی ایسے سو مفکر، فلسفی اور نظریہ ساز پائے جاتے ہیں، جن پر دنیا ناز ہے مگر چراغ تلے اندھیرا کے مصداق یہاں ان کا حوالہ دیتے ہوئے قلم کو احساسِ کمتری کا احساس ہوتا ہے۔

☆ انیسویں ادھیائے میں بیان کردہ فلسفہ اور تکنیک کہاں کی دین ہے؟

☆☆ میں نہیں جانتا دراصل ہوش سنبھالتے ہی مجھے مظاہرِ فطرت، خدا، موت، جنت اور جہنم ایسے مسائل Haunt کرنے لگے تھے (ویسے تقریباً سبھی کو کچھ حد تک کرتے ہی ہیں) اور پھر تقسیم اور بزرگ افراد کی ہلاکت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں ان تمام مدوں پر زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی موت سے پیشتر ان امور پر اپنا تجزیہ پیش کروں تاکہ میرے خیالات و نظریات میرے ساتھ ہی نہ مر جائیں۔ چنانچہ میں نے متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کی روشنی میں ان تجربات کو ایک ناول کی صورت میں پیش کیا۔ اور اس کے لئے میں نے عام ناول سے ہٹ کر تکنیک اپنائی جس میں موت سے زندگی تک کے تمام واقعات و تجربات کے پس منظر میں اپنے نظریات و خیالات پیش کئے۔

☆ کیا یہ درست ہے کہ تمام تر روشن دماغی کے باوجود آپ بھگوت گیتا کے فلسفے سے آزاد نہیں ہوئے؟

☆☆ شاید کچھ حد تک آپ صحیح فرماتے ہیں کیونکہ آدمی اپنے خاندان اور سماج سے ہی متاثر ہوتا ہے اور میں ایک سناتن دھرمی خاندان میں پیدا ہوا تھا جہاں گیتا، رامائن اور مہابھارت کا پاٹھ عبادت کا درجہ رکھتا ہے اس لئے ان سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے اور میں نے تو تیسری جماعت میں ہی گیتا اور مہابھارت پڑھنی شروع کر دی تھی کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ ان کا پاٹھ کرنے سے میری ماں بیماری سے نجات پا لیں گی مگر ایسا نہ ہوا نتیجتاً جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے میں نے تمام پوجا پاٹھ چھوڑ دیا مگر گھر میں تو آج بھی گیتا اور رامائن کا پاٹھ چلتا رہتا ہے اس لئے اثر تو ہوگا ہی۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ تقسیم ہند کا درد آپ اور دیگر پنجابی اہلِ قلم کے ہاں جس قدر شدت اور ہیجان سے نظر آتا ہے، اس قدر گرمجوشی سے اہلِ زبان مہاجر یا اہلِ قلم میں نظر نہیں آتا؟

☆☆ معلوم نہیں آپ نے یہ کیسے سوچ لیا؟ آپ تو خود ایک مہاجر ادیب ہیں کیا آپ میں تقسیم ہند کے درد کی شدت نہیں؟ میرا خیال ہے مہاجر ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں بھی اسی درد کی شدت کا احساس ہے جیسا کہ پنجابی ادیبوں میں ہے اور وہ اس میدان میں پنجابی ادیبوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اختر جمال اور کئی دیگر مہاجر ادیبوں نے اس ضمن میں غیر معمولی کردار نبھایا ہے اور ان کی تخلیقات کو پڑھ کر اس شدت کا پورا احساس ہوتا ہے۔

☆ ہر پڑھے لکھے شخص کی کوئی آئیڈیالوجی ہوا کرتی ہے اور ہونا بھی چاہیے جبکہ آپ فرماتے ہیں کہ میری کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے؟

☆☆ مجھے معلوم نہیں یہ بات میں نے کس اقتباس میں کہی تھی شاید میں نے یہ کہا ہو کہ میرا علم اور آئیڈیالوجی میری نہیں بلکہ میں نے کئی فلسفیوں اور مفکروں کی کتابوں سے اخذ کی ہے ویسے آئیڈیالوجی تو ہر شخص کی ہوتی ہی ہے۔ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ اُس کا کوئی دھرم نہیں، اُس کا بھی ایک دھرم ہے اسی طرح ہر شخص کی کوئی نہ کوئی آئیڈیالوجی ہوتی ہی ہے۔ جیسے مذہب، خدا، موت، جنت، جہنم، دیوی دیوتا، ملک الموت، جن پریاں، معجزے، جیوتش اور ٹونے ٹوٹکوں کے بارے میں میرا ایک نظریہ ہے جو عام مذہبی آدمی سے مختلف ہے اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری بھی ایک نظریہ یا ایک آئیڈیالوجی ہے جسے آپ دہریت، لامذہبیت، سیکولرسٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم میں ہر مذہب کی تعظیم کرتا ہوں مگر ان مروجہ مذاہب سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

☆ دورانِ ملازمت عالمی اُردو ادب کا خیال اور منصوبہ بندی کن خواہشات کی تکمیل کے لئے ترتیب دیا اور اس میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی؟

☆☆ میں ماہنامہ آج کل نئی دہلی سے تقریباً پندرہ سال وابستہ رہا۔ بعد ازاں جب میرا تبادلہ پریس انفارمیشن بیورو میں ہو گیا تو میرے دل میں عام ڈگر سے ہٹ کر ایک منفرد رسالہ نکالنے کا خیال آیا مگر رسالہ کس طرح کا ہو یہ ذرا سوچنے والی بات تھی۔ کیونکہ لگ بھگ ہر رسالے میں اداریے' کہانیاں' مضامین' نظمیں' غزلیں اور تبصرے وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ تو پھر کیسا رسالہ ہونا چاہیے۔ تب مجھے خیال آیا کیوں نہ پبلیکیشنز ڈویژن کے حوالہ جاتی سالنامے (Reference Annual) "انڈیا" کی طرح حوالہ جاتی "اُردو" نکالا جائے' جس میں سال بھر کی اُردو سے متعلق علمی و ادبی سرگرمیوں اور معلومات کو یکجا کیا جائے تاکہ مستقبل میں اُردو محققین اس سے استفادہ کر سکیں اور اس کو دیرپا بنانے کی غرض سے اسے مجلد اور کتابی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ یہ لائبریریوں میں محفوظ بھی رہ سکے مگر اسے نکالنے میں کچھ آسانی تھی تو کچھ مشکل بھی۔ آسانی یہ تھی کہ اس میں شامل ادبی مواد (افسانے' نظمیں' غزلیں اور مضامین) کے لئے مجھے ادبا وشعراء سے لکھنے کی فرمائش کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ سال بھر کی منتخب تخلیقات کو حوالے کی غرض سے چھاپنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ورنہ بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے اُن کی تخلیق یا مضمون حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ آپ جانتے ہی ہیں؟ کیونکہ بعض اوقات رسالہ یا خصوصی شمارہ شائع ہو جاتا ہے مگر لاکھ سر پٹخنے کے باوجود بھی آپ فرمائشی مضمون حاصل کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں اور وقت کی کوفت سے دوچار ہوتے ہیں لیکن اس رسالے کی تیاری میں دقت یہ تھی کہ اُن دنوں کتابیات' وفیات اور علمی درسگاہوں اور اُن کی تحقیقی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہوتی تھیں اور اُن کے لئے بہت محنت اور تحقیق و جستجو کرنی پڑتی تھی جو ایک فرد کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے ایک ٹیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ البتہ اب بعض رسائل نے عالمی اُردو ادب کی دیکھا دیکھی وفیات' کتابیات اور ادبی خبروں وغیرہ کے لئے صفحات مخصوص کر دیے ہیں۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سوائے عالمی اُردو ادب کے اُردو کا کوئی جریدہ ترتیب میں ادبا و شعرا کو حروف تہجی کے لحاظ سے شائع نہیں کرتا۔ میں نے یہ اس لئے کیا تاکہ کسی ادیب یا شاعر کو یہ شکایت نہ ہو کہ اُسے بعد میں چھاپا گیا اور فلاں کو پہلے۔

☆ آپ نہ سرکاری اداروں سے مالی معاونت لیتے ہیں نہ احباب کو زحمت سے دوچار کرتے ہیں' "عالمی اُردو ادب" کا مالی بار کس طرح جھیلا جاتا ہے؟

☆☆ جب میں نے عالمی اُردو ادب کا اجراء کیا تھا تو یہ سوچ کر کیا تھا کہ بہت کم لوگ ہی اسے خریدیں گے کیونکہ ہمارے ہاں رسالے اور اخبار خریدنے کا بہت کم رواج ہے اور اس کے لئے اشتہار لینے کا بھی کوئی چارہ نہیں۔ مگر میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں کسی ادارے یا شخص کے بل بوتے پر نہیں بلکہ اپنے دم پر اسے نکالوں گا۔ چاہے چند افراد ہی اسے خریدیں یا نہ خریدیں۔ کہ اسے ایک بار جاری کرنے کے بعد میں بند نہیں کروں گا مگر پیسے کہاں سے آئیں گے؟ تو اُس وقت میں نے سوچا کہ لوگ نشے کے لئے روز سو ڈیڑھ سو روپے کی شراب بھی تو پی جاتے ہیں اور رسالہ نکالنا بھی تو ایک نشہ ہے لہٰذا میں اس کا بوجھ اسی نظریہ کے تحت برداشت کرتا ہوں اور میں نے اپنے دل میں عہد کیا ہے کہ ایک تو میں بعض رسالوں کی طرح کبھی کسی سے چندہ یا امداد نہیں مانگوں گا دوسرے جب تک جسم اور دماغ کام کرتے رہیں گے اسے بند نہیں ہونے دوں گا چاہے اس کی ایک کاپی ہی بکے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک مرتبہ تو اس کی صرف تین جلدیں ہی بک پائی تھیں۔ حالانکہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے؟

☆ آپ نے جس قدر خاص نمبر ترتیب دیئے' اُن کی اہمیت اور افادیت کیا ہے؟

☆☆ میں باری باری ہندوستان اور پاکستان کے ادبا وشعراء سے متعلق خصوصی نمبر شائع کرتا ہوں اس لئے اب تک میں نے عالمی اُردو ادب کے بالترتیب چار خصوصی شمارے.... حبیب جالب نمبر' ڈوینددر اسر نمبر' احمد ندیم قاسمی نمبر اور سردار جعفری نمبر ہی شائع کئے ہیں۔ آخری شمارہ سردار جعفری صاحب پر تھا لہٰذا اب انتظار حسین پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ ان خصوصی نمبروں کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں محقق اور نقاد حضرات ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی کیا اہمیت و افادیت ہے؟ بہر حال میرے خیال میں ان شماروں میں ان شخصیات کی زندگی' تخلیقات اور فن کا مکمل جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا میرے خیال میں ان ادبی ہستیوں کے بارے میں جاننے اور تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ نمبر بہت مفید ثابت ہوں گے اور انہیں ان نمبروں میں ان حضرات سے متعلق ہر طرح کی جانکاری حاصل ہو جائے گی۔ یہی ان کی اہمیت و افادیت ہے۔

☆ اب تک کل کتنے اہلِ قلم کو آپ نے ہندی سے اُردو میں منتقل کیا ہے اور اُس کے کیا اثرات ہوئے ہیں؟

☆☆ میں نے ہندی سے اُردو میں کم اور اُردو سے ہندی میں زیادہ اہلِ قلم کو منتقل کیا ہے کیونکہ آج ہندوستان میں اُردو والوں کی اکثریت ہندی اہلِ قلم سے واقف ہیں جبکہ ہندی والے اُردو سے نا آشنا ہیں لہٰذا اردو کتابیں ہندی میں زیادہ منتقل ہوتی ہیں اور ان کی مانگ کے ساتھ ساتھ ان سے پیسہ بھی ملتا ہے۔ ہندی میں میں نے اُردو کے کوئی اڑھائی درجن کے قریب ادیبوں کو جن میں غالب' سردار جعفری' سدرشن' علی عباس حسینی' حیات اللہ انصاری' کرشن چندر' سعادت حسن منٹو' راجندر سنگھ بیدی' غلام عباس' احمد ندیم قاسمی' قرۃ العین حیدر'

حبیب جالب، ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں، ہندی میں منتقل کیا ہے۔ اور اس کے اثرات یہ ہیں کہ ان میں سے بہت سے ادیب ایسے ہیں جن سے ہندی والے پہلی بار متعارف ہوئے ہیں اور انہیں ان کے فن و شخصیت کے کئی پہلوؤں سے روشناسی ہوئی ہے۔

☆ جس تیزی سے ادبی جرائد منظر سے ختم اور بحران کا شکار ہو رہے ہیں، کیا ان کی بقا کے لئے برصغیر کی سطح کی کوئی انجمن کا قیام ضروری نہیں ہوتا؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ رسالے انفرادی کوشش، Dedication اور لگن سے ہی شائع ہوتے ہیں یا کہ انجمن قائم کرنے یا روپیہ صرف کرنے سے۔ میں عالمی اُردو ادب بہت کم روپے میں شائع کرتا ہوں کیونکہ اس کے لئے میری محنت اور لگن بہت سے اخراجات کم کر دیتی ہے اگر یہ کام کسی انجمن یا ادارے کا ہو تو وہ ہر کام کے لئے پیسے صرف کرے گا ورنہ کام نہیں ہو پائے گا؟ کیونکہ انجمن یا ادارے کا کوئی بھی ممبر کسی مخصوص ڈیوٹی کی ذمہ داری لینے سے کترائے گا یا لینے پر اُسے پورا نہیں کر پائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر کام پر پیسے خرچ کرنے ہوں گے اور رسالہ جلد یا بدیر بند ہو جائے گا۔ آخر کہاں تک اس غیر منافع بخش کام پر پیسے ضائع کئے جائیں۔ آپ کی طرح میں نے بھی کئی بار اس پر غور کیا ہے اور یہ ارادہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی ادارہ یا انجمن اسے میرے بعد جاری رکھے تو میں اسے ایک لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ اس رقم سے وہ اس سے بمشکل ہی دو شمارے نکال پائے گا۔ اور پیسے ختم ہو جائیں گے جبکہ میں اس رقم سے بغیر اشتہار حاصل کئے اور بغیر ایک شمارہ بھی بیچے چار شمارے نکال سکتا ہوں کیونکہ میں اس رسالے کا ایڈیٹر سے لے کر پیکنگ تک خود ہی ہوں مگر انجمن یا ادارہ قائم کرنے کی صورت میں اس کا ہر رکن یہ تو چاہے گا کہ اس کا نام بھی رسالے کے صفحات میں مجلس ادارت کے رکن کی حیثیت سے جلی حروف میں شائع ہو مگر پیکنگ کرنے کی ذمہ داری کوئی قبول نہیں کرے گا چنانچہ ہر کام پر پیسے صرف کرنے پڑیں گے اور نتیجہ.....؟ ظاہر ہے۔

☆ احباب میں آپ کا تاثر بے نیاز شخص کے طور پر قائم ہے۔ اس کے باوجود آپ کے نامۂ اعمال میں نصف درجن کے قریب اعزازات اور انعامات جھلملا رہے ہیں؟

☆☆ ہندوستان میں بہ جہ اُردو اکادمیوں کو بے اندازہ روپیہ دیا جاتا ہے اور انہیں اس روپے کو جائز اور ناجائز کاموں پر خرچ کرنا ہی ہوتا ہے اس لئے ہر سال ادبا و شعراء سے کتابیں بھیجنے کے لئے کہا جاتا ہے اور انہیں انعامات سے نوازا جاتا ہے جسے میں انعام نہیں امداد سمجھتا ہوں۔ میں بھی ماضی میں ان اکادمیوں میں کتابیں submit کر دیا کرتا تھا اور مجھے بھی انعام مل جایا کرتا تھا کیونکہ ان دنوں روپیہ ٹھکانے لگانے کے لئے کئی اکادمیاں تو سو سو مصنفین کو انعامات سے نوازتی تھیں چاہے وہ انعام پانچ سو یا ہزار روپے کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ وہاں submit کی گئی زیادہ تر کتابوں کو انعام ملتا ہی ہے۔ باقی زیادہ تر اعزاز اسی صورت میں ملتا ہے جبکہ کمیٹی میں کوئی آپ کا حامی یا پرستار ہو۔ تاہم دو تین انعام و اعزاز..... خصوصاً ہندی کے اسی طرح حاصل ہوئے ہیں۔

☆ اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے "انیسویں دھیائے" پر انعام قبول کرنے سے معذرت کیوں کی تھی؟

☆☆ مجھے اکادمی سے افسانوی مجموعے "آوارہ گرد" پر تجزیاتی ناول "انیسویں دھیائے" پر اعلان کردہ انعام سے بڑی رقم کا انعام مل چکا تھا چنانچہ اس سے آدھی رقم کا انعام لینا میں نے اپنے لئے توہین کے مصداق سمجھا۔ ہیڈ ماسٹر کے بعد سیکنڈ ماسٹر کے گریڈ کو تو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا اور پھر جب اکادمیوں کو کروڑوں روپے اُردو کی ترقی و بہبود کے لئے دیئے جا رہے ہیں تو انعامات کی رقم صرف پانچ ہزار یا ڈھائی ہزار نہیں بلکہ کم از کم بیس ہزار اور دس ہزار روپے ہونی چاہیے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اس اعلان کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ میں آئندہ اُردو میں کسی کتاب کو انعام کے لئے کسی اکادمی میں پیش نہیں کروں گا..... اور بفضل تعالیٰ تو میں نے آج تک کسی اکادمی یا ادارے سے نہیں لی اور نہ آئندہ لینے کا ارادہ ہے۔

☆ اُردو والے ہندوستان میں کب تک خوش فہمی اور مبالغہ آرائی میں گرفتار رہیں گے؟ آپ کے خیال میں اُردو ہندوستان میں اپنی عمر کے کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ اُردو والے ہندوستان میں ہی نہیں ہر جگہ خوش فہمی اور مبالغہ آمیزی میں گرفتار ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہر جگہ کی خوش فہمی اور مبالغہ آمیزی کی بنیاد الگ ہو لیکن بعض خوش فہمیاں اور مبالغہ آرائیاں ایسی ہیں جن پر اردو والوں کی سمجھ پر ماتم کرنا پڑتا ہے جیسے کہ دنیا بھر کے اُردو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ اُردو دنیا کی سب سے بڑی تیسری زبان ہے حالانکہ سبھی جانتے ہیں کہ چینی، انگریزی، ہندی، عربی، روسی اور بنگلہ زبان جاننے والوں کی تعداد اُردو والوں سے کہیں زیادہ ہے تاہم اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر ہندی اور اُردو بولنے والوں کی تفریق نہ کی جائے تو ہندی یا اُردو یعنی ہندوستانی زبان جاننے والوں کی تعداد دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں اُردو اس مرحلے میں ہے جہاں اسے کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ تقسیم کے بعد ہم سب کو اُردو کا مستقبل بڑا تاریک نظر آتا تھا اور ہر کوئی کہتا تھا کہ اُردو چند دس بیس سال میں ختم ہو جائے گی مگر اُردو وہ جاں باز ہے جو صدمہ برداشت کر گئی اور آج پچپن ساٹھ سال گزر جانے پر بھی پہلے کی طرح ہی ملک میں جی رہی ہے اور کوئی چاہنے پر بھی اسے ختم نہیں کر سکا۔

☆ کیا آپ اپنے ملک میں اُردو کے نام پر قائم دکانوں کی کارکردگی

سے مطمئن ہیں؟

☆☆ دیکھئے اُردو کے نام پر ہندوستان میں ہی نہیں باہر امریکہ، کناڈا اور برطانیہ وغیرہ میں بھی اسی طرح کی دکانیں کھلی ہوتی ہیں۔ جب دکان میں بزنس اچھا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے مقابل ایک اور دکان کھل جاتی ہے۔ اور وہ اپنی دکان کو چلانے کے لئے زیادہ attraction پیدا کرتا ہے۔ اگر ان دکانوں میں فائدہ نہ ہوتا تو یہ دکانیں کیوں کھلتیں۔ ظاہر ہے جب دکانیں کھلی ہیں تو ان سے سبھی تو مستفید نہیں ہو سکتے، کچھ لوگ ہی مستفید ہو سکتے ہیں لہٰذا اس پر اظہارِ اطمینان ہی کرنا چاہیے۔ مفت میں دل جلانے سے کیا فائدہ؟ اور پھر دکانیں کھلنے کا مطلب ہے کہ اردو کے لئے کچھ تو کام ہو رہا ہے۔

☆ انڈو پاک کے سیاسی تعلقات کی بحالی سے اُردو والے کس قسم کی خوش اُمیدی قائم کر سکتے ہیں؟

☆☆ یہ صحیح ہے کہ ہمیں ہندو پاک کے سیاسی تعلقات کے بارے میں زیادہ خوش امیدی ہی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جلد یا بدیر ہمارے سیاسی تعلقات میں خوشگواری ضرور آئے گی اور ہم ایک دوسرے کے نزدیک آئیں گے کیونکہ اس کے بغیر دونوں ممالک میں ترقی و خوشحالی آنا مشکل کام ہے۔

☆ اگر آپ سے برصغیر کے ادبی حلقوں کے کردار کے تعین کے لئے کہا جائے تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ جہاں تک اُردو حلقوں کا سوال ہے اس کا کردار ہر جگہ ایک سا ہی ہے چاہے وہ ہندوستان پاکستان ہو یا امریکہ کینیڈا۔

☆ مستقبل کے حوالے سے اپنی ذات اور اُردو ادب کی بابت آپ کی کیا خوش امیدیاں اور اندیشے ہیں؟

☆☆ اپنی ذات کے بارے میں خوش امیدی اور وہ بھی ۷۱ سال کی عمر میں؟ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا ہے تو خوشی خوشی رہو، رونے سے کیا فائدہ؟ انسان کو ہمیشہ رجائیت پسند ہی ہونا چاہیے اور وہ میں ہوں ہی۔ جہاں تک اُردو ادب کا سوال ہے اس کا مستقبل روشن ہے کیونکہ آج اُردو کی بستیاں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، یورپ، جرمنی اور عرب ممالک وغیرہ میں قائم ہو چکی ہیں اور سرگرمِ عمل ہیں اور وہاں متعدد انجمنیں اور ادارے قائم ہو چکے ہیں حتیٰ کہ بین الاقوامی مشاعروں اور کانفرنسوں کا انعقاد بھی ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی چار کروڑ سے زائد افراد کی مادری زبان اُردو ہے تاہم یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اُردو کی تعلیم نچلی سطح پر کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ذریعہ معاش کے پیشِ نظر بھی والدین ہندی کی جانب رجوع کر رہے ہیں تاہم آج بھی ہندوستان کی پچاس کے قریب یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جا رہی ہے جہاں بی اے اور ایم اے کے علاوہ سینکڑوں ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اُردو اخبارات و رسائل کی تعداد بھی انگریزی اور ہندی کے بعد تیسرے نمبر پر ہے اور ملک میں پانچ سو سے زائد روزنامے، اور دو ہزار کے قریب رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔

من کی موج

نند کشور وکرم

لگ بھگ پچیس برس تک ملک کے طول و عرض میں قلندروں اور فقیروں کی طرح گھوم گھوم کر ہزاروں لوک گیت جمع کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے والے واحد ادیب دیویندر ستیارتھی جنہیں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی چاروں زبانوں پر دسترس حاصل تھی ۱۲ فروری ۲۰۰۳ کو انتقال کر گئے اور اس طرح ہم ایک بزرگ اور منفرد ادیب، افسانہ نگار اور شاعر سے محروم ہو گئے جنھوں نے ہمیں اپنے قومی ورثے لوک گیتوں سے روشناس کرانے کے علاوہ، اپنے افسانوں ناولوں اور شاعری سے ادب میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی تھی اور جن کی شہرت بیسویں صدی کے چوتھے دہے کے اواخر میں سارے ہندوستان میں اتنی پھیل گئی کہ اُن کے کام کی تعریف مہاتما گاندھی، گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت مدن موہن مالویہ، نند لال بوس، راہل سانکرتاین اور دیگر مشاہیر ادب و فن نے کی تھی۔

ستیارتھی جی کی ولادت ۲۸ مئی ۱۹۰۸ کو پنجاب کے ضلع سنگرور میں واقع گاؤں بھدوڑ میں ہوئی تھی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ کوئی ڈیڑھ سال تک ڈی اے وی کالج لاہور میں بھی تعلیم پاتے رہے لیکن پھر اسی دوران اُن پر مایوسی کا ایسا دورہ پڑا کہ اگر علامہ اقبال نے سمجھا بجھا کر انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو انہوں نے لاہور کے نیلے گنبد کے چوک میں خودکشی کر لی ہوتی۔ علامہ اقبال کے سمجھانے بجھانے سے اُن میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی اور پھر اچانک ہی انہیں ہندوستان کے لوک گیتوں کو جمع کرنے کی ایسی دھن سمائی کہ سنگھوں کی طرح گھربار چھوڑ کر لوک گیتوں کی تلاش میں ایک لمبے سفر پر چل پڑے۔ اور لگ بھگ پچیس برس تک ملک کی مختلف ریاستوں میں گھوم گھوم کر اور طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرکے انہوں نے ہمیں دیش کے مختلف علاقوں میں رائج لاتعداد لوک گیتوں کا قومی ورثہ عطا کیا۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ تھا جو آج تک کسی اور ہندوستانی ادیب نے انجام نہیں دیا تھا۔

لوک گیتوں کی تلاش کا جنوں اُن پر ایسا چھا گیا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا کو بھول گئے اور گھربار تیاگ کر اس مہان مقصد کی تکمیل کے لئے ملک کے وسیع و عریض علاقے کی خاک چھاننے لگے۔ کبھی وہ شانتی نکیتن پہنچ جاتے تو کبھی سری لنکا۔ ملک کا کوئی ایسا کونا نہیں تھا جہاں وہ اس مقصد کے لئے نہیں گئے، پنجاب، آسام، بنگال، کشمیر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، گجرات، اور نہ جانے کہاں کہاں گئے اور لوک گیتوں کے اس بیش بہا قومی ورثے کو تلاش کیا کہ گاندھی جی بھی عش عش کر اٹھے اور وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس کی تعریف میں انہیں خطوط ہی نہیں لکھے بلکہ اس کام کو اہم بتاتے ہوئے انہوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں، جس کے وہ صدر تھے، اس سے متعلق تجاویز بھی پیش کیں اور ۱۹۳۶ء میں انہیں اندور میں منعقد ہونے والے ہندی ساہتیہ سمیلن میں شرکت کی دعوت بھی دی اور اس سلسلے میں اپنے خاص ایلچی کاکا کالیلکر کو اُن کو دعوت دینے کے لئے خاص طور پر بھیجا۔

لوک گیتوں سے متعلق اُن کی پہلی کتاب اُردو میں "میں ہوں خانہ بدوش" منظر عام پر آئی اور اس کو اتنی شہرت ملی کہ اُن کے چرچے بڑے زور و شور سے ادبی حلقوں میں ہونے لگے بعد ازاں "دھرتی گاتی ہے" اور "گائے جا ہندوستان" کی اشاعت سے وہ اتنے مقبول و معروف ہو گئے کہ اُن کے ہمعصر رشک و حسد سے کبھی اُن کی داڑھی کا اور کبھی اُن کی شخصیت کا مذاق اڑانے لگے یہاں تک کہ کچھ اُن کو "فراڈ" اور "بوڑ" کہنے سے بھی نہ ہچکچائے مگر اس کے باوجود ان تمام باتوں سے بے نیاز وہ اپنی منزل مقصود کی جانب رواں رہے اور تقریباً ستر سال تک ادبی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی لوک گیتوں کو جمع کرکے ستیارتھی جی نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور اس حیثیت سے اُن کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن بطور کہانی نویس بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے نمائندہ ادیب تھے جنھوں نے ہماری تہذیب، ہماری تاریخ، اور ہمارے لوک گیتوں کے پس منظر میں ایک منفرد انداز و اسلوب اپنا کر ہمیں کئی یادگار ادبی تخلیقات عطا کیں۔

ستیارتھی جی نے اُس زمانے میں کہانی کے میدان میں قدم رکھا جب کرشن چندر، منٹو، بیدی، غلام عباس، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی اور احمد ندیم قاسمی کا دور دورہ تھا اور وہ آسمان ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ آج وہ ہندی اور پنجابی ادیب کے طور پر زیادہ مشہور ہیں تاہم انہوں نے بطور کہانی نویس اردو میں ہی شروعات کی تھی اور اُن کی پہلی کہانی "اور بانسری بجتی رہی" ہندی یا پنجابی میں نہیں بلکہ اُردو میں اشاعت پذیر ہوئی تھی اور اسے چھاپنے کا شرف ۱۹۳۸ء کے اواخر میں لاہور کے مشہور اُردو ماہنامے "ادب لطیف" کو حاصل ہوا تھا یہی نہیں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ "نئے دیوتا" بھی اُردو ہی میں شائع ہوا تھا جبکہ اُن کا ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ "چٹان سے پوچھ لو" اور "چائے کا رنگ" اس اشاعت کے سات سال بعد ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آئے۔ اور ہندی میں زیادہ تر بکنے ہونے کی وجہ سے وہ بھی پریم چند، مہاشے سدرشن، اپندر ناتھ اشک اور ہنس راج رہبر کی طرح ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ "بٹوارے" کے بعد ہندی میں اُن کے آٹھ افسانوی مجموعے "چٹان سے پوچھ لو (۱۹۴۹ء) چائے کا رنگ (۱۹۴۹ء) نئے دھان سے پہلے (۱۹۵۰ء) سڑک نہیں بندوق (۱۹۵۰ء) گھونگھٹ میں گوری جلے (۱۹۹۰ء) مس فول اور (۱۹۹۴ء) دیویندر ستیارتھی کی چنی

ہوئی کہانیاں (۱۹۹۱ء) اور دس پرتی ہوئی کہانیاں (۱۹۹۷ء) شائع ہو چکے ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں ان کا کوئی افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا اور ان پر بہت کم لکھا گیا ہے حالانکہ ستیارتھی جی کے کئی افسانوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے جب ان سے متعلق افسانہ "ترقی پسند" لکھا تو جواب میں انہوں نے "نئے دیوتا" ایک یادگار کہانی لکھی جس کا ذکر آج بھی کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں ستیارتھی جی نے "من کی موج" کے تحت کہانیاں لکھیں اور انہوں نے تکنیکی پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی اور فطری مناظر اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار نگاری پر زور دیا لیکن بعد ازاں انہوں نے تکنیکی پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ وہ لوک گیتوں کی کھوج میں ملک کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہتے تھے اور سفر کے دوران انہیں مختلف قسم کے واقعات اور کرداروں سے واسطہ پڑتا رہا۔ نتیجتاً ان کی کہانیوں کا کینوس بہت وسیع ہو گیا اور ان میں واقعات اور کرداروں پر مبنی ایسی کہانیوں کی تخلیق کی گئی جو ایک مسافر ---- ایک سیاح اور ایک شاعر کی داستان معلوم ہوتی ہیں جن میں لوک گیتوں کی مدھرتا اور موسیقی کا جادو بسا ہوا ہے اور جن کا انداز و اسلوب بھی دیگر افسانہ نویسوں سے یکسر جدا ہے۔

ان کی کہانیاں حب الوطنی، جنسیاتی مسائل، معاشی عدم مساوات، غریبوں اور مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت اور ان کے استحصال جیسے مسائل پر مبنی ہیں اور ان میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ بنگال کا قحط، برصغیر کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات اور دوسری جنگ عظیم جیسے موضوعات کو انہوں نے بڑے دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے زمانے کی سچائیوں کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے اور ان میں لوک گیتوں کی مدھر موسیقی پیدا کر دی ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کہانیوں میں انہوں نے اپنے ہم عصروں کے برعکس ایک ایسا اور منفرد اسلوب اپنایا تھا جو ان کی شناخت بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض کہانیاں جیسے "[illegible]"، "ترقی پسند"، "گوتمی کی چال"، "نئے قدریں ---- یہ دھیاں"، "پیرس کا آدمی"، "نئے دیوتا"، "قبروں کے بیچ"، "ستلج پھر پھر آ" نے اردو ادب پر گہری چھاپ چھوڑی ہے۔

ستیارتھی جی ایک اہم کہانی نویس ہونے کے علاوہ ایک اچھے ناول نویس بھی تھے اور ان کے کئی ناول جیسے "رتھ کے پہیے"، "کٹھ پتلی"، "دودھ گاچھ"، "برہم پتر"، "کتھا کہو اروشی"، "تیری قسم ستلج" منظر عام پر آئے تھے۔ نیز انہوں نے شاعری بھی کی اور مضامین بھی لکھے لیکن جو شہرت اور مقبولیت انہیں لوک گیتوں کی تلاش اور کچھ یادگار کہانیوں کی تخلیق کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے وہ دیگر اصناف میں حاصل نہیں ہوئی اور انہوں نے ان کی بدولت دنیائے ادب میں ایک ایسا منفرد مقام حاصل کر لیا ہے جو بہت کم تخلیق کاروں کو نصیب ہوا ہے۔

O

کن سے امید کرم کرتے رہے
خود پہ خود کیا کیا ستم کرتے رہے

دھند میں اک ایک ساحل بہہ گیا
ہاں سفر ہم یم بہ یم کرتے رہے

کوئی رستہ تھا نہ تاروں کے لئے
نور کو ظلمت میں ضم کرتے رہے

خون ارزانی کی کوئی حد نہ تھی
بنجرستاں کو ارم کرتے رہے

شادی کا شاید تصور ہی نہ تھا
غم نہ ہونے کا بھی غم کرتے رہے

کس قدر منزل رسی کی چاہ تھی
رہگزر کو ہمقدم کرتے رہے!

پروفیسر حامدی کاشمیری
(سری نگر)

یہ عشق نہیں آساں

دیویندر اسر

تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بہت کچھ ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے لیکن پھر بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ ستاروں کی طرح ٹوٹ کر جگنو سا چمک کر غائب ہو جاتا ہے۔ اندھیرے اور اُجالے کی یہ آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ کال چکر چلتا رہتا ہے اور تخلیق کے نئے نئے سرچشمے پھوٹتے رہتے ہیں۔ ادب اور تاریخ، تہذیب اور معاشرے نیز فلسفہ اور فن میں نئے باب جڑتے رہتے ہیں۔ کتنے لوگ اس نئے باب کے لکھنے کا جوکھم اُٹھاتے ہیں یہ حوصلہ رکھتے ہیں؟

یہ عشق نہیں آساں اتنا تو سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

تند کشور وکرم بے خطر اس آگ کے دریا میں کود پڑے ہیں جنہوں نے "اُنیسواں ادھیائے" لکھ ہی ڈالا اور یادوں اور خوابوں کے بیچ پارے کی طرح حرکت کرتے ہوئے سچ کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سچ ہے کہ بار بار گرفت سے پھسل پھسل جاتا ہے۔ مکمل ناول سچ کیا ہے؟ کو جاننے کی تلاش و جستجو کی دلچسپ مگر فلسفیانہ داستان ہے---- اور عبرتناک بھی۔ میلان کندیرا نے کبھی لکھا تھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس وقت دنیا بھر کے لوگ سوچنے سمجھنے سے زیادہ ججمنٹ جاری کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں سوال نہیں اُٹھتے، وہ بس بنے بنائے جواب مانگتے ہیں۔ اس لئے بغیر کسی دلیل اور ثبوتوں کے سب کچھ قبول کرلیا جاتا ہے۔ اس بے ہنگم شور میں ناول کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کی جہالت ہر شے کا جواب اپنے میں ظاہر ہوتی ہے۔ ناول کی دانشمندی ہر شے کے آگے سوالیہ نشان لگانے میں پوشیدہ ہے۔ ناول ہمیں دنیا کو ایک سوال کی شکل میں دیکھنے کے کارن آزاد و خود مختار بناتا ہے۔"

کوروکشیتر کی جنگ سے پیشتر ارجن کے ذہن میں بھی سوال اُٹھتے ہیں لیکن شری کرشن نے مدلل جواب دے کر اس کے جوابوں کو خاموش کردیا تھا۔ اٹھارہواں ادھیائے ختم ہو گیا لیکن لاکھوں لاشیں سوالیہ نشان کی طرح صلیب بن کر کھڑی ہوگئیں۔ گاندھاری نے آنکھوں سے پٹی کھول کر کرشن کو بد دعا دی۔ "تو سنو کرشن! پربھو ہو یا پراتپر کچھ بھی ہو سارا تمہارا ونش بھی اسی طرح پاگل کتوں کی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کھائے گا۔ تم خود ان کا ناش کر کے کئی ورشوں بعد کسی جنگل میں سادھارن ویادھ کے ہاتھوں مارے جاؤگے پشوؤں کی طرح۔"

(اندھا یگ)

"اُنیسواں ادھیائے" کی شروعات ہی سوال سے ہے اور اختتام بھی سوال۔ "زندگی بھر وہ سوال ہی کرتا رہا۔ ان گنت سوال، سیدھے سادے سوال، ٹیڑھے اور پیچیدہ سوال۔ میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں، اور بالآخر مجھے موت کے بعد کہاں جانا ہے؟" مصنف کوئی ججمنٹ نہیں دیتا۔ جو جواب ملتے بھی ہیں وہ آدھے ادھورے ہیں۔ اس معنی میں یہ ناول ہمیں دنیا کو ایک سوال کی صورت میں دیکھنے کے کارن آزاد و خود مختار بناتا ہے۔

مصنف کو سچ کی تلاش ہے لیکن شک و شبہ کا سانپ بار بار ڈس جاتا ہے۔ ہر طرف موت کے بادل منڈلا رہے ہیں اور وہ موت کو لے کر بار بار متفکر ہو اٹھتا ہے۔ کبھی وہ مذہب اور تصوف، دہریت میں گہرا ڈوب جاتا ہے۔ کبھی دانشمندی کے دام مباحثہ و دلیل میں۔ وہ پوچھتا ہے "بتاؤ میرا انت کہاں ہے؟" لیکن اُنیسواں ادھیائے لکھنے کے بعد بھی وہ بھگوت گیتا کے فلسفے سے آزاد نہیں ہو سکا۔ ناول کا خاتمہ ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

"کیونکہ موت کے بعد جسم فنا ہوتے ہیں اور انسان کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتا ہے لہٰذا تمہارے اس جسدِ خاکی کے خاتمے کے بعد بھی تمہارا خاتمہ نہیں ہوگا۔ تمہاری یادیں، تمہارے اعمال تمہیں زندہ رکھیں گے کیونکہ یادیں اور اعمال کبھی نہیں مرتے۔ اور پھر میں جو زندہ ہوں---- میں، جو کبھی نہیں مرتا، ہمیشہ زندہ رہتا ہے----"

مہابھارت ختم ہو گیا اور ساتھ ہی ختم ہو گیا کرشن کا خاندان بھی۔ سمراٹ اشوک کالنگا کی جنگ کے قتل و غارت کو دیکھ کر بودھ بھکشو بن گئے لیکن تباہی و بربادی کی انتہا کا سوال پھر بھی بنا رہا۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں اور مختلف اقسام کی اندرونی کشمکشوں کے باوجود، ہیروشیما اور ناگاساکی کے ایٹمی دھماکوں کے باوجود، انسانی قتل عام، آشوٹز کے اذیت ناک کیمپوں اور موت کے گھروں کے باوجود، ہندوستان کی تقسیم کے المیے اور انسانی قتل عام کی چیخوں کے باوجود کیوں ہمیں فکر اور بے چینی نہیں ہوتی؟ کیوں ہمیں اظہار افسوس اور کفارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ تشویش اور بے چینی---- یہ افسوس اور کفارہ ہی ہے جو تند کشور وکرم کو "اُنیسواں ادھیائے" لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر یہ تشویش اور بے چینی ہم سب کا مقدر بن جائے تو شاید بیسواں ادھیائے قوسِ قزح کے سات رنگوں سے لکھا جائے گا۔

لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم بنیادی وجودیت ([illegible]

تصوف) سے متعلق سوالات ''میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور مجھے بالآخر کہاں جانا ہے؟'' کا سامنا کریں۔ یہ سب وہ بنیادی نقطہ جہاں سے تلاش کا عمل شروع ہوتا ہے اور جہاں سے سوال اٹھتا ہے کہ انسان کی فطرت اور مقدر کیا ہے؟ تنڈکشور وکرم بھی ان جستجوؤں کو ایک بچے کی حیرت کی صورت میں دیکھتے ہیں کبھی اپنے تجربوں کی سچائی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، کبھی ایک آدرش وادی نوجوان کے رومانی نظریے سے دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں، کبھی ایک سائنسدان کی مثل عقل وشعور کے دلائل کی پناہ لیتے ہیں لیکن ناول انھیں کیٹر النجنی بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سنسکاروں اور تہذیب کی نئی الجھنیں بھی مصنف کو امر لوہت سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ یہ کنفیوزن نہیں بلکہ فیوزن ہے جس کی آج کے عذاب زدہ دور میں اشد ضرورت ہے۔ یہ بات ناول میں سوانحی حالات اور ہندوستان کی تقسیم کے المیہ واقعات سے واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ کیٹر النجنی فیوزن کے باوجود مصنف کا بنیادی سوال باقی رہتا ہے۔ شک وشبہ دور نہیں ہوتا۔

''مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بینائی سے محروم دھرت راشٹر ہوں، جو ہمیشہ سنجے کے رحم وکرم پر ہی زندہ رہا ہوں۔ ہمیشہ اسی کی آنکھوں سے دیکھا اور اسی کے کانوں سے سنتا رہا ہوں۔ ایک بینا انسان تھا جو سنجے روپی لاٹھی کے سہارے ہی اسی کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھیں بند کیے چلتا رہا ہوں بچپن سے لے کر آج تک اسی کے دم سے چلتا پھرتا رہا اور ہر سوچ سمجھ کے لئے اسی پر بھروسہ کرتا رہا اور زندگی بھر اُس سے سوال ہی کرتا رہا۔''

لیکن مصنف کا مقصد صرف یہی نہیں کہ اُسے بیسویں صدی کے آخر اور نئی صدی کی آغاز میں ''انیسویں ادھیائے'' لکھنا پڑا بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ کورو کشیتر کے میدان میں ہی نہیں ذہن اور ضمیر کے میدان میں بھی سرگرم عمل رہتا ہے کہ دونوں کی دوری مٹ جاتی ہے۔ کون دھرت راشٹر ہے اور کون سنجے، کون ارجن ہے اور کون کرشن۔ مصنف کے دل ودماغ میں بھی کردار برسر پیکار رہتے ہیں۔ اُس کے ذہن میں کئی سرزمینیں مسلسل آباد اور برباد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ساتھ کئی زمانے گردش کرتے رہتے ہیں۔

تنڈکشور وکرم کے لئے تقسیم ہند کا المیہ زمین اور مذہب تک محدود نہیں بلکہ اُس معصومیت کی بھی موت ہے جسے وہ بچپن سے اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے بڑا ہوتا ہے اور یوں ہوتی ہے۔۔۔۔ گھر گھر وچار دھارا بھٹکتی ہے۔ اس کا دل یہ تخلیق تجرباتی ناول اور سوانح عمری بن گئی ہے۔ اور قاری یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہاں ہے منزل تیری اے لالۂ صحرائی؟

یہ ناول کوئی سماجیات (یا سیاسیات) کا مطالعہ نہیں لیکن معاشرے، تہذیب اور سیاست میں جو تبدیلیاں نمودار ہوئی تھیں وہ کس طرح اشیاء، افراد، خیالات، اشتہارات نیز رشتوں اور رواجوں یعنی زندگی کے ہر

میدان میں جھلک رہی تھیں اُسے یہ ناول بڑے سیدھے سادے انداز میں بیان کرتا چلا جاتا ہے اور ہم جان پاتے ہیں کہ تبدیلی کی فطرت اور طور طریقے کی ہیئت کیا ہے؟ اس کی رفتار اور تیزی کیا ہے۔ اس کی جہات کیا ہیں؟ ناول میں جو کچھ بھی بیان ہو رہا ہے قریب قریب میں بھی اُس کا شاہد رہا ہوں اس لئے ناول کی پوری دنیا مجھے اپنے سامنے نمودار ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ یہ گاؤں اور بستیاں، یہ گھر، آنگن، یہ کھیت کھلیان، یہ کارخانے، یہ کوچے، گلیاں اور بازار، گھر لوگ اور واقعات سب میرے ذہن وشعور میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ اسے کر اگر الگ طور پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح مصنف فیکٹ (Fact) اور فکشن (Fiction) کی سرحدوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یہ فیکشن (Faction) سے کہیں بہت آگے لے جاتا ہے۔ یہ ایسا ناول ہے جس میں اس کی اپنی مجبوری یعنی اپنا ہی نظریہ تنقید ہے۔ اس طرح عقل وشعور، تجربے اور وشواس میں جو تناؤ پیدا ہوتا ہے یہ ناول اُس کی خود بیداری کا اظہار کرتی ہے۔ یہ محض ایک نئی تکنیک ہی نہیں بلکہ نئی سوچ اور احساس کا مظہر بھی ہے۔

آج کے دور میں ہم سچ نہیں بولتے، سیاست بولتے ہیں۔ تنڈکشور وکرم سیاست اور نظریات کے بوجھ کے باوجود سچ بولتے ہیں۔ صرف اپنا سچ نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں کا سچ جنھوں نے اس کے صد ہا روپ دیکھے ہیں۔ یہ سرحد کے اس پار سے ہجرت کر کے گئے ہیں یا سرحد کے اُس پار سے شرنارتھی بن کر اس پار آئے ہوں۔ سچ ایک نہیں، یک رخی نہیں، مکمل یا مستقل نہیں اور نہ ہی حتمی۔ سچ وہ ہی نہیں جو ہمیں یا میرا کبیر، سماج، گروہ یا فرقہ دکھاتا ہے۔ یہ سچ مرنے والوں کی کھلی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ آبرو ریزی کی چیخوں میں سارے کائنات میں گونجتا ہے۔ مکمل سچ تو شاید ہم کبھی نہ دیکھ پائیں گے لیکن ان گنت لوگوں کے چہروں کے آئینے میں اس کی الگ الگ جھلک ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

مصنف نے پورے ناول میں خاص کر تقسیم ہند کے پس منظر میں اتنے چہروں کے آئینے پیش کئے ہیں کہ پورا ناول گہرے آشوب کا شیشہ گھر بن جاتا ہے ایک المیہ داستان ---- ایک حیرت کدہ ----درد کا دریا بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس میں اتنا درد اور بے چینی ہے، اتنی ہمدردی اور حسیت ہے۔ اتنے سوالات اور شبہات ہیں۔ عقل وشعور پر اتنا یقین ہے اور یقین پر اتنی غیر یقینی کہ اس سے پیشتر کسی دیگر ناول میں پڑھنے کو نہیں ملتی۔

شاید ہم ان سوالات کا مدلل اور سائنٹفک جواب دے سکتے ہیں لیکن ان سوالات کے پیچھے جو چھپا ہوا ہے اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ناول ایک سچ پر سوالیہ نشانوں اور سوالیہ کثرت کا احساس دیتا ہے۔ گہری تہہ میں یہ مصنف کے بچپن سے لے کر پیری تک کا سفرنامہ ہے ---- سائیکوگراف نفسیاتی کیا

نہ ہے مگر دانشمندی اُسے کو اندھی عقیدت سے دور لے جاتی ہے تو موت کا لازمی ہوا اُسے مضطرب کر دیتا ہے۔ موت کے وقت، مقام اور شکل کی غیر یقینیت اس کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ یہ سوال مصنف نے موت کے باب میں اٹھایا ہے

"اوہ۔۔۔نہیں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم انجام کو پہنچنے والے ہو اور تمہارے سلسلۂ حیات کی کڑی ٹوٹ گئی ہے۔۔۔اور تم موت سے دوچار ہو گئے ہو۔ لیکن دوست! اس کائنات میں تو کوئی بھی شے مستقل اور دائمی صورت میں نہیں رہتی۔ ہر شے تغیر پذیر ہے۔ ہر فلک پہاڑ ہوں یا بحر، دریا، میداں، سبزہ و شادابی والیاں ہوں کہ ماہ و آفتاب، حیوان ہوں کہ انسان، چرند پرند ہوں کہ درندے۔ ہر کسی کے مقدر میں آخر کار فنا ہونا لکھا ہے۔۔۔کسی کو ثبات حاصل نہیں۔ کوئی شے ایک حال میں نہیں رہ سکتی۔ انسان کی زندگی کا خاتمہ بھی لازمی ہے اور اس کے لئے موت برحق ہے۔ اگر انسان اس بات کو سمجھ لے تو اُسے موت سے خوفزدہ نہ ہونا پڑے اور اس میں وہ ہمت و حوصلہ پیدا ہو جائے کہ تختۂ دار پر لٹکائے جانے پر بھی وہ موت سے خوفزدہ نہ ہو اور زندگی کے آخری لمحات میں بھی سقراط، بھگت سنگھ، منصور اور سرمد کی طرح اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہو اور ہنستے ہنستے جامِ مرگ ہونٹوں سے لگا لے کیونکہ موت کے بعد جسم فنا ہوتے ہیں اور انسان کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتا ہے۔ لہٰذا تمہارے اس جسدِ خاکی کے خاتمے کے بعد بھی تمہارا خاتمہ نہیں ہوگا۔ تمہاری یادیں، تمہارے اعمال تمہیں زندہ رکھیں گے کیونکہ یادیں اور اعمال کبھی نہیں مرتے۔ اور پھر نہیں جو زندہ ہوں۔۔۔نہیں، جو کبھی نہیں مرتا۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔۔۔"

موت نہ ہوتی تو شاید مقدر بھی نہ ہوتا:

"اور ان ہی جوابات پر غور و خوض کرتے ہوئے بالآخر مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوئے عدم کی جانب روانہ ہو جانا ہے، کیونکہ یہی میرا مقدر ہے، یہی میرا مقدر ہے"

مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔ جب خدا نے انسان کے سامنے خیر و شر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا تو انسان نے شر کو چن لیا اور اس طرح اس نے نہ صرف خیر کو تیاگ دیا بلکہ اپنی آزادی کو بھی کھو دیا اور یہ مقدر کا غلام ہو گیا۔ یہ ناول کل یگ میں اچھائی اور سچائی کو پھر سے بحال کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لا محق کہنے کی آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام، جس میں نہ کل ہے نہ جامعیت۔ یہ حق کی تلاش اور حصول تو یہاں تک کہ کر دریافت کرتا ہے کہ اسے آپ تبھی کہیں یا سماج کا آئینہ حقیقی تصویر کشی کہیں یا علم و سائنس کی تنقید، وقت کا سچ کہیں یا لا جال لیکن سچ یہ ہے کہ مہابھارت ختم نہیں ہوا۔ وہ زمان و مکان اور ہیئت بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس میں نیا ادھیائے جڑتا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

O

ہم سے ایسے فکر کو پالا نہیں گیا
زیرِ زمین زر تھا نکالا نہیں گیا

جن کی دعا سے پیدا ہوئی ہے شعاعِ مہر
ان بستیوں میں اس کا اجالا نہیں گیا

گو سامنے نظر کے شفاف جھیل تھی
ان دلدلوں سے پاؤں نکالا نہیں گیا

دور اس لیے بھی حقیقت کا شہر ہے
رنگوں سے آگے دیکھنے والا نہیں گیا

ہجرت وہ خود ہی کر گئیں یہ بھوک دیکھ کر
گھر سے ضرورتوں کو نکالا نہیں گیا

ہم اس لیے بھی شہر میں بے ننگ و نام ہیں
ورثے میں جو ملا تھا سنبھالا نہیں گیا

مولوی محمد اسلام وڑائچ
(سرگودھا)

"میں بھی حسینِ وقت ہوں"

پریم پال اشک

میں بھی حسینِ وقت ہوں جو کفر کے خلاف
میدانِ کربلا میں اکیلا لڑا کیا

یہ شعر کسی اور شاعر کا نہیں بلکہ اُردو کے ممتاز صحافی ادیب اور ادیب جناب نند کشور وکرم کا ہے جنھوں نے اس شعر کو اپنے کردار کا خاصہ بنالیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ روایت کے خلاف بغاوت کی ہے اور اس سماج کے ہر کفر کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

گورا چٹا رنگ، گٹھا ہوا جسم، میانہ قد، چہرے پر ہر وقت کھلی مسکراہٹ، چوڑی پیشانی اور اڑتے ہوئے بال ذہانت کی غمازی کرتے ہیں

-

نند کشور وکرم سے میری گزشتہ تیس سال کی دوستی ہے۔ وہ یاروں کے یار ہیں اور ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اُن کا شعار ہے۔

نند کشور وکرم کے نظریات اشتراکی مدرسہ سکول کے حامل ہیں جہاں مذہبی تعصب نسلی امتیاز کو کوئی جگہ نہیں ملتی۔ اگرچہ اُن کا کنبہ سناتن دھرمی نظریے کا قائل ہے لیکن بذاتِ خود نند کشور وکرم اندھی تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ وہ بیدم سلطان پوری کے نظریے سے تو سخت نفرت کرتے ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب کے اصول جو انسان دوستی محبت رواداری اور راست بازی و نیکی کی راہ دکھاتے ہیں، انہیں قبول کرنے میں نند کشور وکرم کو کوئی عار نہیں۔ یہ آزاد خیالی اور میانہ روی کے قائل ہیں۔ کٹر مذہبی نظریات تو انہوں نے پسند کئے ہی نہیں۔

نند کشور وکرم ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو پنجاب کے شہر راولپنڈی (حال پاکستان) میں ایک موہیال برہمن پریوار میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کو دت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ وہی برہمن خاندان ہے جسے عرفِ عام میں حسینی برہمن بھی کہا جاتا ہے جس نے جنگِ کربلا میں یزید کی فوج کے خلاف مورچہ باندھ کر حضرت امام حسین کی معاونت کی تھی۔ نند کشور وکرم کے والد کا نام شری رام لال دت تھا وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے لہٰذا اُن کا تبادلہ ضلع کی مختلف تحصیلوں میں ہوتا رہتا تھا وکرم صاحب بھی بچپن میں اُن کے ساتھ ساتھ جاتے رہے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے گوجر خان اور کہوٹہ میں حاصل کی۔ اُن کی والدہ کا نام شریمتی کوشی دت تھا۔ اُن کی دو بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا جس کا لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں اپنے ننھیال کوری کے ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول سے ورنیکلر فائنل کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ سناتن دھرم ہائی اسکول راولپنڈی میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان دیا۔ اسی دوران ملک کی تقسیم ہو گئی اور اُن کا پہلا افسانہ "ادیب" ماہنامہ "زلاشی" دہلی کے دسمبر ۱۹۴۷ء کے شمارے میں شروع ہوا۔

ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے عارضی طور پر اجبال میں سکونت اختیار کی اور اس کے بعد وہ کانپور چلے گئے اور وہیں سے ۱۹۴۹ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز سرکردہ اُردو اور صوف مول کے صحافی مدیر اور شاعر میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزناموں "قومی اخبار" اور "امرت" میں بطور سب ایڈیٹر خدمات انجام دیتے ہوئے کیا جہاں اُن کے ساتھ اُن کے گہرے دوست اور اُردو اور ہندی کے ممتاز ناول اور افسانہ نگار دیویندر اسر بھی کام کرتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں دیویندر اسر کے اشتراک ہی سے انہوں نے ماہنامہ "ارتقا" کا اجرا کیا جو دیویندر اسر کی گرفتاری کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں انہوں نے ماہنامہ نئی کہانی کی ادارت کی۔

۱۱ مئی ۱۹۶۱ء میں وہ ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئے۔ اُن کا چھوٹا سا کنبہ اُن کی اہلیہ کے علاوہ تین بچوں یعنی دو لڑکیوں اور ایک لڑکے پر مشتمل ہے۔ تینوں بچوں کی شادی ہو چکی ہے اور بیٹا گزشتہ پندرہ بیس سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔

نند کشور وکرم نے ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن اور ۱۹۵۸ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں انہوں نے دلی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا۔

مارچ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور ۱۹۶۳ء میں وہ وزارت اطلاعات و نشریات کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے مشہور ادبی ماہنامے "آج کل" میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ ۱۹۷۹ء میں وہ پبلک انفارمیشن بیورو کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ انفارمیشن افیسر مقرر ہوئے اور آخر ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو وہ سنٹرل انفارمیشن سروس سے سبکدوش ہو گئے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اشاعتی ادارے "پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز" کی شروعات کی۔ اور ۱۹۸۵ء سے انہوں نے "عالمی اُردو ادب" کے عنوان سے اُردو کے واحد حوالہ جاتی جریدے "عالمی اُردو ادب" کی شروعات کی جو پچھلے ۱۲ سال سے باقاعدگی سے

شائع ہو رہا ہے اور ساتھ ہی وہ ۱۹۸۴ء سے ہر سال اُردو افسانوں کا انتخاب شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ادارے سے کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس ادارے کو اشاعتی خدمات کے صلے میں دلی اُردو اکادمی کی طرف سے ۱۹۹۱ میں ۱۹۹۰ کا منشی نول کشور ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

عالمی اُردو ادب ایسا واحد حوالہ جاتی مجلّہ ہے جو سال میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ ایک شمارہ میں معمول کے مطابق گزشتہ سال کے دوران بھارت، پاکستان اور دیگر ممالک کے مختلف جرائد میں شائع ہونے والے شعری اور نثری تخلیقات کا انتخاب ہوتا ہے جس میں نظمیں، غزلیں، دوہے، گیت، رباعیات اور قطعات ہوتے ہیں۔ اور نثری انتخاب افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اہم شاعروں اور ادیبوں کے سوانحی اشاریے ہوتے ہیں اور 'وفیات' کے زیرِ عنوان مرحومین ادبا کا تذکرہ بھی شامل ہوتا ہے اور خراجِ عقیدت کے طور پر اہم شعرا و ادبا پر مضامین بھی دیے جاتے ہیں۔ بخطِ شاعر کے زیرِ عنوان مشہور شعرا کی ان کے ہاتھ سے لکھی شعری تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔ سال بھر کی اہم ادبی خبروں کے علاوہ اعزاز یافتہ کی فہرست کے ساتھ ساتھ اہم اُردو کتب کی فہرست، کتب خانوں کی فہرست بھارت اور پاکستان کی مختلف دانش گاہوں میں کیے جانے والے تحقیقی کاموں کا جائزہ بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دنیا میں اُردو کی صحیح پوزیشن پر بھی روشنی ڈال دیتے ہیں۔ ابتدا میں پیش لفظ کے زیرِ عنوان مدیر کا اداریہ نوٹ بھی ہوتا ہے جو فن کی بالیدگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

دوسرا شمارہ خصوصی نمبر ہوتا ہے جس میں باری باری بھارت۔ پاک کی ممتاز ادبی ہستیوں کے فن، شخصیت اور ادبی خدمات کا سیر حاصل جائزہ ہوتا ہے۔ اب تک حبیب جالب، دیویندر اسر، احمد ندیم قاسمی اور علی سردار جعفری جیسے معتبر شعرا و ادبا پر خصوصی شمارے پیش کر چکے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نند کشور وکرم پچھلے پندرہ برس سے یہ فریضہ کسی صلے، مرتبے اور دام و درم کی خواہش کے بغیر نہایت تندہی، محنت اور خلوص کے جذبے کے تحت بخوبی انجام دے رہے ہیں اور جو کام انجمنوں اور اداروں کو کرنا چاہیے، نند کشور وکرم وہ خدمت نہایت لگن اور محنت کے ساتھ تنہا انجام دے رہے ہیں۔ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ادارے یا فرد سے کوئی مالی معاونت حاصل نہیں کرتے اور اس کی اشاعت کے تمام اخراجات بھی خود ہی برداشت کرتے ہیں۔ ہندی اور اُردو میں ان کی اب تک پچاس سے زائد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں تخلیقی کام بھی ہیں، تحقیقی بھی، تراجم بھی ہیں اور تالیفات بھی۔ ان میں اہم ترین ہے ان کا تجرباتی ناول "انیسواں ادھیائے" جس میں انہوں نے زندگی اور موت کے فلسفے اور اپنے نظریۂ حیات اور معاشرے میں ہونے والے سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی استحصال کی عکاسی نہایت خوبصورت انداز سے کی ہے اور فریب و مکر کے ہر شیشے کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار مصنف کی روح ہے اور گرد و پیش کا ماحول معاون کردار۔ انداز بیاں انتہائی شگفتہ ہے۔ انہوں نے پورے ماحول کو نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیا ہے۔

ان کے علاوہ ان کا ایک اور ناول "یادوں کے کھنڈر" اور افسانوی مجموعہ "آوارہ گرد" بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں جہاں زندگی کے تلخ و ترش اور شیریں حقائق کی عکاسی ہوتی ہے وہاں ان میں تقسیم اور ہجرت کا کرب نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ان کے کردار روشن مستقبل کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انہوں نے اس دور میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی استحصال کو طوطا مینا اڑائے بغیر نہایت سیدھے سادے انداز میں کمال خوبی کے ساتھ پیش کر دیا ہے اور اپنے ترقی پسند نظریات اور انسانی اقدار کے باعث دنیائے افسانہ میں اپنی نمایاں شناخت پیدا کی ہے۔

نند کشور وکرم کے ناول "یادوں کے کھنڈر" میں ملک کی تقسیم اور مذہبی جنون سے پیدا ہونے والے مسائل کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس ناول میں فرقہ پرست طاقتوں کے فریب کا شیشہ پاش پاش کرنے کے لیے کاری ضرب لگائی ہے۔ ساحر کا یہ شعر ان کے فن پر خوب صادق آتا ہے

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس ناول میں کردار نگاری نہایت چابکدستی سے کی گئی ہے اور انداز بیان انتہائی چست، برجستہ اور رواں ہے۔

یہی نہیں، انہوں نے ہندی میں اُردو کے ممتاز ادیبوں کو ہندی دنیا سے روشناس کرا کر ایک بہت ہی عمدہ کارنامہ انجام دیا ہے اور ہندی اور اُردو زبانوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

"اُردو کہانی کار سیریز" کے تحت ان کی پریم چند، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، کرشن چندر، سدرشن، دیویندر ستیارتھی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، منٹو، انتظار حسین، ممتاز مفتی، رام لعل اور بلونت سنگھ پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے پاکستان کی شاہکار اُردو کہانیاں، اُردو کی شاہکار کہانیاں، اُردو کی سرحد پار شاہکار کہانیاں کے زیرِ عنوان بھی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرۃ العین

حیدر کے شہرۂ آفاق ناول "آگ کا دریا" کا ہندی ترجمہ بھی ایک کارنامے سے کم نہیں۔

نند کشور وکرم کئی ممالک کی سیاحت بھی کر چکے ہیں جن میں فرانس، برطانیہ، امریکہ، کناڈا اور نیپال شامل ہیں۔

اس حقیقت سے تو ہم بخوبی واقف ہیں کہ اس دور میں انعامات اور اعزازات کس تگ و دو بازی سے حاصل کئے جاتے ہیں مگر جہاں تک نند کشور وکرم کا تعلق ہے انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی انعام یا اعزاز پانے کے لئے کام نہیں کیا کیونکہ ایک تخلیق کار اعزاز یا انعام پانے کی ہوس میں اپنی تخلیق منظرِ عام پر نہیں لاتا۔ بلکہ اس میں اُس کی ذہنی آسودگی کو دخل ہوتا ہے اگر انعام ملتا ہے تو بھی بہتر اور نہیں ملتا تو بھی بہتر۔

لیکن اس کے باوجود ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے مسودات "کوہ پیغمبر ڈائری" اور "سفید انقلاب" پر انہیں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء میں وزارت زراعت، حکومتِ ہند کے انعامات، ۱۹۸۱ء میں اُن کے ناول "یادوں کے کھنڈر" پر اتر پردیش اُردو اکادمی اور مغربی بنگال اُردو اکادمی کے انعامات، ۱۹۹۸ء میں ان کے افسانوی مجموعے "آوارہ گرد" پر اُردو اکادمی دہلی کا انعام ملا۔ ۲۰۰۱ میں اُن کے تجرباتی ناول "انیسویں ادھیائے" پر بھی اردو اکادمی دہلی کی طرف سے انعام کا اعلان ہوا لیکن انہوں نے بوجوہ انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے علاوہ ہندی سے اُردو ترجمے پر انہیں انو واد پریشد دہلی کا ۹۹-۱۹۹۸ کا دواکیش پرسکار انعام اور ۱۹۹۶ء میں تخلیقی ادب اور صحافت میں نمایاں کارکردگی پر "سنگم کی آواز" کی جانب سے اعزاز سے نوازا جانا، اُن کی خدمات کا واقعی اعتراف ہے۔

نند کشور وکرم کی سینما سے متعلق جانکاری بھی اچھی خاصی ہیں اور وہ فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا سے فلم شناسی کا کورس بھی کر چکے ہیں۔ وہ ہندی سینما کے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں اور کئی قابلِ ذکر مضامین سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ اس موضوع پر اردو ماہنامہ "آجکل" کے یادگار فلم نمبر کی ترتیب و تدوین سے بھی اُن کی ذہانت و کاوش کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

یہ ہیں نند کشور وکرم جنہوں نے پچھلے ساٹھ برس میں گیسوئے ادب سنوارے ہیں اور اب زندگی کی ۸۱ ویں بہار دیکھنے والے ہیں:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ماہیے

اک کمسن گُجری ہے
جسے کہیں دنیا۔ تیری ہے نہ میری ہے

پھر شکل دکھا ساجن
آنگن بھرا پرا۔ پچھواڑے آ ساجن

دن رات برستے ہیں
تیرے ملن کو اب یہ نین ترستے ہیں

چمکیلا گھاؤ ہے
ٹھنڈی راتوں میں یہ بدن الاؤ ہے

کانٹوں کی یارکلی
شاہ کے سامنے بھی۔ پھولے گی انارکلی

اشک آنکھ سا تے نہیں
یہ وہ مسافر ہیں۔ جو لوٹ کے آتے نہیں

تو چاہے بول نہ بول
لیکن میرے لئے۔ یہ دل دروازہ کھول

آنکھوں میں پانی ہے
ہجر میں اب اس کے۔ اک عمر بتانی ہے

کچھ منہ سے بول میاں
میرے مقدر کی۔ گتھی بھی کھول میاں

کرشن کمار طور

دھرم شالہ بھارت

ایک اکیلے آدمی کی کوشش

ودے بھان شر

اس دیش میں بہت سے لوگ اُردو نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اس کے ممتاز و افضل تخلیق کاروں کی اعلیٰ پائے کی تخلیقات سے کتنے متعارف ہیں، میں نہیں جانتا۔ میں اس نقطۂ نظر سے ان انتخابات ☆ کی اشاعت کی تعریف کرتا ہوں کہ ان کے ذریعے بلاشبہ بہت سارے لوگ اُردو کے ممتاز کہانی کاروں سے متعارف ہو سکیں گے۔

ان انتخابات کے بیک کور پر کہانی کار میری تنقیدی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں۔ تبصرہ کیا؟ کتابیں لکھی گئی ہیں ان پر۔ میری توجہ ان کے مرتب نند کشور وکرم کے تخلیقی فطرت اور ان مرتبہ کتابوں کے پیچھے اُن کے مقصد کو تحریر کرنے کا ہے۔ لیکن دل میں ایک سوال بار بار اٹھتا ہے کہ یہ ٹھیک کام وکرم نے کیوں کیا؟ کیا وہ ان بڑے کہانی کاروں کی بیساکھیوں کے ذریعے اپنا قد اونچا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ان سے کوئی رقم حاصل کرنے کی ان کی ہوس ہے؟ یا ان ممتاز کہانی کاروں کو اور مزید مقبول بنانے کی وہ سعی ہیں؟

جوں جوں ان سوالات کی گہرائی میں میں اُترتا جاتا ہوں----

چیزیں صاف ہوتی جاتی ہیں۔ میں نند کشور وکرم کو پچھلے پچیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ بذات خود اُردو کے ایک ادیب ہیں۔ اور کافی لوگ انہیں جانتے بھی ہیں اس لئے شہرت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے انتخابات کو تالیف/مرتب نہیں کیا ہے۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ رہی بات ان سے پیسہ کمانے کی تو اگر کچھ آتا بھی ہے تو وہ ناشر کی جیب میں جائے گا۔ اس لئے یہ بات بھی بے بنیاد لگتی ہے۔ جہاں تک ان ادیبوں کو مزید مقبول بنانے کی بات ہے تو شاید وکرم میں خدا نے اتنی عقل ضرور دی ہے کہ وہ سمجھ سکیں کہ ان ممتاز کہانی کاروں کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بذات خود ممتاز اور عام لوگوں کے درمیان بے حد مقبول ادیب ہیں۔

پھر سوال جوں کا توں کھڑا ہے۔ جانچ پڑتال کے ردعمل میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کی تہہ میں وکرم کی ترقی پسندانہ شخصیت ہے۔ کسی زمانے میں وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہ چکے ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران جب ساحر لدھیانوی جیل میں بند تھے اور جب لوگ اُن کے ساتھ تعلقات کو اجاگر کرنے سے ڈرتے تھے، اُس وقت بھی وکرم کھلے عام کہتے پھرتے تھے کہ ساحر لدھیانوی ایک نڈر، بیباک اور ایماندار لیکھک ہیں۔ وہ میرے گہرے دوست ہیں۔ انہوں نے ساحر لدھیانوی پر کتاب شائع کی---- یہ جانتے ہوئے بھی کہ برقِ عتاب اُن پر بھی گر سکتی ہے۔

یہ سب میں نے وکرم کی ترقی پسندانہ تخلیقی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے لکھا ہے مگر ان مرتب کتابوں کو دیکھنے سے اُن کا ایک دوسرا روپ بھی سامنے آتا ہے۔ جب وہ پریم چند (جو ادب کو سماج کو بدلنے کا ایک ہتھیار مانتے ہیں) کے ساتھ ممتاز مفتی (جو فرائیڈ کے اصولوں پر مبنی انسان کی دبی ہوئی خواہش و ہوس کی خاص طور پر تصویر کشی کرتے ہیں اور خود کہتے ہیں "میری کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے") جیسے افسانہ نگار کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ وکرم کی کمٹمنٹ کہاں ہے؟ پریم چند کی تخلیقی دنیا کے ساتھ یا ممتاز مفتی کے فرائیڈین تجربے کے ساتھ۔ مجھے یہ قرار کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی ہے کہ وکرم کا ادبی اور تخلیقی جذبہ اچھی تحریر کے تئیں کھلا ہے۔ وہ تحریر جو پریم چند، سدرشن سے لے کر منٹو، کرشن چندر، عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تک پہنچتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی مذکورہ کتابی سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم کہانی کار رہ نہ جائے۔ اس میں مشہور کہانی نویس سدرشن بھی شامل ہیں جو اپنے دور میں ہندی اور اُردو کے مشہور و معروف ادیب تھے لیکن آج اُن کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ اسی طرح اس سلسلے میں اُردو کے معروف افسانہ نگار علی عباس حسینی بھی شامل ہیں جن سے متعلق ہندی میں بہت کم لکھا گیا ہے۔

وکرم نے بڑی ایمانداری اور ادبی سوچ کے ساتھ ان کہانی کاروں کا انتخاب کر کے انہیں اُردو سے ہندی رسم الخط میں پیش کیا ہے۔ ہر (افسانہ نویس) کا مختصر تعارف دیا ہے اور اُن کی ڈھیر ساری کہانیوں کے بیچ اُن کی اہم کہانیوں کو ڈھونڈ کر انہیں ایک جگہ یکجا کیا ہے۔ ان مرتب کتابوں سے اچھے ادب کو پہچاننے اور پڑھنے کی عام آدمی میں ایک سمجھ پیدا ہو گی ایسا میں سوچتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اُردو کہانی کاروں پر نند کشور وکرم کے ذریعے مرتب کئے گئے اس کتابی سلسلے کا گرم جوشی سے سواگت ہو گا۔

[illegible]

۱۔ پریم چند اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۲۔ سدرشن اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۳۔ علی عباس حسینی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۴۔ کرشن چندر اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۵۔ عصمت چغتائی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۶۔ سعادت حسن منٹو اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۷۔ قرۃ العین حیدر اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۸۔ راجندر سنگھ بیدی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۹۔ غلام عباس اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۰۔ ممتاز مفتی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۱۔ احمد ندیم قاسمی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۲۔ انتظار حسین اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۳۔ ساحر لدھیانوی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۴۔ خواجہ احمد عباس اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۵۔ دیویندر ستیارتھی اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۶۔ بلونت سنگھ اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں ۱۷۔ رام لعل اور اُن کی سرشیٹھ کہانیاں

حیرانیوں کی دنیا

مشرف عالم ذوقی

تئیسواں ادھیائے---- حقیقت یہ ہے کہ میرا اور اس کتاب کا برسوں کا رشتہ ہے۔ تئیس برس میں دوستی میں سرحدوں اور عمر کا قائل نہیں۔ دلی آنے کے بعد شروعات کے دو تین برسوں میں ہی، جن دوستوں کا بے پناہ پیار میرے حصے میں آیا ان میں وکرم صاحب بھی ایک تھے۔ اس طرح دلی میں ابھی پاؤں جمنے بھی نہ پائے تھے کہ قدم خود بخود چل کرشن نگر کی طرف اٹھ گئے۔ ۱۹۸۵ سے آج تک یعنی سن 2006 تک ہمارے تعلقات کا جائزہ لیجئے تو اکیس بہاروں اور اکیس خزاؤں کا حساب ملتا ہے اور آپ جانتے ہیں اکیس برسوں کی دوستی کم نہیں ہوتی۔

پچھلے دس برسوں میں 'تئیسواں ادھیائے' کے بارے میں وکرم صاحب سے کچھ نہ کچھ سنتا آرہا تھا۔ تئیں شری کرشن جی کا بھکت ہوں اور بھگوت گیتا کا مطالعہ برسوں میرے حصے میں رہا ہے اور مجھے قدم قدم پر اس الہامی کتاب نے چونکایا بھی ہے۔ بھگوت گیتا کے اٹھارہ ادھیاؤں میں زندگی اور موت کا فلسفہ قید ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود سے لے کر زندگی اور نروان کے ایسے ایسے مارگ کھول دکھائے گئے ہیں کہ عقل دنگ حیران رہ جاتی ہے۔

جب پہلی بار وکرم صاحب نے "تئیسواں ادھیائے" کا ذکر کیا تھا تو میری کوئی خاص دلچسپی اس کتاب میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ "تئیسواں ادھیائے" کے طور پر وکرم صاحب آخر کیا پیش کرسکتے ہیں؟ لیکن آہستہ آہستہ جو کچھ سامنے آرہا تھا وہ مجھے چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ ان دس برسوں میں متعدد موقعوں پر وکرم صاحب نے مجھے اس کے ابواب سنائے۔ انجام---- موت---- خدا---- ایسے کتنے ہی متون اپنی گہرائی اور شدت کے ساتھ سمندر کی تیز لہروں کی طرح مجھے بہائے ہوئے دور لے گئے۔

سوچتا ہوں کیا یہ وہی وکرم صاحب ہیں جو ہر بات پر مسکراتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے گیتا کے ان فلسفوں کو کئی صدی کے تناظر میں دیکھنے والی ان کی آنکھیں ہر لمحہ اپنے تجربہ اور تجزیہ میں لگی رہی ہوں۔ ممکن ہے عمر کے پاؤں کافی دور نکل آنے کے بعد فلسفے نے اچانک ان اٹھارہ ادھیاؤں میں ایک نئے اور خوبصورت ادھیائے کا اضافہ کردیا ہو۔

'تئیسواں ادھیائے' پہلے صفحے سے ہی حیرانیوں کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ ایک طرف وحدت راشٹر ہیں دوسری طرف سنجے۔ آپ دنیا کو کیسی آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں گجرات جیسے المیے سے دو چار آنکھیں وحدت راشٹر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اور سنجے سے وہ رہنے کو کہتی ہے۔ وہاں بھی ایک کوروکشیتر تھا اور یہاں بھی ایک کوروکشیتر تھا۔ کل کی مہابھارت کے لئے ارجن اور شری کرشن جی تھے آج کی مہابھارت میں کون ہے؟ میڈیا---- سیکولر پارٹیاں یا----؟

خدا کے وجود پر یقین نہ رکھنے والے تو کشور وکرم کے لئے زندگی اور موت کے یہ فلسفے کیسے ہیں؟ یہ دنیا کیسی ہے؟ دنیا کا رقص کیا ہے۔ بہاروں کا فلسفہ کیا ہے۔ خزاں کی رت کیسی ہے۔ دن کا اُجالا اور رات کی خاموشی کیسی ہے۔ دنیا کا سناٹا اور مذہب کی وادیاں کیسی ہیں۔ تسلی کیا ہے۔ خفا کیا ہے۔ اقرار کیا ہے۔ انکار کیا ہے۔ فلسفہ وقت سے آگے نکل کر فکر کی یہ کشتی کسی ایک سمندر کا رخ نہیں کرتی۔ یہ سارے سمندروں کا پانی پی کر امر بن جاتی ہے---- وہ سوالوں کے 'انگنی گربھ' میں اتر جاتے ہیں اور وحدت راشٹر کی طرح سنجے سے کہتے ہیں۔ دیکھو کوروکشیتر میں کیا چل رہا ہے؟ اور سنجے اپنے خیالات کے اسکرین پر جو کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ سب کچھ وحدت راشٹر کو بتانا شروع کرتے ہیں۔

۷۷ سال کی زندگی میں وکرم صاحب نے زندگی کو جیسا دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا، زندگی سے متعلق جیسے جیسے سوالوں سے گزرے وہ سارے سوال 'تئیسواں ادھیائے' کے طور پر قاری کے سامنے رکھ دئے۔ دراصل یہ سوالات ان کی زندگی بھر کی کمائی ہے۔ زندگی بھر کا حاصل۔ یوں کہ اب تک کے تجربوں کا نچوڑ ہے---- ایک لمبی اندھیری سرنگ جہاں کسی بھی مذہب والے کے لئے بھٹک کر گم ہونے کے تمام راستے یا بھول بھلیاں موجود ہیں۔ اس لئے کسی کمزور دل والے قاری کو اس کتاب کا مطالعہ بہت سنبھل سنبھل کر کرنا چاہیے ورنہ ممکن ہے اس 'گجراتی عہد' میں جہاں ہر لمحہ کٹر پن کا غلبہ طاری ہوتا جارہا ہے۔ خدا سے بے یقینی کی فضا اور مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہوتا جارہا ہے۔ یہ کتاب اچانک آپ کو ایک گہرے سناٹے میں محصور کر لے---- اس طرح کہ جب آپ باہر آئیں تو آپ بھی وکرم صاحب کی سطح پر سوچتے ہوئے اپنے لئے تسلی کے لئے نروان کا راستہ اختیار کرلیں۔

یہ سوچنا ضروری ہے کہ وکرم صاحب نے آخر اس انوکھی کتاب کو لکھنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ یہ ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔ (وقت اور مدت گزرنے کے ساتھ ہی اس کتاب کا ایک اقتباس بنا لے ہے) اس لئے آگے بھی، مستقبل کے تعلق ان امور پر کھل کر گفتگو کریں گے کہ آخر وہ کون سے مسائل رہے ہوں گے جب وکرم صاحب نے 'تئیسواں ادھیائے' جیسی مشکل کتاب کو لکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اور یقیناً اس کتاب کے گہرے مطالعے کے بعد میں پختہ یقین کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ تقسیم اور ہجرت کے واقعات نے اپنے جو نقوش وکرم صاحب کے ذہن پر مرتب کئے، ان سے بچ بچا کر گزر جانا ممکن نہیں تھا۔ اپنے طویل مضمون 'خرقہ و دہریت'---- کچھ شیڈس میں میں نے تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس وقت، اس ہنگامی صورت حال میں جو ادب تحریر ہوئے، وہ جذباتیت اور فرقہ واریت کی عینک سے تحریر ہوئے۔ کرشن چندر سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک---- جو بچ گئے جیسے راما نند ساگر وغیرہ---- تو بعد میں ان لوگوں کے

فرسٹریشن یا نا منہاد سیکولرزم کے ختم ہوتے ہی یہ بھگوانگ میں رنگتے چلے گئے لیکن.... تقسیم اور آزادی کے بعد کے برسوں میں وکرم صاحب لگاتار سوالوں کے کٹھن مرحلے سے گزرتے رہے۔ ممکن تھا یہ آپ بیتی انہوں نے آج سے چالیس پچاس سال پہلے مکمل کی ہوتی تو اس میں وہ رنگ نہ آ پاتا جو آج پیدا ہوا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وکرم صاحب نا منہاد سیکولرزم کی باریک رسی پر نہیں چلے۔ وہ اندر باہر دونوں طرف سے مضبوط تھے، مذہب کے جبر سے انسان کو آزاد کرانے کی کوشش نے جو سوالات پیدا کئے تھے، وہ آہستہ آہستہ 'انیسوں ادھیائے' میں پھیلتے چلے گئے۔

بھگوت گیتا کے اٹھارہ ادھیائے کے بعد ـــــ یہ انیسوں ادھیائے جدید زندگی کا نتائج کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور درحقیقت 'انیسوں ادھیائے' کے ایک ایک لفظ میں رن بھومی کا وہ مہابھارت چھپا ہے کہ جس کی دور درشٹی بھی کانپ اٹھتی ہے اور دھرت راشٹر چلا اٹھتے ہیں۔ "بھگوان ان آنکھوں میں پرکاش کبھی مت دینا۔"

حیات وممات سے گزرتے ان انیس ادھیاؤں میں نند کشور وکرم نے اپنے انوکھے تجربات کی وہ دھوپ رکھ دی ہے، جس کی ایک ایک کرن اپنے قاری کو جلانے نیا جھلسانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

برسوں پہلے میں نے الکزنڈر سولنسٹن کی کتاب پڑھی تھی۔ "کینسر وارڈ"، "گلاگ آرکیپلاگو" دونوں میں مجموعی طور پر ایک ہی فضا تھی۔ یعنی پہلی بار میں ہر باب الگ الگ کہانیوں کے حصے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کے مکمل مطالعے سے ایک بھیانک سچ کے کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا ــــ دیکھا جائے تو نند کشور وکرم یہاں اس معاملے میں الکزنڈر سولنسٹن کے کافی قریب ہیں۔ یہاں بھی انیسوں ادھیائے زندگی کے الگ الگ فلسفوں سے گزرتے ہوئے بیان ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ الگ الگ کہانیاں ہوں لیکن قاری جب ان ادھیاؤں کی آگ کے دریا سے گزر چکا ہوتا ہے تو اپنی روح میں اترتے ہوئے ---- سارتر کے Iron in the Soul سے بچنے کا کوئی ساتھی راستہ اس کے پاس نہیں ہوتا ہے۔

ہم گجرات، نریندر مودی اور جارج فرنانڈیز کے جس عہد میں داخل ہوئے ہیں، ہم 'ٹاولی فلسفے' کے جس 'بھگوانگ' سے ہر روز مرتے ہوئے گزر رہے ہیں، وہاں اس کتاب کی اہمیت ہمارے نزدیک اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ صرف ایک کتاب یا آپ بیتی نہیں ہے، ایک ایسی کڑوی سچائی ہے جس کے لئے ہمیں کچھ دیر ٹھہر کر سوچنا چاہیے۔

اگر اسے مبالغہ آرائی نہ سمجھا جائے تو 'انیسوں ادھیائے' میں اپنی تلاش (میں کون ہوں؟) سے خدا کی تلاش تک کا یہ سفر بیانیہ انوکھا اور بھیانک ہے جو ادب میں بہت دنوں تک گفتگو کے نئے دروازے کھولنے میں کامیاب رہے گا اور اردو ادب میں ایک ناقابل فراموش اضافے کا باعث ہوگا۔

انتم پروچن

نند کشور وکرم

بجنول۔ یہاں موجود خواتین و حضرات! آج ہم سب لوگ جگل کشور جی کی وفات پر انہیں شردھانجلی ارپن کرنے کے لئے یہاں حاضر ہوئے ہیں مگر آج اس منچ سے میں بڑے دکھ کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اس آسن سے یہ میرا آخری پروچن ہوگا اور اس کے بعد میں کبھی کسی کی مرتیو پر شردھانجلی کے لئے جمع ہوئے افراد کے سامنے اس آسن پر بیٹھ کر شردھانجلی ارپت کرنے اور "گروڑ پران" کی کتھا سنانے کی غرض سے نہیں آؤں گا۔ کیونکہ میں جب بھی اس اسٹیج پر پیچھے اس آسن پر بیٹھتا تھا اور کسی شخص کی موت پر اس کے بارے میں ویاکھیان دیتا تھا تو میں اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر موت کی آغوش میں سو جانے والے شخص اور اس کے پریوار کے بارے میں جو کچھ بھی بتاتا تھا اس میں زیادہ تر جھوٹ ہوتا تھا کیونکہ اکثر لوگوں کے بارے میں تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو اس کے پریوار والے جو کچھ بھی لکھ کر دے دیتے تھے اُسے ہی بنیاد بنا کر میں ان کے بارے میں بولتا رہتا تھا اور مرحوم سے اُن کے پیار بھری باتیں اور اُن کی سیوا بھاؤ کے فرضی قصے بیان کرتا رہتا تھا جو زیادہ تر جھوٹ ہوتے تھے جنہیں میں سچ کہہ کر پیش کرتا تھا مگر وہ پورا سچ نہیں ہوتا تھا بلکہ آدھا سچ ہوتا تھا۔

"میں ہی نہیں اس دنیا کے سبھی افراد "آدھا سچ" ہی بولتے رہے ہیں اور بولتے رہیں گے۔ انسان نے پورا سچ کبھی نہیں بولا۔ وہ اتنا ہی سچ بولتا ہے جو اس کے مفادات کے مطابق ہو اور جو حقیقت میں سچ نہیں بلکہ "آدھا سچ" ہوتا ہے۔ والدین، بزرگ، پیر، فقیر، مہاتما بھی سچ کے نام پر آدھا سچ بولتے ہیں۔ جب دو فریقین میں کسی بات پر تنازع ہوتا ہے تو دونوں اپنا اپنا پکش ---- اپنا اپنا موقف سچ کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ تو ان میں سے کون سچ بول رہا ہے؟ ان میں سے کون سچا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ دونوں اپنے اپنے پکش کو سچ کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ میں بھی قومیں اپنا پکش پیش کرنے کے لئے جو سچ بولتی ہیں وہ آدھا سچ ہوتا ہے۔

لیکن آج میں جس شخص کی موت کے موقع پر بولنے لگا ہوں اُسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا اس لئے میں کوشش کروں گا کہ جہاں تک اُس کے بارے میں مجھے علم ہے سچ کہوں اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جب میں سچ کہوں گا تو سبھی لوگ مجھ سے ناراض اور خفا ہو جائیں گے کیونکہ سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے لہٰذا آئندہ کبھی مجھے کسی کے سانحہ ارتحال کی آخری رسوم کے موقع پر ویاکھیان کرنے کے لئے نہیں بلائیں گے اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد مجھے کوئی اس سلسلے میں مدعو کرنے کی جرأت کرے۔ کیونکہ مجھے اس طرح کے جھوٹ بولتے بولتے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی ہے اور اب ۷۰ سال کی عمر میں جب میں خود بھی موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں، چاہتا ہوں کہ جھوٹ کو ترک کر کے جہاں تک ہو سکے سچائی کی راہ اپناؤں اور اپنی عاقبت سنواروں۔ اس لئے میں اپنی جانکاری کے مطابق جہاں تک ہو سکے گا سچائی بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

بجنول۔ جو ہم مرنے والے کی مکتی یا موکش کے لئے "گروڑ پران" کی کتھا سناتے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس میں بیان کردہ باتیں سچ ہیں؟ میں نے تو دیکھا ہے کہ جب اس کا پاٹھ کیا جاتا ہے تو بعض لوگ اسے سن کر چونکتے ہیں کہ کیا یہ تو فاسد باتیں بیان کی جا رہی ہیں۔ سچ مانیے زیادہ تر پنڈتوں کو بھی اس پر وشواس نہیں لیکن ان کی تو اس سے روزی روٹی وابستہ ہے اور وہ مرحوم کے گھر یا مندر جا کر اس کی مکتی کے لئے اس کا پاٹھ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس میں درج بعض باتیں حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ تاہم ہم لوگ روایات کے مطابق مرنے والے کے موکش کے لئے اس کا پاٹھ کرواتے ہیں اور اپنی تسلی کرتے ہیں۔ مگر یہ "گروڑ پران" کوئی مصدقہ کتاب نہیں۔ بازار میں جتنے "گروڑ پران" کے نسخے ملتے ہیں ہر ایک میں پنڈتوں نے اپنی مرضی سے حذف و اضافہ کیا ہوا ہے۔ بہر حال اس کتاب کے پاٹھ کا اصل مقصد انسان کو اس موت سے جو برحق ہے آگاہ کر کے نیک اعمال کا راستہ اپنانے اور دان پُن کرنے کی تلقین کرنا ہے۔

سورگیہ جگل کشور جی کو اس طرح کے آڈمبروں سے بڑی چڑ تھی۔ وہ ایک سناتن دھرمی پریوار میں پیدا ہوئے مگر وہ عام سناتن دھرمیوں کی طرح قدامت پسند نہیں تھے بلکہ وہ ایک ترقی پسند اور انسان دوست آدمی تھے۔ اُن کا دھرم مانو دھرم تھا۔ وہ ساری دنیا کو ایک برادری کی شکل میں دیکھتے تھے اور ساری دنیا میں امن اور شانتی کا قیام اُن کا خواب بھی تھا اور آرزو بھی۔ اور انہیں انسان سے اتنا پیار تھا کہ وہ زندگی میں ہی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی اپنا جسد خاکی ضرورتمندوں کے تئیں وقف کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی وفات کے بعد کسی طرح کی مذہبی رسومات نہ کی جائیں بلکہ اُن کے جسد خاکی کو طبی مقاصد اور ضرورت مند مریضوں کے لئے کسی ہسپتال یا طبی ادارے کو دان کر دیا جائے تا کہ وہ جسم کے کچھ حصوں جیسے آنکھوں، گردوں، دل اور چمڑی وغیرہ کو ضرورت مند مریضوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے استعمال کر سکیں یا اپنی طبی تحقیق کے لئے رکھ لیں اور جسم کا باقی بچا کھچا حصہ جو کسی کام کا نہ ہو اسے جس طرح بھی چاہیں ٹھکانے لگا دیں۔ چاہے نذرِ آتش کریں ---- سپرد آب کریں

یا---زمین میں دبنا ئیں۔

میں جب بھی یہاں کسی کی وفات کی آخری رسوم میں پروہتوں کے لئے بلایا گیا ہوں۔ میں نے مرنے والے کی تعریف ہی کی ہے چاہے وہ ٹھیک اور بدقماش رہا ہو یا بے ایمان اور مکار۔ میں نے ہمیشہ کہا کہ وہ بڑے بھگوان پرش تھے اور اُن کی موت سے اُس کے تمام سمبندھیوں کو بڑا دکھ ہوا ہے حالانکہ سچائی یہی تھی کہ اُس کی موت سے اکثر لوگ خوش ہوئے تھے کہ خس کم جہاں پاک۔ اس لئے وہ میری باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستے تھے اور سرگوشیوں میں میرا مذاق بھی اُڑاتے تھے۔ یہی نہیں میں اُس کے لواحقین سے گہرے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی تعریف وتوصیف کرتا تھا کہ انہوں نے مرحوم کی بے حد سیوا کی تھی حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ ان میں سے زیادہ تر نے اُس کی رتی بھر سیوا نہیں کی تھی بلکہ اُس کی موت کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے اور بعض نے تو آخر میں تنگ آ کر اُسے خود ہی موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

بہرحال ہم جس شخص کی آخری رسوم میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں، اُسے بھی درحقیقت اس طرح کے پنڈتوں کے جھوٹے پرچنوں سے سخت چڑ تھی۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ اس طرح کی کوئی رسم بھی نہ ہونے دیتا مگر کیا کیا جائے؟ مرنے والا تو اب کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے اور وہ زندہ افراد کے بس میں ہے جو اسے اپنی مذہبی یا سماجی روایات کے مطابق ٹھکانے لگاتے ہیں کوئی جلاتا ہے کوئی دفناتا ہے اور کوئی پیر داب کرتا ہے۔

ورنہ جہاں تک جگل کشور جی کا تعلق ہے وہ موت کے بعد انجام دی جانے والی ایسی تمام رسموں کے خلاف تھے۔ اور اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ موت کے بعد ان کی لاش کو کسی طبی ادارے کے سپرد کردیا جائے اور اس کے باقیات کو بڑی سادگی سے دستور کے مطابق ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کی موت سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی کوئی کام رُکتا ہے۔ وقت کا کارواں اپنی مقررہ رفتار سے چلتا رہتا ہے اور دنیا کا کاروبار بھی۔ یہ جو بیٹے آخری رسوم کے لئے اپنے عزیز واقارب کو جمع کرکے آخری رسوم ادا کرتے ہیں یہ زیادہ تر دکھاوا ہے۔

یہ جو ہمارے سامنے اس علاقے کے مشہور بیوپاری لال کھتہ اور سریش کھتہ جی بیٹھے ہیں، ان کے والدین سے ہمیشہ ہی بڑے ناراض رہے تھے اور انہوں نے انہیں کبھی گھر میں کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور ان کی بدتمیزیوں کی وجہ سے اپنے کمرے میں گھسنے تک کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مگر جوں ہی اُن کی وفات ہوئی تو اِل بخشی جی نے آتے ہی ماں سے کمرے کی چابی لی اور اندر جا کر ساری نقدی نکال لی۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے مردہ والد کی کلائی سے فوراً گھڑی بھی اُتار لی۔ اور پھر موت کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے تمام جائیداد کا بٹوارہ کرلیا اور باپ کا مال عیش وعشرت میں اُڑانے لگے۔ یہی نہیں جب کچھ دنوں بعد ان کی ماتا جی بیمار ہوگئیں تو انہوں نے ان کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں کی۔ آخر مجبور ہوکر اُن کی بیٹی سنتوش انہیں اپنے گھر لے گئی اور جب وہ آخری دم پر تھیں اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی تو اُس نے انہیں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہسپتال میں داخل کروایا۔ جب ان بھائیوں کو معلوم ہوا کہ ماں کا آخری وقت آگیا ہے تو وہ سماج کے طعنوں سے بچنے کے لئے اسے بہن کی مرضی کے خلاف زبردستی ہسپتال سے لے آئے اور یہاں اپنے گھر کے پاس ایک نرسنگ ہوم میں داخل کروایا جہاں اُسی رات اُس کا انتقال ہوگیا۔ مگر وہ سب سے کہتے پھرتے تھے کہ ہماری بہن نے تو ہمارے ماتا جی کو سرکاری ہسپتال میں داخل کروایا تھا مگر ہم نے انہیں نرسنگ ہوم میں رکھا مگر افسوس اُن کا انت آگیا تھا اور وہ سورگ سدھار گئیں۔ حالانکہ یہ ساری کہانی سبھی جانتے تھے کہ انہوں نے اُن کی کتنی سیوا کی ہے مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان کی آخری رسوم کے وقت میں نے بھی سچ بولنے کے بجائے یہی کہا تھا کہ ان بھائیوں نے ماتا جی کی بڑی سیوا کی تھی جو بالکل جھوٹ تھا---صاف جھوٹ۔ انہوں نے تو اپنی ماتا جی کی وہ بے قدری کی تھی اور انہیں اتنا تنگ کیا تھا کہ وہ انہیں بددعائیں دیتی تھیں اور اُن کے مرنے کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان بچوں نے اپنی ماں کو کتنا تنگ کیا ہوگا کہ اُن کی بیٹی انہیں اپنے گھر لے گئی۔ ورنہ ہندو دھرم میں اعتقاد رکھنے والے بیٹی کے گھر رہنا اور کھانا پینا معیوب سمجھتے ہیں اور بیٹے کے گھر وفات پانا اور اُس کے ہاتھوں کریا کرم ہونا اپنے لئے "موکش" اور "سورگ کی سیڑھی" مانتے ہیں۔

اور یہ سامنے جو موٹی توند والے سندر داس اگروال بیٹھے ہیں جو ہمارے علاقے کے ایک مشہور سیاسی نیتا بھی ہیں۔ انہوں نے تو اپنے پتا جی کو جیتے جی ہی مار ڈالا تھا حالانکہ ان کے جوان ہونے پر ان کے پتا جی نے انہیں بڑے چاؤ سے اپنی فرم کا کام سونپ دیا تھا کہ وہ ان کے کاروبار کو بڑھا کر ان کا نام روشن کریں مگر انہوں نے اپنی چاپلوسی اور فریب سے والد سے دستخط کرا کے جیتے جی اُن کی ساری جائیداد اور بزنس پر قبضہ کرلیا اور خود ہی کرتا دھرتا بن بیٹھے مگر شاید اس پر بھی ان کی تسلی نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنے ماتا جی اور پتا جی کو ان کے بڑے بیڈروم سے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں منتقل کردیا اور اُن سے نوکروں سے بدتر سلوک کرتے رہے مگر جب اُن کی موت ہوئی تو بہت شاندار جنازہ نکالا گیا۔ اور کریا والے دن میں نے ہی نہیں کئی جاننے ملنے والے سماجی نیتاؤں نے بھی اُن کی تعریف کی تھی کہ انہوں نے اپنے والدین کی بے انتہا سیوا کی تھی حالانکہ سیوا تو کجا انہوں نے انہیں ڈھنگ سے پانی تک نہیں پلایا تھا اور وہ دونوں تنگ و تاریک کوٹھری میں ان کے رحم وکرم پر لیٹے رہتے تھے اور جو کچھ بھی کھانے کو دیتے تھے جی کڑا کرکے کھا لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ایک دن میں انہیں ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تھا "پنڈت جی ایسی اولاد سے تو

اولاد ہونا اچھی بات ہے"

یہ سامنے جو بناؤ سنگھار کئے عورت بیٹھی ہے نرملا بھارگو اس نے اپنے سسر کے مرنے کے بعد اپنی ساس کو کتنا تنگ کیا تھا۔ ذرا اس کے محلے اور پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھئے۔ ایک بار تو اس نے اپنی ساس کو گرم چمٹے سے بُری طرح زخمی کر دیا تھا اور وہ کئی مہینے تک ان زخموں سے تڑپتی رہی تھی۔ اور ایک بار غصے میں اس نے اپنے دانتوں سے اپنی ساس کی انگلی ہی کاٹ لی تھی اور جب تک مکان کی رجسٹری اس کے خاوند کے نام نہیں ہو گئی، اس نے چین کا سانس نہیں لیا۔ اب ساس کس حال میں ہے ذرا اس سے ہی پوچھیے۔

مگر ایسا نہیں ہے کہ آج بھی بچے ایسے ہی ہیں جو ماں باپ کی مناسب سیوا نہیں کرتے ہیں اور اُن کے آخری دن بڑی کسمپرسی میں کٹتے ہیں البتہ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے بزرگ ماں باپ کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ والدین کی سیوا کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ بہت کم شروَن کمار کی طرح فرماں بردار بیٹے اپنے ماں باپ کی دل و جان سے سیوا کرتے ہیں۔ یہ سیاش شرما جی ہمارے سامنے بیٹھے ہیں جن کا دوائیوں کا بزنس ہے۔ جب یہ کمسن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں ماتا جی نے محنت مزدوری کر کے پالا تھا۔ مگر بڑے ہو کر انہوں نے بھی اپنے ماتا جی کی جی جان سے سیوا کی تھی اور اُن کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا دھرم جانا تھا۔ آخری دنوں میں اُن کی یادداشت چلی گئی تھی اور وہ بول و براز بھی بستر پر کر دیتی تھیں مگر انہوں نے اور ان کی بیوی سوشیلا نے ان کے بول و براز کو صاف کرتے ہوئے کبھی ناک بھوں نہیں چڑھایا تھا اور تن من سے اُن کی سیوا میں لگے رہتے تھے۔ شاید اُن کی دعاؤں کا ہی پھل ہے کہ آج یہ لاکھوں کے مالک ہیں اور ان کے کئی مکان ہیں۔

اس میں شک نہیں بوڑھے ماں اور بزرگ ہمیشہ ہی نوجوان سماج کے لئے ایک بوجھ یک تکلیف دہ مخلوق رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کو اپنے نحیف و نزار بیمار اور چلنے پھرنے سے لاچار اور معذور بزرگوں سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُن دنوں نہ تو کوئی حکیم وید تھا نہ کوئی ڈاکٹر تو وہ اُن معذور اور بیمار ماں باپ یا دادی دادا کو جنگلوں میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے جہاں وہ شیر بھیڑیے اور دیگر درندوں کی خوراک بن جاتے تھے۔ مگر جوں جوں سماج ترقی یافتہ ہوتا گیا بزرگوں سے نجات پانے کے بہتر طریقے سوچے گئے۔ شاید منو نے اسی لئے بوڑھے ہونا کارہ افراد سے باعزت طریقے سے نجات پانے کے لئے انسان کے لئے آخری ٹھکانے "سنیاس آشرم" کی بنیاد رکھی تھی تا کہ انسان کو بڑھاپے میں ایک "پناہ گاہ" نصیب ہو جائے۔ اور آج کے جدید دور میں یہ آشرم ترقی کرتے کرتے اولڈ ایج ہوم کی شکل اختیار کر گئے ہیں جہاں نوجوان اولاد اپنے بیمار، لاچار اور ناکارہ بوڑھوں سے نجات پانے کے لئے انہیں اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے یا وہ بے یار و مددگار اور معذور ہونے کی صورت میں خود وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

بجا ہیں تو بوڑھوں کی زندگی شروع ہی سے خراب رہی تھی مگر موجودہ دور میں سائنس کی ترقی اور جدید دور کی بود و باش اور روحانی خیالات کے فقدان اور مادیات کی جانب انسانی توجہ نے ان کی حالت بد سے بدتر بنا دی ہے۔ آج مشترکہ کنبہ کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے جو بوڑھے لوگوں کو تحفظ بخشتا تھا۔ آج بوڑھوں کو اپنے بچوں سے الگ تھلگ تنہائی اور اکیلے پن کی اذیت برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ ماں باپ اور اولاد کا رشتہ دھیرے دھیرے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے۔ جائیداد اور روپے پیسے کے لالچ میں رشتوں کا احترام بھلا کر اُن کا خون کیا جا رہا ہے۔ کہیں بیٹے کے ہاتھوں ماں باپ کا قتل سننے میں آتا ہے تو کہیں بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے ٹی وی پر ایک خبر سنی اور دیکھی تھی کہ راجستھان میں ایک بوڑھے کی موت ہو جانے پر اُس کے تین بیٹوں نے اپنی ماں سے چھٹکارا پانے کے لئے "ستی" کے نام پر اُسے زبردستی جلتی چتا میں پھینک دیا تھا۔ کیا وہ ستی ہوئی تھی یا اُس کے بیٹوں نے اپنی بوڑھی ماں کی سیوا کرنے کے بجائے اُسے زندہ جلا کر اُس سے نجات---- بھی حاصل کی تھی؟۔ بوڑھوں کا آخر کیا ہوگا۔ امیر تو کسی آرام دہ اور پُرسکون اولڈ ایج ہوم میں شفٹ ہونے لگیں گے۔ مگر غریب بوڑھے ماں باپ کا کیا ہوگا؟ کیا ان سے اُن کی اولاد اپنی جان بچا کر انہیں کسمپرسی کی حالت میں مرنے پر مجبور کر دے گی؟ آخر ان بوڑھوں کا کیا ہوگا؟ کیا آج کے نوجوان کل بوڑھے نہیں ہوں گے؟ اور اگر کل اُن کے بچے اُن کے ساتھ ایسا سلوک کریں تو وہ کیسا محسوس کریں گے؟

ابھی کل ہی ابھی آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ایک ستر اسی سال کی بوڑھی عورت کو جو بیماری کی وجہ سے اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی، اُس کے گھر والوں نے کہیں دور دراز سے لا کر اُسے دلی میں بے خانماں برباد چھوڑ دیا تھا۔ شاید یہ سوچ کر کہ وہ اپنا اتا پتا نہ بتا سکے گی اور وہ اس سے چھٹکارا پا لیں گے۔ کیا ہم ابھی بھی اُسی ہزاروں سال پرانی جنگلی تہذیب میں رہ رہے ہیں جب بوڑھے ماں باپ اور دادا دادی کو بڑھاپے اور بیمار اور لاچار ہو جانے پر اُن سے نجات پانے کے لئے جنگلوں میں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

سوگیہ جگل کشور جی کو میں نے کبھی مندر آتے جاتے یا پوجا پاٹھ کرتے نہیں دیکھا مگر وہ غریبوں اور مفلسوں کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ وہ کوئی پچاس پچپن برس پہلے پنجاب کے کسی گاؤں سے روزی روٹی کی تلاش میں دلی آئے تھے۔ اور یہاں آ کر انہیں زندگی کے کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ انہیں طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے کئی جگہوں پر چھوٹے موٹے کام کئے اور آخر کار ایک انجینئر پارٹی کی فرم میں ملازمت اختیار کر لی اور کئی برس

تک جنوبی ہندوستان کے شہروں میں اُن کے نمائندے کی حیثیت سے جاکر اُن کے لئے لاکھوں کے آرڈر لاتے رہے۔ پھر کچھ مدت بعد انہوں نے اُس فرم سے علیحدگی اختیار کرکے خود اپنی آٹو سپیئر پارٹس بنانے کی فیکٹری قائم کرلی اور اس بزنس میں لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کمائے اور بڑا نام کمایا۔

مگر یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ ان کے دو دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوتے ہوئے بھی انہیں آخری زندگی میں کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا حالانکہ انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت کے لئے اچھے اسکولوں اور کالجوں میں بھیجا تھا اور اعلےٰ تعلیم دلوانے کے بعد انہیں اپنے کام کاج میں شریک کر لیا مگر آہستہ آہستہ بچوں نے بزنس پر اپنا قبضہ جمانا شروع کردیا اور ایک دن انہیں بالکل ہی بے دخل کرکے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔ اب وہ اور اُن کی شریک حیات گھر کے ایک کونے میں پڑے رہتے کوئی اُن کو پوچھنے والا نہیں تھا۔ شادی شدہ بیٹی تھی وہ کبھی کبھار تہوار کے دن یا تہوار کے دن پر اُن کا حال چال پوچھ لیتی یا کبھی اپنے شوہر کے ساتھ آ کر اُن کی مزاج پُرسی کر جاتی مگر بیٹوں کو بزنس سے فرصت نہ تھی اور بہوئیں کٹی پارٹیوں اور شاپنگ میں دن بھر مصروف رہتیں۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دن اُن کی بیوی کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ سورگ سدھار گئیں اور اب وہ بالکل ہی تنہا رہ گئے۔ کوئی اُن کا پُرسان حال نہ تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کے ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں پڑے رہتے۔ اور انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ اس تکلیف دہ زندگی سے کیسے نجات پائیں۔ تبھی ایک دن اُن کے ایک بچپن کے دوست روشن لال گپتا آگئے جن کی نجف گڑھ علاقے میں ایک فیکٹری اور بہت بڑی کوٹھی تھی اور وہاں کے ایک جانے مانے بزنس مین اور بہت ہی سمجھدار اور ذہین انسان آدمی تھے۔ اُن سے اُن کی یہ قابلِ رحم حالت دیکھی نہ گئی اور انہوں نے انہیں رائے دی کہ وہ اپنے بچوں کا موہ چھوڑ دیں اور انہیں خیر باد کہہ کر آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے لئے کوئی قدم اُٹھائیں۔ اس پر جگل کشور جی نے کہا۔ "مگر میں کیا کروں۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ ایسے میں میں آسائش و آرام کی زندگی بھلا کیسے گزار سکتا ہوں؟"

گپتا جی کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ اس کا علاج میرے پاس ہے۔ اگر عمل کرو تو تمہارے سب دکھ دور ہوجائیں۔ اور تمہاری بقیہ زندگی سکھ چین سے بھی گزر سکے گی۔"

"وہ کیسے؟" جگل کشور جی نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ ایسے کہ اگر کبھی تمہارے بچے والے ایک آدھ ہفتے کے لئے باہر جائیں تو اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر اس مکان کو جو کم از کم دو کروڑ کا ہے فروخت کرکے کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں وہ لوگ تمہیں تلاش بھی نہ کر پائیں۔"

جگل کشور جی کا ضمیر اُٹھے۔ انہیں گپتا جی کی یہ اسکیم پسند نہیں آئی تھی۔ بھلا بچوں کے ساتھ فریب۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایسا کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس اسکیم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر گپتا جی نے سمجھایا۔

"دیکھو جگل کشور! تمہارے بچوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ تم نے بچوں پر اعتماد کرکے اُن کے نام اپنا کروڑوں کا بزنس کردیا اور انہوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تمہیں آفس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا اور تم کچھ بھی نہ کرسکے۔ اگر یہ مکان بھی اُن کے نام ہوتا تو شاید تمہیں سڑکوں پر بھکاریوں کی طرح زندگی گزارنی پڑتی۔ جب بچوں نے تمہارے ساتھ دغابازی اور فریب کیا ہے تو تم انہیں سبق سکھانے سے کیوں گھبراتے ہو۔ انہیں بھی ایک دھچکا تو لگے کہ ماں باپ سے زیادتی کرنے والے بچوں کو نصیحت حاصل ہو۔"

گپتا جی کے سمجھانے بجھانے پر جگل کشور جی اس اسکیم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں کلکتہ میں اُن کے کسی قریبی رشتہ دار کی بیٹی کی شادی تھی اور وہ سبھی ایک ہفتے کے لئے وہاں چلے گئے۔ اُن کی غیر موجودگی میں گپتا جی نے اُس مکان کا پونے دو کروڑ میں سودا کرادیا اور جگل کشور جی روپیہ لے کر گپتا جی کے کہنے کے مطابق کسی اور جگہ چلے گئے۔ جب ایک ہفتے بعد دونوں بیٹے لوٹے تو گیٹ اندر سے بند تھا اور اُن کے پاپا جی کے کمرے کی چٹخنی لگی تھی۔ انہوں نے جب بہت آوازیں دیں۔ تو ایک آدمی نے بالکونی سے جھانک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"جی ہمارے پاپا جی کہاں ہیں؟"

"کون پاپا جی؟"

"جی جگل کشور جی۔"

"دیکھئے انہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنا مکان بیچ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔"

"مکان بیچ کر چلے گئے ہیں؟" بیٹوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی۔

"جی ہاں! اور آپ لوگوں کا سامان نیچے گیرج اور دو کمروں میں منتقل پڑا ہے۔ صبح آ کر لے جائیےگا۔"

اور اس کے بعد وہ بچے کئی دن تک اپنے والد کو ڈھونڈتے رہے مگر اُن کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ بعد میں پتہ چلا کر انہوں نے ایک چھوٹا سا ڈیڑھ سو گز کا بنا بنایا مکان خرید لیا ہے اور کچھ روپیہ انہوں نے اپنی بیٹی کو دے دیا ہے کیونکہ اُسے اُن کی جائیداد سے کچھ نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد بچے اُن سے معافی مانگتے رہے اور انہیں واپس گھر چلنے کے لئے اصرار کرتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے بچوں سے کہا بیٹا تم اپنی زندگی جیو اور میں اپنی۔ ہاں میں نے وصیت کردی ہے تاکہ بعد از اس

کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو کیونکہ سارا جھگڑا زمین جائداد اور روپے پیسے کا ہی ہے۔

آخری عمر میں اُن کو کئی بیماریوں نے گھیر لیا۔ جب اُن کی حالت بہت خراب ہو گئی تو اُن کی وصیت کے مطابق اُن کے دوست گپتا جی نے انہیں "سورگ آشرم" نامی اولڈ ایج ہوم میں داخل کروا دیا جہاں گیارہ دن پہلے اُن کی مرتیو ہو گئی تھی اور آج اُن کے بیٹوں نے اُن کی آخری رسم کیا کرم کے لئے آپ سجنوں کو اکٹھا کیا ہے حالانکہ جگل کشور جی نے اپنی آخری وصیت میں لکھا تھا کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے کسی رشتہ دار کو نہ بلایا جائے اور اُن کے بیٹوں کے بجائے آشرم والے ہی اُن کی آخری رسوم ادا کریں۔ مگر بیٹوں کی بھی تو ناک کٹتی تھی اور انہیں سماج میں اپنی شان قائم رکھنی ہے لہٰذا وہ اُن کا سنسکار کرنے کے لئے فوراً پہنچ گئے اور ساری رسومات اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے علاوہ انہوں نے مندروں اور پنڈتوں کو ہزاروں روپے دان بھی دیا ہے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جن ماں باپ کو لوگ ٹھیک ڈھنگ سے کھلا نہیں کھلا سکتے۔ اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ ان کی موت پر وہ پنڈتوں کے بھوج پر ہزاروں روپے صرف کر ڈالتے ہیں اور مندروں، اور دیگر سماجی اداروں کو ہزاروں روپے دان دیتے ہیں۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کیا صرف سماج میں اپنی عزت اور شان کی خاطر۔ لیکن جگل کشور جی کا کہنا تھا کہ اولڈ ایج ہوم بوڑھوں کے مصائب کا حل نہیں۔ اور کوئی قانون بھی اس مسئلے کو پوری طرح سے حل نہیں کر سکتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ لوگ اپنے بزرگ ماں باپ کو اپنے پاس رکھنا اور اُن کی سیوا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کل انہیں بھی بوڑھا ہونا ہے۔ انہیں بھی اسی صورت حال سے واسطہ پڑنا ہے اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی سیوا نہیں کریں گے، انہیں اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ سکھ اور آرام کی زندگی گزارنے سے محروم کر کے انہیں ذہنی تنہائی کے اندھیرے غاروں میں دھکیل دیں گے تو کل اُن کے بچے بھی جو دیکھیں گے وہی کریں گے۔ وہ بھی کل ان سے ایسا ہی سلوک کریں گے اس لئے وہ بوڑھے ماں باپ کی سیوا کریں اور اُن کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔

سجنو! شاید آپ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے۔۔۔کوس رہے ہوں گے اور میری باتوں سے ناخوش ہو رہے ہوں گے، اس لئے اس رسم پگڑی کے موقع پر اپنے پروچن ختم کرنے سے پہلے میں آپ لوگوں کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں جو شاید آپ کو حیرت میں ڈال دے کہ جگل کشور جی نے اپنے بچوں کے سلوک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی وصیت میں اپنا مکان اور کوئی ایک کروڑ روپے جو انہوں نے مکان بیچنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی کے لئے محفوظ رکھے تھے، ان بچوں کے بجائے اپنی آخری پناہ گاہ "سورگ آشرم" کو دان دے دئے ہیں تاکہ آشرم والے مزید کمرے بنوا سکیں اور آخری عمر میں بے آسرا بوڑھوں کو اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لئے ایک محفوظ اور آرام دہ پناہ گاہ فراہم کر سکیں۔

کاوش پرتاب گڑھی
دہلی، بھارت

آنکھ میں دھند تھی جوانی میں
کیا نظر آتا عکس پانی میں

کتنے روشن لطیف ہیں الفاظ
کیفیت کیوں نہیں معانی میں

خاص کردار سو گیا شاید
ہے کہاں لطف اب کہانی میں

زلزلہ شہر میں نہ کیوں آتا
کوئی تصویر تھی روانی میں

حوصلہ افزا اپنی کچھ یادیں
دے گیا وہ ہمیں نشانی میں

کیا بتاؤں عجب نظارہ تھا
جب گرا چاند چھپ سے پانی میں

رائیگاں کب گیا لہو میرا
نفع دیکھا ہے رائیگانی میں

مصرعہ اولیٰ ہے آساں روشن
اور قیامت کا شور ثانی میں

چاند سے ہم لپٹ کے سوئیں گے
عمر گذری ہے خوش گمانی میں

آسماں کو بھی کچھ نہیں سمجھا
یہ زمیں کیا تھی نوجوانی میں

کوئی کچھ بھی کہے کہے کاوش
باطنی سکھ ہے حق بیانی میں

اُردو ناولوں پر مبنی فلمیں

نند کشور وکرم

جب سے سنیما کا ظہور ہوا ہے اُردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کا اس میں بول بالا رہا ہے اور شاید ہی کوئی اہم ادیب ہوگا جو اس سے وابستہ نہ رہا ہو۔ پریم چند سے لے کر گلشن نندہ تک کے ناولوں کو پردۂ اسکرین پر پیش کیا جا چکا ہے۔ پریم چند تو اس ذریعہ ابلاغ سے بہت ہی زیادہ متاثر تھے اور اسے عوام تک رسائی کا ایک کارگر وسیلہ سمجھتے تھے اور اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا" کہ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں اسی فی صد عوام ناخواندہ ہیں، ناولوں اور کہانیوں کو فلما کر گاؤں گاؤں دکھایا جانا چاہیے" اس لئے جب انہیں بمبئی کی فلم کمپنی اجنتا سینے ٹون کی جانب سے فلمی کہانیاں لکھنے کے لئے بمبئی مدعو کیا گیا تو وہ اپنی رفیقۂ حیات شورانی کی مخالفت کے باوجود بمبئی چلے گئے لیکن جب ان کی فلم "مزدور" ریلیز ہوئی تو انہیں اتنی مایوسی ہوئی کہ وہ فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر واپس بنارس آ گئے۔ تاہم اُن کی کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بننے کا سلسلہ اُن کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی جاری رہا۔

۱۹۳۸ میں مہالکشمی سینے ٹون نے اُن کے مشہور ناول "بازارِ حسن" کو "سیوا سدن" کے نام سے پیش کیا جس کے حقوق مذکورہ کمپنی ڈیڑھ دو ہزار روپے معاوضہ میں کچھ عرصہ پیشتر ہی اُن سے خرید چکی تھی۔ نانو بھائی وکیل کی ہدایت میں بننے والی اس فلم میں مشہور گائیکہ سبالکشمی کے علاوہ جدن بائی، زبیدہ، فاطمہ اور شاہو مودک نے بھی اداکاری کی تھی مگر طوائف کی زندگی اور اس کے سماجی مسائل سے متعلق اس کہانی کو اس طرح سے فلمایا گیا کہ یہ ایک فارمولا فلم بن کر رہ گئی اور پریم چند کا آدرش واد اور سماج کی بہتری و اصلاح کا مقصد فوت ہو کر رہ گیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۶ میں موہن بھائی کی ہدایت میں "چوگانِ ہستی" کو "رنگ بھومی" کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس میں اہم کردار جگدیش سیٹھی، کے این سنگھ، نوین یاگنک، لیلا مصرا، سلوچنا، امیر بانو اور کیپ نے ادا کئے تھے اور اس کی خوبی یہ تھی کہ کیریکٹر ایکٹر جگدیش سیٹھی نے اس میں اندھے سورداس کا رول بہت متاثر کن انداز میں انجام دیا تھا اور ناظرین کو بے حد متاثر کیا لیکن لگ بھگ ایک ہزار صفحے کے اس ناول کو تین گھنٹے میں پیش کرنا انتہائی دشوار کام تھا دوسرے اپنے تھیٹریکل انداز کی وجہ سے بھی یہ فلم عوام کو متاثر نہ کر سکی اور پردۂ اسکرین پر بری طرح فیل ہو گئی۔

پھر ۱۹۶۶ میں کرشن چوپڑہ نے جو پریم چند کی کہانی "دو بیلوں کی جوڑی" کو "ہیرا موتی" کے نام سے بنا کر شہرت اور انعام و اکرام حاصل کر چکے تھے، اُن کے ناول "غبن" پر ایک اعلیٰ درجے کی فلم بنانے کی شروعات کی مگر افسوس کہ فلم کے مکمل ہونے سے پیشتر ہی وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور باقی فلم رشی کیش مکرجی نے اپنی صلاحیت سے تاثراتی اور حقیقی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس فلم میں سنیل دت، کنہیا لال، زیب رحمان، آغا، انور حسین اور بدری پرساد نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے اور اس کے موسیقار شنکر۔ جے کشن تھے۔ اس فلم سے پیشتر ۱۹۶۳ میں ہدایت کار ترلوک جیٹلی نے پریم چند کے مشہور ناول "گئودان" کو بھی پردۂ اسکرین پر پیش کیا مگر اس کے کرداروں اور واقعات کے انداز پیشکش نے پریم چند کے معروف و مقبول ناول کو بے جان اور غیر تاثراتی بنا دیا اور ہوری اور دھنیا کے کردار کے علاوہ کسی کردار نے متاثر نہیں کیا۔ ہوری کے رول میں راج کمار نے اور دھنیا کے رول میں کامنی کوشل نے عوام کو اچھا متاثر کیا۔ اس کے علاوہ موسیقار پنڈت روی شنکر نے بھی فلم کے گیتوں کے ذریعے لوک سنگیت کو بڑے عمدہ اور دلکش انداز میں پیش کیا۔

پریم چند تو فلمی دنیا سے دل برداشتہ ہو کر واپس آ گئے تھے لیکن اُن کے ہمعصر اور ہندی اور اردو کے ممتاز افسانہ نگار مہاشے سدرشن فلم نگری ہی میں جا کر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے متعدد فلموں کی کہانیاں اور گیت لکھے اور اس میدان میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل کی اور اُن کے کئی گیت جیسے "تیری گٹھری میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا"، "اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی"، "من کی آنکھیں کھول مسافر"، "پنچھی اُڑ چل اپنے دیس" اور سکندر کا مشہور کورس "زندگی ہے پیار سے پیار میں بتائے جا"، اُن کے زورِ قلم کا ہی نتیجہ تھے جو دنوں ملک بھر میں گونجتے رہے۔ علاوہ ازیں "سکندر" اور "بھاگیہ چکر" کے لیے لکھے گئے اُن کے مکالمے تو برسوں عوام کی زبان پر رہے۔ اُن کے ناولٹ "پتھروں کے سوداگر" پر ۱۹۴۴ میں سہراب مودی نے اسی نام سے فلم بنائی تھی جو بھی کامیاب رہی لیکن فلموں کی یہ کامیابی ادب میں اُن کے تنزل کا باعث بنی اور اہلِ ادب انہیں بھول سے گئے۔ حالانکہ ایک زمانہ تھا جب کہ بنگلہ میں رابندر ناتھ ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی کا مقابلہ کیا جاتا تھا اسی طرح اردو اور ہندی میں پریم چند اور سدرشن کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔

مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" جو اردو کا اولین ناول قرار دیا جاتا ہے اس کو بھی دو بار پردۂ اسکرین پر پیش کیا جا چکا ہے پہلی بار اسے ۱۹۵۸ میں مشہور ہدایت کار ایس ایم یوسف نے جو بعد ازاں پاکستان

چلے گئے، بھنڈی کے نام سے فلمایا تھا اور اس میں امراؤ جان کا کردار وی شانتارام کی اداکارہ بیوی سندھیا نے ادا کیا تھا لیکن وہ اس کردار میں وہ جاذبیت اور تاثر پیدا نہ کر سکی جو ہدایت کار سید مظفر علی کی فلم امراؤ جان میں اداکارہ ریکھا نے پیدا کیا۔ آخر الذکر فلم ۱۹۸۱ء میں بنی تھی اور اس میں ریکھا کے علاوہ اہم کردار فاروق شیخ، نصیر الدین شاہ، راج ببر، پریما نارائن، شوکت کیفی اور دینا پاٹھک نے نبھائے تھے۔ اس میں خیام کی پیش کی گئی شاندار موسیقی کے کارن اس کے گانوں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی اس کے نغمے ہر خاص و عام کو مسحور کر دیتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں عصمت چغتائی کے ناول ضدی پر بھی اسی نام کی فلم بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے بنی جس کے ہدایت کار فن کے شوہر شاہد لطیف تھے۔ فلم میں دیو آنند، کامنی کاشل، وریا، نواب کاشمیری، پران اہم اداکار تھے اور اس کی موسیقی کھیم چندر پرکاش کی تھی۔ اس کے گیتوں اور موسیقی نے عوام پر گہری چھاپ چھوڑی تھی اور یہی وہ فلم تھی جس میں پہلی بار کشور کمار بطور پلے بیک سنگر پیش ہوئے تھے۔ بعد ازاں ۱۹۵۱ء میں عصمت چغتائی کی کہانی پر ہی ان کے شوہر شاہد لطیف نے فلم "شیشہ" بنائی تھی جس کی موسیقی غلام محمد نے دی تھی اور اس فلم میں اہم رول نرگس اور ساجن نے ادا کیا تھا۔ اسی طرح مشہور افسانہ نگار اور صحافی خواجہ احمد عباس نے جو کئی فلموں کی ہدایت انجام دے چکے ہیں اپنے طویل ناولٹ (طویل افسانے) پر فلم "چار دل چار راہیں" بنائی جس میں راج کپور اور مینا کماری کی اداکاری نے ناظرین کو بے حد متاثر کیا تھا۔ ان دو اداکاروں کے علاوہ اجیت، نمی، شمی کپور اور ڈیوڈ بھی اس میں اہم کردار تھے۔

راجندر سنگھ بیدی نے بھی بٹوارے کے بعد لاہور کو خیرباد کہنے کے بعد بمبئی میں سکونت اختیار کی اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے اور ان کی کئی کہانیوں جیسے گرم کوٹ اور بھاگن وغیرہ پر فلمیں بنائی گئیں۔ اس کے علاوہ ان کے ناول "ایک چادر میلی سی" جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا تھا سکھونت دھوڑا کی ہدایت میں اسی نام سے فلم بنی لیکن بدقسمتی سے یہ فلم ناکام ہو گئی لیکن اردو ناول نگاروں میں سب سے زیادہ فلمیں گلشن نندہ کے ناولوں پر بنی ہیں جن میں سے نیل کمل، کاجل، سہاگ رات، سگائی، کٹی پتنگ، کھلونا، پھولوں کی سیج وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور ان میں سے کئی فلمیں تو سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔

O

بچپن

پیدا ہوا تو ماں مری بِتا دوسری لائے
سوتیلی ماں رات کو تھپڑ مار سلائے

میں نے بھی دی بد دعا' ماں سے کہا کر مار
تو ترے اولاد کو' لگے نہ بیڑا پار

مندر کبھی مزار پر' بھوکی پیاسی سانجھ
ایک کھلونے کے لیے' در در بھٹکی بانجھ

میرا بچپن راہ میں ملے تو کہیں سلام
وہ بھی اگر اُداس ہو' لائیں بہیاں تھام

دیکھ لیا اس نے مجھے' یوں مد میں چور
روٹھ کے مجھ سے جا رہا' بچپن کوسوں دور

بچپن پراتہ کی کرن یوں چڑھتی دھوپ
عمر آخری شالی رنگ رہے نہ روپ

ویرانے میں بھی کبھی' آیا بچپن یاد
نگر ہزاروں ہو گئے آس پاس آباد

بھگوان داس اعجاز

دہلی بھارت

قلبِ صمیم

نعت رسولِ مقبولؐ

صدیق شاہد (شیخوپورہ)

کفار بھی مانے کہ وہؐ صادق ہے، امیں ہے
ایسا کوئی اوصاف کا پیکر بھی کہیں ہے!

ہوتی ہے شب و روز جہاں نور کی بارش
وہ مرکزِ انوار مدینے کی زمیں ہے!

سرچشمۂ لذت ہے تو ذکرِ شہِ والاؐ
سرمایۂ بخشش ہے، تو پوشیدہ یہیں ہے

باثروت و خوش وقت ہیں ہم سوختہ تن بھی
وہ مہرِ عربؐ ماہِ عجمؐ دل کا مکیں ہے!

اس ذرۂ ناچیز کی جانب بھی نظر کر
یہ بندۂ عاجز بھی ترا راہ نشیں ہے

کس شان کا راہی ہے کہ شاہدؔ شبِ معراج
بڑھ بڑھ کے قدم لیتی ستاروں کی جبیں ہے

O

نعت شریفؐ

اسلم راہی (اسلام آباد)

چل پڑا تو گریز پا نہ ہُوا
جو بھی اُس شہر کو روانہ ہُوا

اُس فضا میں برس پڑیں آنکھیں
ضبط کرنے کا حوصلہ نہ ہُوا

ہائے وہ بدنصیب گھر کہ جہاں
جشنِ میلادِ مصطفےٰؐ نہ ہُوا

جس کی نسبت مرے نبیؐ سے ہوئی
وہ کبھی منکرِ خدا نہ ہُوا

یاد میں اُنؐ کی ایک قطرۂ اشک
بخششوں کے لیے بہانہ ہُوا

دل تو تڑپا بہت جدائی میں
آنکھ روئی نہیں زمانہ ہُوا

بادشاہت ملی تو کیا راہیؔ
اُس گلی کا اگر گدا نہ ہُوا

O

نعت شریفؐ

سہیل غازی پوری(کراچی)

گُلرنگ ہیں صبحیں‘ تو ضیا بار ہیں شامیں
جینے کا مزہ آیا مدینے کی فضا میں

بکھرے تھے سمندر کی تہوں میں بھی اُجالے
انوار کی بارش تھی عجب غارِ حرا میں

عقبا بھی سنور جائے یہ دنیا بھی سنور جائے
ہم گوشۂ دامانِ محمدؐ کو جو تھامیں

نعتوں کے دیئے تم بھی جلاؤ نہ بجھیں گے
ہم نے بھی جلائے ہیں بہت تند ہوا میں

حد پار نہ کر جائے عقیدت کی کسی دن
رہوارِ رہِ نعت کی چھوڑیں نہ لگامیں

سرکارؐ نے کچھ پودے کھجوروں کے لگائے
اللہ نے کی اُن کی مدد نشوونما میں

اک جنسِ گراں مایہ ہے آپس کی محبت
آقاؐ نے کہا کچھ بھی نہیں جور وجفا میں

سرکارؐ دو عالم کی نگاہوں کا مرکز
وہ شخص جو رہتا ہے درودوں کی فضا میں

جس نے کہ عطا کی ہے خیالوں کی بلندی
پہنچائے گا مجھ کو بھی وہی عہدِ وفا میں

مل جائے پسینہ جو سہیلؔ اُنؐ کی جبیں کا
آنکھوں میں ملوں اس کو کبھی اپنی قبا میں

آلِ محمدؐ کا گھرانہ

کرامت بخاری(لاہور)

جس میں نازل ہوئیں قرآن کی آیات وہ گھر
یعنی آیات بنیں جس کی روایات وہ گھر

جس پہ جھکتی ہیں فرشتوں کی جبیں اکثر
جس میں ہوتی ہے محمدؐ سے ملاقات وہ گھر

جس سے تعلیم ہُوا دہر میں قرآنِ کریم
تھا جو وقف پہ آدابِ عبادات وہ گھر

آیت آئی کبھی فردوس کی نعمت اُتری
جس پہ ہوتی رہیں خالق کی عنایات وہ گھر

جس میں آقا نے غلاموں سے محبت کر کے
ساری دُنیا کو دیا درسِ مساوات وہ گھر

جس کو ہر دور کے فاسق نے مٹانا چاہا
پھر بھی موجود ہے جس کے نشانات وہ گھر

O

سُخنِ معرّیٰ

محسن احساں (پشاور)

آنکھ تشنہ بھی نہیں ہونٹ سوالی بھی نہیں
یہ صراحی کہ بھری بھی نہیں خالی بھی نہیں

ہم تہی درہم و دینار لئے پھرتے ہیں
شہرِ نادار میں اب کوئی سوالی بھی نہیں

ایسی مکروہ کہانی کی یہ تصویر ہے جو
سننے والی بھی نہیں دیکھنے والی بھی نہیں

کیوں گرانے کے لئے درپئے آزار ہیں لوگ
ہم نے بنیادِ مکاں کی ابھی ڈالی بھی نہیں

محسن احساں کا ہے اندازِ جنوں سب سے الگ
یہ جلالی بھی نہیں ہے یہ جمالی بھی نہیں

O

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

مرا جنوں مری جاں کا کفیل ہوتے ہوئے
کہیں نہ پا سکا مجھ کو سبیل ہوتے ہوئے

ترا کرم مجھے کیا کیا شمار کرتا ہے
میں کس قدر رہوں زیادہ قلیل ہوتے ہوئے

صفائے قلب سے ہے اک تعلقِ صورت
وہ حُسن و شکوہ رکھے کیوں ثقیل ہوتے ہوئے

پھر اُس کے گرد جمالِ جہاں نہ جمع ہو کیوں
جسے جلال نہ آئے جلیل ہوتے ہوئے

زمانہ کیسے رہا تشنہ لب تعجب ہے
ہمارے آنسوؤں کی سبیل ہوتے ہوئے

وہ اُس کو چاہتا تھا رکھنا قوس اندر قوس
جو غم تھا دائرے میں مستطیل ہوتے ہوئے

ہمارے پاس تری یاد کا تھا لُطفِ عمیم
ہم اپنے آپ سے گذرے دلیل ہوتے ہوئے

O

ملک زادہ منظور (لکھنؤ، بھارت)

صبح کی تیز دھوپ میں، اس کے سوا بہت ہوا
دل کی کلی نہ کھل سکی، زرخِ صبا بہت ہوا

پہنچی زراہِ ہوس کی پھر، سوچ کے میں نے آخرش
مقتلِ راہِ شوق میں، کر کے وفا بہت ہوا

ہو گی ہر اک دعا قبول، قبلہ بدل کے دیکھ لو
کعبۂ شہر یار میں، کر کے وفا بہت ہوا

اُس کے بدن کی چاندنی، فکر میں میرے ڈھل گئی
نازشِ فن کے واسطے، رنگِ حنا بہت ہوا

پھرتی رہی برہنہ سر، نوعِ شہرِ حریت
کوئی نگر نہ لا سکا، ذکرِ ردا بہت ہوا

یہ بھی خدا کی شان ہے، رزم گہہِ حیات میں
زخم تو مجھکو کم لگے، حشر بپا بہت ہوا

O

وزیر آغا (لاہور)

دُکھ بھری اپنی کہانی جو سُنا دی ہم نے
دیکھ اے شخص، تجھے کیسی سزا دی ہم نے

کیا عجب آئے اِدھر بھی وہ ہَوا کا جھونکا
گھر کی دہلیز پہ اِک شمع جلا دی ہم نے

بانسری بول رہی تھی کہ اِدھر آ جاؤ!
اُس کی آواز میں آواز مِلا دی ہم نے

بات اتنی تھی کہ ہم پھولوں سے مسمار ہوئے
لے تجھے اِتنی سی اِک بات بتا دی ہم نے

بے خطا ہے تو اُسے کیوں ہے ندامت اِتنی
اپنے ہی گھر کو اگر آگ لگا دی ہم نے

دیکھیے ملتی ہے اب اُس کو سزا یا کہ جزا
تیرے انصاف کی زنجیر ہلا دی ہم نے

اب تو یُوں لگتا ہے اَے گردشِ پیہم جیسے
عمر ساری کسی خیمے میں بِتا دی ہم نے

O

انور سدید (لاہور)

نیا سال لایا، جراحت نئی
نمایاں ہے جس میں سیاست نئی

یہ ہمت نہیں کر سکیں سامنا
کھڑی ہے جو آگے مصیبت نئی

اُگلے تگلے امیروں کے ہیں
مسلّط غریبوں پہ غربت نئی

جو سردار ہے، دشمنِ قوم ہے
ہے تسلیم اس کو ہزیمت نئی

رواں ہے تنزّل کی جانب سدیدؔ
ہے دی قوم کو جو معیشت نئی

O

شبنم شکیل (اسلام آباد)

اک غزل لکھ کر اُسے بھیجیں ذرا
اور پھر ہوتا ہے کیا دیکھیں ذرا

زندگی بھر کی وفا سے کیا ملا
بے وفائی پر بھی اب سوچیں ذرا

وہ طلب گار محبت ہی نہیں
کیوں نہ اُس کو ایک دن کہہ دیں ذرا

یہ سفر اب تک تو راس آیا نہیں
یونہی چلتے جائیں یا ٹھہریں ذرا

زندگانی کی کہانی لکھ ہی دیں
لوگ کیا سوچیں گے مت سوچیں ذرا

وقت جو بھی رہ گیا ہے اپنے پاس
اُس کو بھی برباد کر دیکھیں ذرا

ڈھونڈتی رہتی ہیں گھر کی چابیاں
شبنم اپنے آپ کو ڈھونڈیں ذرا

O

جاوید شاہین (لاہور)

اک غلط کام کرنے والا ہوں
اور سرِ عام کرنے والا ہوں

اپنے حصے کی عزتِ اجداد
آج نیلام کرنے والا ہوں

بیٹھ کر اک جگہ بدن سے صاف
گردِ ایام کرنے والا ہوں

دو بڑے غم ستاتے رہتے ہیں
ان کا ادغام کرنے والا ہوں

اپنے اندر کے سارے غصے کو
حرفِ دشنام کرنے والا ہوں

آج میں آسماں کا راز کوئی
طشت از بام کرنے والا ہوں

جانتا ہوں جو لوگ کہتے ہیں
ردِ الزام کرنے والا ہوں

اک بہت ہی نرالی تہمت سے
اس کو بدنام کرنے والا ہوں

اک فراغت میں گھوم کر شاہیںؔ
تھوڑا آرام کرنے والا ہوں

سرُورانبالوی (راولپنڈی)

اُس سمت بھی نہ چلئے جدھر رُخ ہوا کا ہے
مجھ سے یہی تقاضا تو میری انا کا ہے

دروازہ لوگ دِن کو بھی اب کھولتے نہیں
بستی پہ سایہ ان دنوں یہ کس بلا کا ہے

مٹی کے دیپ بام پہ ہم نے جلا دیے
طوفانِ تند و تیز مقابل ہوا کا ہے

گلیوں میں بَین کرتی گزرتی ہے اب ہوا
کیا یہ بھی استعارہ کسی کربلا کا ہے

سر کو جھکا کے چلئے یہ کہتی ہے مصلحت
کاندھوں پہ سر نہ ہو یہ تقاضا ہوا کا ہے

بُجھنا تھا "رُت دیے" کو تو آخر وہ بجھ گیا
اس میں قصور اُس کا نہ بادِ صبا کا ہے

سنّاٹے گھر میں پھیلے ہیں دیوار و در سے کیا
باہر گلی میں شور عجب انتہا کا ہے

اپنے عدو کے وار کی زد سے میں بچ تو جاؤں
لیکن سوال آدمیت کی بقا کا ہے

اب زندگی کے زاویے یکسر بدل گئے
کاغذ کی ناؤ سامنا موجِ بلا کا ہے

شاید کہ آج ہم کو رہائی نصیب ہو
زنداں میں حبس آج بڑی انتہا کا ہے

اکبر حمیدی(اسلام آباد)

کب کسی کا خیال رکھتی ہے
زندگی اپنی چال رکھتی ہے

کر دیا ہے معاف بھی اس کو
پر طبیعت ملال رکھتی ہے

کتنی بھی مہربان ہو قسمت
کچھ نہ کچھ قیل و قال رکھتی ہے

رنگ بھرتا ہے ان میں اور کوئی
زندگی ماہ و سال رکھتی ہے

کس قدر مہربان ہے فطرت
وقت سا اندمال رکھتی ہے

موت ہے اندھی سی مچھیرن جو
اپنے ہاتھوں میں جال رکھتی ہے

اہلِ محفل سے پوچھ کر دیکھو
ہر زباں کچھ سوال رکھتی ہے

دل ندی موج میں جب اکبر
سارا پانی اچھال رکھتی ہے

O

ڈاکٹر خالد حمید(کیلیفورنیا)

گرچہ ملنے کے لئے آتا رہا جاتا رہا
پھر بھی میرے ہاتھ سے دلبر مرا جاتا رہا

رہ گئی رسمِ تکلف' چل بسے راز و نیاز
وہ تعلق' وہ تلطف' وہ مزا جاتا رہا

دیکھئے کیسی مسیحائی ہے اُس جلاد میں
دیکھتے ہی اُس کو دردِ لادوا جاتا رہا

کچھ غمِ فرقت نہ کم تھا' چھوڑ کر جب تُو گیا
مٹ گئی امید دل سے آسرا جاتا رہا

عشق کر کے غیر سے مجھ پر مہربانی ہے کیوں
کیا ترا جانِ جہاں ذوقِ خطا جاتا رہا

قتل سے کرتا نہیں آ کر علاجِ جانکنی
دل سے کافر کیا ترے خوفِ خدا جاتا رہا

دے کے دل کیوں ڈھونڈتا پھرتا ہے شیدا تُو اسے
کیا ہوا گر کھو گیا' اچھا ہوا جاتا رہا

O

جلیل عالی(راولپنڈی)

کیا ربط ایک درد سے بنتے چلے گئے
جنگل میں جیسے راستے بنتے چلے گئے

کڑیاں کڑی قیود کی بڑھتی چلی گئیں
حیلے رہِ نجات کے بنتے چلے گئے

ہونٹوں پہ کھِل اٹھا تو ہوا داغِ دل دعا
کیا کیا سخن کے سلسلے بنتے چلے گئے

کس صورتِ ثبات پہ ٹھہری نگاہِ دل
اک رقصِ رَو میں ٹوٹتے بنتے چلے گئے

بوتے رہے لہو کے دیئے ہم زمین میں
خورشید آسمان پہ بنتے چلے گئے

عالیؔ مقابلے کا نہ کوئی عدو رہا
ہم آپ اپنے دوسرے بنتے چلے گئے

O

انوارفیروز(راولپنڈی)

دور ظلمت بھلا نہیں سکتے
ہم کبھی مات کھا نہیں سکتے

دوست اپنے ہیں غمزدہ جب تک
گیت خوشیوں کے گا نہیں سکتے

جن کے سینے ہوں عزم سے خالی
کوئی طوفاں اٹھا نہیں سکتے

ہم کو دشمن سے سخت نفرت ہے
ہم یہ نفرت چھپا نہیں سکتے

اشک جب تک نہ آئیں آنکھوں میں
آتشِ غم بجھا نہیں سکتے

ہم نے پلکوں پہ اُن کو روک لیا
یونہی گوہر لُٹا نہیں سکتے

ہم پہ انوارؔ جو ستم ٹوٹے
وہ کسی کو بتا نہیں سکتے

O

غالب عرفان (کراچی)

پھر سے مجھ کو یاد کرتی ہے سمندر کی ہوا
جب چٹانوں سے گزرتی ہے سمندر کی ہوا

میں جو ساحل سے پرے آئینہ دیکھوں بھی تو کیا
عکس تک دھندلایا کرتی ہے سمندر کی ہوا

پیڑ، پتے اور پتھر چیر کر دکھلاتی ہے
پربتوں پر جب بکھرتی ہے سمندر کی ہوا

دور سے ہی لطف لہروں کا بھی لینا ورنہ پھر
ریت ہی آنکھوں میں بھرتی ہے سمندر کی ہوا

موج اندر موج طغیانی پہ آئی ہو تو ہو
کب کسی طوفاں سے ڈرتی ہے سمندر کی ہوا

مضطرب تنہا مسافر کو کنارے دیکھ کر
دور تک اک آہ بھرتی ہے سمندر کی ہوا

بزمِ عرفاںؔ میں طلوعِ آفتابِ صبح تک
سوئے مشرق سے نکھرتی ہے سمندر کی ہوا

O

قیصر نجفی (کراچی)

جو دستِ یار کو رنگِ حنائی دیتی ہے
لہو کی بوند وہ کس کو دکھائی دیتی ہے

یہ کیسا درد کا موسم ہے درد کے مارو
نہ کوئی چیخ نہ سسکی سنائی دیتی ہے

چمن میں آئے ہیں جب سے محافظانِ چمن
کلی کلی سرِ مقتل دکھائی دیتی ہے

کوئی سنے نہ سنے ظلم کے اندھیروں کی
ہوائے شہر تو شب بھر دہائی دیتی ہے

امیرِ شہر کی دنیا بڑی سہی لیکن
فرازِ دار سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے

خموشیوں کی ہزاروں قیود سے قیصرؔ
اٹھے تو ایک صدا ہی رہائی دیتی ہے

O

عشرت ظفر (کانپور بھارت)

لہو کا گریہ پرشور ابھر رہا ہے کہیں
جلوس سینہ فگاراں گزر رہا ہے کہیں

نوائے شب میں ہے شاداب آہٹوں کی کھنک
ستارہ زینۂ شب سے اتر رہا ہے کہیں

ہیں میری راہوں میں ما دیدہ مشعلیں روشن
چراغ مجھ سے مرا بے خبر رہا ہے کہیں

عذاب ہجر بھی ہو گا نشاط وصل کے بعد
رفاقتوں کا نشہ عمر بھر رہا ہے کہیں

یہ زخم وہ ہے جو رہتا ہے مثل داغ دوام
وگرنہ پھول کوئی شاخ پر رہا ہے کہیں

ہے اس کی آخری ہچکی کا انتظار مجھے
مرے وجود میں جو شعلہ مر رہا ہے کہیں

ہمارے عہد میں عشرتؔ ہے آگہی مصلوب
کوئی شرارۂ جاں معتبر رہا ہے کہیں

O

خیال آفاقی (کراچی)

سایہ ترے نقاب پہ کرتا ہے تبصرہ
اندھا بھی آفتاب پہ کرتا ہے تبصرہ

تو بھی دیکھ اپنی تلون مزاجیاں
کیوں میرے اضطراب پہ کرتا ہے تبصرہ

جس کو کسی کی آنکھ میسر نہ آ سکی
اس بدنصیب خواب پہ کرتا ہے تبصرہ!

غیروں کے ہر سوال پہ رہتا ہے وہ خموش
میرے ہر اک جواب پہ کرتا ہے تبصرہ

یوں مسکرا کے ملتا ہے جیسے پڑھے بغیر
کوئی کسی کتاب پہ کرتا ہے تبصرہ

موسم عجب ہے کس سے وفا کی رکھیں امید
بلبل بھی اب گلاب پہ کرتا ہے تبصرہ

فرصت ہو اپنے آپ سے تو آئینہ بھی دیکھ
کیا کیا ترے شباب پہ کرتا ہے تبصرہ

غنچے سے گُل بنایا تجھے جس نے تو مگر
گلشن کے اس نصاب پہ کرتا ہے تبصرہ

گردش میں ہے خیالؔ ازل سے تو پھر اے دوست
کس خانماں خراب پہ کرتا ہے تبصرہ

ماجد سرحدی(پشاور)

لو دیوانو بیت چلی شب گنتی کے کچھ تارے ہیں
موسمِ گل کی پہلی سحر کے سارے پھول تمہارے ہیں

ہم تم کب تک گھر لٹوائیں آخر کب تک دھوکے کھائیں
رہبر بن کر لوٹنے والو کتنے روپ تمہارے ہیں

یا تو دُکھ سکھ مِل کر بانٹو ورنہ چمن کا نام نہ لو
یہ کیسا انصاف ہے جس میں سارے پھول تمہارے ہیں

موسم کی بے کیفی پر کیوں یاس کے پھول پروتے ہو
پتوں کا جھڑ جھڑ کر گرنا وصلِ گل کے اشارے ہیں

گلشن گلشن پھول بکھیرو افسانوں میں رنگ بھرو
پیار کی خوشبو نے دنیا میں کیا کیا رنگ نکھارے ہیں

تم سے اہلِ ثروت کو ہم اپنا کہیں تو کیسے کہیں
تم کو مبارک ہو ہر نعمت ہم تو بھوک کے مارے ہیں

وقت کے ہاتھ سے گر کر ماجدؔ کتنے ساغر ٹوٹ گئے
میخانے میں رہنے والے بھی کتنے بیچارے ہیں

O

ڈاکٹر حنیف ترین(سعودی عرب)

چاندنی راتوں میں میری بے سکونی دیدنی
دُھوپ میں خوابوں کا عالم بے ستونی دیدنی

مطمئن سناؤ سے اپنے ہیں جو باچھیں کھلیں
اپنے ہی بکھراؤ میں ہیں اندرونی دیدنی

کون ناحدِ نظر ہے منظری پھیلا گیا
آنکھیں میری کر گیا ہے سُونی سونی دیدنی

سات سو خوں ہو گئے جب میرے قاتل کو معاف
حسنِ سفاکی سے نکھرا میرا خونی دیدنی

جس کے گرداب میں تھا جھونکا جو پُروائی کا
اب زمستاں میں ہے اس کا لطف اُونی دیدنی

داد کیوں دیں گے تمہاری شاعری کو نکتہ رس
جب نہیں ہیں اس میں ترکیبیں فسونی دیدنی

عشق سے میرے بھلا وہ کس طرح بچ پائے گا
کر گیا ہے جو مری حالت جنونی دیدنی

O

ستارہ باجی.... قیوم راہی

وہ تذبذب میں گھرا ہوا تھا کیا چاہتا ہے اور اندر ہی اندر ڈرا سا کیوں رہنے لگا ہے کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔ نہ جانے اس کا تجزیہ کرنے سے وہ کتراتا اور گھبراتا کیوں تھا کہ یہ ایسی الجھن اور معمہ ہے جسے سلجھایا ہی نہیں جا سکتا ہو۔

دراصل وہ مسلسل ایک عجیب اور پیچیدہ قسم کی کیفیت تھی۔ اکثر اوقات دھیمے دھیمے سے اضطراب میں سلگتا رہتا تھا اس معاملے میں زیادہ دخل تخیل کو تھا جو آئے دن مختلف نوع کے احساسات اور جذبات کی تصویریں دکھاتا رہتا تھا۔ کبھی سوتے جاگتے خیالوں کے دریچوں میں ستارہ کا ہنستا ہوا شاداب چہرہ طلوع ہونے لگتا دل میں کھب جانے والے زاویوں کے ساتھ تو کبھی رفیق کی صورت ابھرنے لگتی۔ خشمگیں اور ڈراؤنی آنکھوں میں حقارت، سرزنش اور قہر کے شعلے بھڑکاتے۔ کبھی ستارہ باجی کا ملائم سا چہرہ، پیشانی پر شکن، خمیدہ ہونٹ اور اس پر عداوتوں کی یلغار شروع ہو جاتی اور جب رفیق بھائی کی محبت اور خلوص سے چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھتا تو دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہوا محسوس ہوتا۔ لیکن جب ستارہ کے کندن سے بدن کا خیال اپنی آغوش میں لے لیتا تو حواس پر ایک خمار سا چھانے لگتا۔ کبھی یوں ہوتا کہ ہمارے چہرے گڈمڈ ہو جاتے اور ایک نامعلوم سے ڈر پیچھے کی پُراسرار پرچھائیاں سرگوشیاں سی کرتی ہوئی آس پاس منڈلانے لگتیں۔ یہ حالت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی چلی گئی۔ کراچی میں سات روز رہا۔ یہاں سے بھاگ کر پناہ لینے کی کوشش رائیگاں چلی گئی۔

کبھی وہ سرے سے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا مگر اس دوران میں بھی ستارہ کے گداز جسم کا کیف انگیز تصور حائل ہو جاتا۔ کبھی تو وہ خیال تھا جو لگاتار اس کی سوچوں کا تعاقب کرتا رہتا۔ ورغلاتا اور ڈانواڈول کرتا رہتا۔ اور ستارہ کے گھر جانے کے لئے اکساتا بلکہ دھکیلتا رہتا۔

ستارہ باجی کا گھر ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب بھی وہ اداس ہوتا کہیں چین نہ ملتا وہاں چلا جاتا۔ اس گھر کا ماحول اسے شانت کر دیتا۔ سب کچھ بھول کر وہاں کی اپنائیت سے لبریز مہکتی خوشبو میں جذب ہو جاتا۔

ستارہ باجی اس کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ زندگی اور جوانی سے اس قدر بھرپور لگتی تھیں کہ کسی کو گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ دو جوان ہوتے ہوئے بیٹوں کی ماں ہیں۔ شادی کو اٹھارہ برس بیت چکے ہیں اور وہ رفیق احمد کے ساتھ ایک آسودہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ رفیق احمد ڈیل ڈول، رنگ روپ بلکہ کسی بھی لحاظ سے ستارہ باجی کا شوہر معلوم نہیں ہوتا۔ جچتا ہی نہیں۔ رنگ پکا سانولا اور ستارہ باجی.... سرخ و سفید.... دلآویز چہرہ..... مگر رفیق احمد دل کا بڑا اجلا تھا۔ ستارہ باجی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ستارہ باجی بھی اس کی پسند اور آرام کو فراموش نہیں کرتی تھیں۔ اور یوں یہ گھر جنت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا لیکن اس گلشن کے شب و روز میں بھی ستارہ باجی کبھی کبھار کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔ جیسے کوئی کمی رہ گئی ہو۔

ستارہ باجی کی شخصیت باوقار تھی اور پرکشش۔ وہ انہیں پسندیدگی، عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ احترام اس وجہ سے نہیں کہ ستارہ باجی عمر میں کئی برس بڑی تھیں اور وہ "باجی" کہتا تھا بلکہ اس میں ستارہ باجی کے مہربان رویے اور بے ریا معصوم باتوں کا زیادہ دخل تھا۔ رفیق احمد سیدھا سادا مگر اچھا آدمی تھا۔ درد مند دل رکھتا تھا۔ اس کی ملازمت کے حصول میں کوشاں۔ گزشتہ برس جو ایک ادارے میں ملازمت ملی تھی وہ رفیق احمد ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ رفیق احمد نے اس رنج میں بھی اسے تسلیاں دی تھیں جب اس کی بیوی مردہ بچے کو جنم دے کر گزر گئی تھی۔ اگر یہ بھائی دلجوئی نہ کرتا تو شاید ذہنی توازن کھو بیٹھتا۔

لیکن اب وہ پہلی سی پریشانی نہ رہی۔ سوچنے کا انداز یہ تھا کہ جو کچھ ہوا ہے ہو کر رہے گا۔ کڑھنے اور سسکتے رہنے سے فائدہ؟ مگر یہ منطق ستارہ والے معاملے میں ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بے چین سا رہنے لگا تھا وہی ایک خیال کی تکرار تھی۔ من موہنی صورت، متوالے نین..... گورے گورے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں۔ گداز گلابی گلابی کلائیاں اور پاؤں۔

اور یہ ایک ماہ ادھر کا قصہ۔ ستارہ باجی نے پہلی بار اسے آغوش میں لے لیا تھا۔ اس نے ستارہ باجی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دن بھر روزگار کی تلاش میں کھوج کھوج تھک ہار کر ستانے کے لئے اس نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ آخری پناہ گاہ بھی اس کے لئے۔ ستارہ باجی نے دروازہ کھولا۔ حسب معمول خوش دلی سے سواگت کیا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ ستارہ باجی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور وہ مسہری پر نیم دراز۔

"اب تو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا ستارہ باجی" اس نے پوچھا۔

پچھلے ہفتے آیا تھا تو رفیق بھائی نے ستارہ باجی پر دل کے ایک ہلکے سے دورے کی تشویش انگیز خبر دی تھی۔

"جی.... " ستارہ باجی نے چونکتے ہوئے کہا "ہاں.... طبیعت تو ٹھیک ہے دیکھو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں بھلی چنگی۔"

"پھر بھی غذا کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور ۔ اور خوش رہا کریں، بظاہر کوئی serious صورت حال نہیں لگتی۔"

"خوش.... " ستارہ باجی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں "خوش تو میں وقتی ہی ہوں۔ تم نے کبھی دیکھا ہے مجھے ناخوش۔"

ستارہ باجی کو نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دو بار گہرے سانس لیے اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا جیسے کچھ بولنا چاہتی ہوں۔ چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔

پھر انہوں نے نیم وا آنکھوں سے ایک ادا کے ساتھ اسے گھورا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ اور اس گمبھیر خاموشی کے اندھیرے میں ستارہ باجی کی آواز کا کوندا لپکا۔ "کیا بات ہے بذات، تھکے تھکے سے لگ رہے ہو"

"آپ نے خوب چلا۔ واقعی تھک گیا ہوں۔ سر میں درد بھی ہے ہلکا ہلکا سا۔"

اور ستارہ باجی جیسے کوئی بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔ اٹھ کر سرہانے بیٹھ گئیں۔

"لاؤ دبا دوں۔" اور انہوں نے تپا ہوا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ اور سچ سچ دبانے لگیں۔

جیا ایک وقت کی رفتار تھم گئی۔

پلک جھپکنا تک بھول گیا وہ۔

یہ لمحے گزر گئے تو پر شتے ان کے عجیب سے نشے میں جھومتی ہوئی سی گلی۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے کیا کہے۔ بس ایک جادو میں بندھا چلتا رہا۔

ستارہ باجی کا شیرازہ تو پہلے ہی بکھر گیا تھا۔ اب تو ان کے اندر سے مدہوش آنکھوں والی ایک گرم عورت برآمد ہو گئی۔ اس عورت کا نام "ستارہ" تھا۔ اس کے اندر بھی ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس رنگین خواب میں ستارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دھیرے سے راز دارانہ لہجے میں بولی "دونوں لڑکے پکچر دیکھنے گئے ہیں۔ شام تک ہی آئیں گے۔" ہاتھ دبا کر کہا "رفیق بھی دیر سے آئیں گے۔ کہہ گئے تھے چائے پر انتظار نہ کرنا۔" پھر وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ وحشت سی طاری ہو گئی۔ پھر لذت بھرا یہ سلسلہ ایک ہوش ربا عالم میں ڈھل گیا۔ خود فراموشی کی ایسی پھوار پڑی کہ دونوں ہی شرابور ہو گئے۔

جب یہ وقت گزر گیا اور سناٹے کی حکمرانی ہو گئی تو دونوں حیرانی کی دہلیز پر بیٹھے تھے لب بستہ .... نگاہیں جھکی جھکی۔

ستارہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی اس دروازے کی طرف بڑھا جو گلی میں کھلتا تھا۔ بازار کی چہل پہل میں راستہ بناتے ہوئے ایک کھٹکا سا لگ رہا تھا جیسے کوئی تعاقب کر رہا ہو۔ یہاں سے گھبرا کر بلکہ کترا کر وہ ایک دوست کے بلاوے پر کچھ دنوں کے لئے کراچی چلا گیا۔ مگر ان خیالوں اور خوابوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ کراچی میں اس کا دل نہیں لگا۔ طے شدہ دورانیے سے پہلے ہی واپس چلا آیا۔

ایک روز سوچ سوچ کر وہ بے قرار ہو رہا تھا بلکہ ہلکان ہو رہا تھا۔ ایک تجسس بار بار ستارہ کے گھر جانے کے لئے اکسا رہا تھا بلکہ مجبور کر رہا تھا۔ سب کچھ غیر متوقع طور پر اچانک ہی تو ہو گیا تھا۔ سب کچھ۔ لیکن خاموشی کی بھی تو اپنی زبان ہوتی ہے۔ اور پہل بھی تو ستارہ نے ہی کی تھی۔ مطلب واضح ہے۔ حوصلے کی مہیز لگی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ دونوں لڑکے کالج میں ہوں گے۔ ان کی واپسی میں ابھی خاصا وقت ہے۔ اور ستارہ گھر میں اکیلی .....

وہ ستارہ کے گھر جانے کے لئے رکشا میں بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہ پیدل بھی جا سکتا تھا ٹہلتے ٹہلتے مگر اس وقت دیر کرنے کی گنجائش کہاں تھی۔ وہ تو جست لگا کر آن واحد میں وہاں قدم رکھنا چاہتا تھا۔

ستارہ کے گھر کے قریب پہنچ کر پاؤں من من بھر کے لگنے لگے۔ کشمکش و پیچ میں یا کہ ایک بار واپسی کا ارادہ ہو گیا لیکن حقیقت حال کی جستجو اور تشنگی سی "خواہش" میں بڑا زور تھا۔ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کنڈی کھٹکھٹائی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ صدیوں بعد دروازہ کھلا۔ ستارہ کے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم نمایاں تھا مگر فوراً ہی معدوم ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے ستارہ کے پیچھے چلنے لگا۔ خیر مقدم۔ کوئی بات نہیں ہوئی۔ کمرے میں دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ صوفوں پر۔ دونوں کی نگاہیں فرش پر ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھیں نہ جانے کیا تلاش تھی۔

آخر اس نے چند نگاہوں کی کمند ستارہ کے چہرے پر پھینکی۔ کھوئی کھوئی تھی۔ اس نے کھنکھار کر ستارہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ستارہ نے اُدھر دیکھا۔ نگاہوں میں رعب تھا.... اور ایک دبدبہ۔ تاب نہیں لا سکا وہ۔

"کہو نوکری، ملازمت کا کیا رہا۔ کچھ بنا کوئی امید؟" ستارہ ایک وقار کے ساتھ بولی۔

"ابھی تو کچھ بھی نہ ہو سکا۔ توقع ضرور ہے۔ شاید کچھ ہو جائے اگلے ہفتے میں۔"

ستارہ نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی۔ اکھڑی اکھڑی بیٹھی تھی۔ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور انگلیاں چٹخانے لگی۔

"آپ کی طبیعت کا اب کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ہی ہے۔"

"علاج کی کیا صورت ہے۔"

"کچھ نہ کچھ دوائیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ بعض تو مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خلا بلڈ پریشر اور شوگر کی۔"

آواز پھر ایک بار گہری خاموشی کے پاتال میں اتر گئیں۔

دفعتاً اس نے روبرو ستارہ باجی کو بیٹھا ہوا پایا۔ ان کی آنکھوں میں ایک جلال کی جھلک تھی اور وہ مطمئن اور پُر اعتماد لگ رہی تھیں۔

اور اس کے اندر کی تمام دنیا گویا صابن کے جھاگ کے مانند بیٹھ گئی۔ سارا غبار چھٹ گیا اور دھندلایا ہوا راستہ صاف ہو گیا۔

ستارہ باجی ملائم لہجے میں بولیں "تم بیٹھو نا۔ تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔ یا ٹھنڈا پیو گے۔"

"نہیں کچھ بھی نہیں۔ رہنے دیجیے اس وقت۔"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"کیوں بھئی۔ کیا ہوا۔"

"ذرا جلدی میں ہوں۔ پھر آؤں گا۔"

"اچھی بات .... تمہاری مرضی ..."

اس نے ادب کے ساتھ ستارہ باجی کو سلام کیا اور باہر نکل آیا۔

اوورکوٹ

منیر الدین احمد

اس زمانے میں میرا معمول تھا کہ صبح کام پر جاتے ہوئے کار کو یونیورسٹی کے گیراج میں پارک کرنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ تک، جو وہاں سے چند منٹوں کے فاصلے پر تھی، پیدل جاتا تھا اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ اس طرح سویرے سویرے تھوڑی سی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ راستے میں ریلوے اسٹیشن پڑتا تھا جہاں پر مضافات سے آنے والی گاڑیاں ہر دو تین منٹوں کے بعد آ کر رکتی تھیں اور ان میں سے انسانوں کا ایک ریلا نکل کر یونیورسٹی کی جانب چل دیتا تھا۔ جس طرف سے میں آ رہا ہوتا تھا، اس طرف چہرہ اور سطر سامنے سے آنے والے انسانی ہجوم سے بار بار پڑتا تھا۔ انسانوں کا یہ ریلا پانی کے سیلاب کی طرح تھا جس سے بچنے کے لئے مجھے کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف راستے سے ہٹ جانا پڑتا تھا، وگرنہ خطرہ تھا کہ وہ سونامی کی طرح مجھے روندتا ہوا میرے اوپر سے گزر جائے گا۔

لمبے عرصے سے یورپ میں قیام کے سبب میں بھی دوسروں کی طرح لوگوں کو نظر انداز کرنے میں مہارت پیدا کر چکا تھا۔ اس لئے اکثر مجھے خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ کون میرے پاس سے گزر گیا ہے اور کون نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آہستہ آہستہ بیشتر لوگوں کے چہرے مجھے جانے پہچانے لگنے لگے تھے۔ مگر میرا بھی نہیں تھا کہ اگر کوئی ان میں سے کسی روز نظر نہ آتا تھا تو مجھے اس کی غیر حاضری کا احساس ہو جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ فلاں چہرہ آج دکھائی نہیں دیا۔ اس چیز میں البتہ ایک استثنا پایا جاتا تھا۔ مجھے ایک بیس بائیس برس کی طرحدار لڑکی کا ہر روز انتظار رہنے لگا تھا جو ایک معین جگہ پر سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ شاذونادر ہی کبھی ناغہ کرتی تھی اور کپڑے بہت چیدہ پہنتی تھی۔ اس کے کندھے سے لٹکتے ہوئے بیگ سے، جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا، پتا چلتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کی طالبِ علم تھی۔ مگر دوسری لڑکیوں کے برعکس، جو عام طور سے بھاگتی ہوئی چلتی تھیں اور جن کا ایک ایک قدم فیشن پریڈ کی طرح اٹھتا تھا، وہ کسی ملکہ کی طرح لطف اندوز کرتی ہوئی چلتی تھی۔ اس کی آنکھیں فٹ پاتھ پر گڑی ہوتی تھیں۔ کیا مجال ہے جو اس نے کبھی دائیں یا بائیں دیکھا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا نام "ملکی وائب" (بندوق بردار عورت) رکھ چھوڑا تھا جو جرمن میں ان عورتوں کے لئے گھڑا گیا تھا جو دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں شہروں سے مردوں کی عدم موجودگی کے سبب، جو سارے کے سارے جنگ کے محاذ پر بھیج دیئے گئے تھے، بندوقیں کندھوں پر اٹھائے ہوئے شہروں میں پہرہ دیا کرتی تھیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بندوق کے استعمال سے بھی نہ چوکتی تھیں۔ وہ مردوں سے بڑھ کر نازی پارٹی کی فرماں بردار تھیں۔

دھیرے دھیرے مجھے ہر روز اس کا انتظار رہنے لگا۔ میں دل ہی دل میں قیاس آرائیاں کیا کرتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے کس شعبے میں پڑھتی ہوگی۔ اب میں یہ تو نہیں کر سکتا تھا کہ اسے راستے میں روک کر پوچھوں کہ وہ کیا پڑھتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات پر بگڑ جائے اور کہے کہ جناب کو یہ بات پوچھنے کا حق کس نے دیا ہے؟ اس لئے میں نے دل میں سوچا وہ کچھ بھی پڑھتی ہو، مجھے اس بات سے کیا لینا دینا ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ سویرے سویرے اس کا دیدار مجھے سارا دن مسرور رکھتا ہے اور میں اگلی صبح کی راہ تکنے لگتا ہوں۔

آہستہ آہستہ وہ مجھے اتنی جانی پہچانی لگنے لگی کہ میں نے اسے "صبح بخیر" کہہ کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ ایک دو روز تک اس بات پر شاید حیران ہونے کے بعد وہ میرے سلام کا جواب اپنی بے حد میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ دینے لگی، بلکہ کچھ دنوں میں اکثر پہل کرنے لگی۔ جرمنی میں گاؤں کے باسی اب بھی ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، مگر شہروں میں اس کا رواج عرصہ ہوا نہیں رہا۔ بہر صورت یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا اور ہفتوں تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

پھر ایک روز اچانک عین اس وقت بارش کے بوندیں گرنے لگیں، جب ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ میں نے جنٹلمینوں کی طرح جھٹ اپنے بیگ میں سے چھتری نکال کر سر پر تان لی، مگر میں نے دیکھا کہ وہ چھتری کے بغیر تھی اور بارش میں بھیگ رہی تھی۔ میں نے "صبح بخیر" کہنے سے بھی پہلے اسے اپنی چھتری کے نیچے آ جانے کو کہا اور رخ موڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا اگر وہ پسند کرے تو میں اسے اس کی منزلِ مقصود تک چھتری کے سائے میں پہنچانے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے کہا آپ کے وقت کا حرج ہوگا۔ میں اگر تھوڑی بہت بھیگ بھی گئی تو کوئی بات نہیں۔ میں نمک کی ڈلی تو ہوں نہیں کہ گھل جاؤں گی۔ میں نے کہا مگر گیلے کپڑوں میں کسی لیکچر روم میں جا کر بیٹھنے سے بہتر ہے کہ آپ میری پیش کش کو منظور کر لیں، جو بالکل مفت ہے۔ اس پر آپ کا ایک دھیلا بھی نہیں لگے گا اور میں سارا دن مسرور رہوں گا کہ آپ کے کسی کام آ سکا تھا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ وہ قانون پڑھتی ہے اور ابھی دوسرے سمسٹر میں ہے۔ میں نے کہا پھر تو ہمارا صبح کا ملاپ بہت دنوں تک چلے گا۔ بشرطیکہ آپ یونیورسٹی بدل کر کسی دوسرے شہر نہ چلی جائیں۔

اس نے کہا "آپ کو اتنے ہفتوں سے ہر صبح عین وقت پر دیکھتے دیکھتے میں اس چیز کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ اس راستے کا آپ کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے جواب دیا: "میں وقت کی پابندی صرف آپ کو "صبح بخیر" کہنے کے لئے کرتا ہوں اور آپ جانتی ہیں کہ میرے سوا اس بھری پری سڑک پر کوئی شخص اس طرح کی دقیانوسی روایت کا پاس نہیں کرتا۔"

اس نے بتایا کہ ابتدا میں اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی اور وہ دو

تین روز تک سمجھتی رہی تھی کہ میرا سلام شاید کسی دوسرے شخص کے لئے تھا مگر پھر اس نے دیکھا کہ سلام کرتے وقت میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہوتی تھیں۔ اس لئے اس نے سلام کا جواب دینا شروع کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو یہ رسم اچھی لگنے لگی تھی۔ ہم اس دوران میں یونیورسٹی کے شعبہ قانون کی مرکزی عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اس نے رخصت کے وقت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اگلے روز ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

اس کے بعد مہینوں تک ہمارا وہی سابقہ معمول رہا۔ البتہ اب یہ فرق پڑ گیا تھا کہ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی تھی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی اور اس کی "صبح بخیر" میں اب شہد کی شیرینی گھلی ہوتی ہوتی تھی۔ مگر اب بھی ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور بتایا کہ اس روز اس کی سالگرہ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ ایک قریبی چائنیز ریستوران میں کھاؤں۔

کھانے سے پہلے ہم نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام زیگلنڈے تھا جو قدیم جرمن متھولوجی سے جڑا ہوا لگتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ بھی میری طرح اس شہر میں غیر ملکی ہے کیونکہ اس کا خاندان دوسری جنگ عظیم کے بعد سائیلیسیا سے نکالے جانے کے بعد وہاں پر آ کر آباد ہوا تھا۔ اس کا تعلق ایک اسٹوکریٹک فیملی سے تھا جس کی وہاں پر بھی چھوٹی سی جاگیر تھی۔ مگر یہ سب کچھ اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ فوج کا ریٹائرڈ کرنل تھا جس کو جنگ کے بعد امریکی قید کاٹنی پڑی تھی۔ جب وہ وہاں سے لوٹا، تو بالکل نچڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس کی بیوی اور بچے جنگ کے دوران بمباری کا شکار ہو گئے تھے۔ دوسری شادی کے لئے اس نے اپنے علاقے کی ایک لڑکی کو چنا، جو اس کی طرح اپنے خاندان میں سے اکیلی بچ نکلی تھی۔ دونوں کی عمروں میں تیس برس کا فرق تھا گویا میاں بیوی کے درمیان ایک پوری نسل کا فاصلہ پایا جاتا تھا اور باپ اور بیٹی کے درمیان ایک چھوڑ دو نسلیں حائل تھیں۔ اس لئے جب وہ کنڈرگارٹن میں تھی، تو نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے چھٹی ہونے پر لینے کے لئے آئے کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ دوسرے بچے سمجھیں گے کہ اس کا دادا اس باپ کی بجائے اسے لینے کے لئے آتا ہے۔

میں نے کہا "تمہارے تعلقات باپ کے ساتھ کیسے ہیں؟"

اس نے کہا "ویسے ہی جیسے ان لوگوں کے ہوا کرتے ہیں، جن کی عمروں میں نصف صدی کا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب جرمنی میں بادشاہت قائم تھی اور ملک میں سپاہیانہ روایات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ احکام اوپر سے جاری ہوتے تھے اور ہر کسی کو سر خم کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے وقتوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ آج بچے بھی اپنے حقوق مانگتے ہیں۔ وہ زمانہ لد گیا ہے جب ماں باپ اپنی اولاد کی قسمت کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اس بات سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میرے تعلقات باپ کے ساتھ بہت کشیدہ ہیں۔ وہ کہا کرتا ہے کہ فوج میں اس کی کمانڈ پر پوری بٹالین اٹینشن کھڑی ہو جاتی تھی اور اب ایک چھوٹی سی بچی اس کی بات پر کان نہیں دھرتی۔"

میں نے کہا "اس کے ساتھ تمہارا جھگڑا کس چیز پر ہوتا ہے؟"

اس نے کہا "کپڑوں کے انتخاب سے لے کر اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ دوستی تک۔ غرض ہر چیز پر۔ یوں بھی میں نے اپنے سوالات سے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں پوچھا کرتی ہوں کہ وہ کیوں کر نازی پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اور ہٹلر جیسے جنونی قاتل کو اپنا "فیوہرر" (رہنما) ماننے لگ گیا تھا۔ کیا اس کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ یہ پارٹی جرمنی کو جنگ کی طرف لے جا رہی تھی، جس کے نتیجے میں جرمن قوم تباہ ہو جائے گی۔"

میں نے پوچھا "کیا تمہاری ماں بھی نازی پارٹی کی ممبر تھی؟"

اس نے کہا: "وہ اس زمانے میں ابھی کم عمر تھی اور اپنے ماں باپ کے زیر اثر تھی۔ جب کہ میرا باپ ملٹری میں افسر تھا۔ اس لئے میں اس کو تنقید کا نشانہ بناتی ہوں۔ کیونکہ اس نے ہٹلر اور نازی پارٹی کا ساتھ دیا تھا جب کہ ان کی سیاست صریحی طور پر ملک اور قوم کے مفادات کے منافی تھی۔"

میں نے کہا: "مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جرمنی میں نازیوں کے خلاف کسی نے بغاوت نہیں کی۔ کیا اس قوم میں ایک بھی ایسا من چلا نہیں پایا جاتا تھا جو اپنی جان پر کھیلتے ہوئے ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کرتا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کے مرنے پر نازی پارٹی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی۔"

اس نے کہا: "نازی پارٹی کے اندر ایسے لوگ موجود تھے، جو ہٹلر کی جگہ لے سکتے تھے۔ جہاں تک ہٹلر پر قاتلانہ حملوں کا تعلق ہے اس بارے میں شاید تم نہیں جانتے کہ کم و بیش چالیس بار اس پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے گئے، جو مختلف وجوہات کی بنا پر وقت سے پہلے ترک کر دیئے گئے یا ان پر کسی دوسری وجہ سے عمل درآمد نہ ہو سکا۔ مثلاً ایک کوشش اس لئے آخری لمحے میں روک دیا گیا تھا کیونکہ پلاننگ کے مطابق ہٹلر، ہملر اور گوئرنگ کو ایک ساتھ بم سے اڑایا جانا تھا جو اتفاقی طور پر اس روز یکجا نہ تھے۔ ہملر ایس ایس فوج کا کمانڈر تھا اور گوئرنگ ایئر فورس کا سربراہ تھا اور اس کو ہٹلر نے اپنا جانشین مقرر کر رکھا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر ہٹلر مر گیا اور یہ دونوں زندہ رہے تو ملک خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا "کیا ہٹلر پر کوئی قاتلانہ حملہ ہوا تھا؟"

اس نے جواب دیا: "ایسے حملے ہوئے تھے مگر ہٹلر اتفاقی طور پر بچ جاتا رہا۔ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں ایک مستری گیورگ ایلسر نے تن تنہا میونخ کے ایک شراب خانے کو بم سے اڑا دینا چاہا تھا جہاں پر ہٹلر ہر سال ۸ نومبر کی شام کو ۱۹۲۳ء میں ناکام ہو جانے والی بغاوت کی یاد تازہ کرنے کے لئے تقریر کیا کرتا تھا جس کا اعلان اس نے اسی شراب خانے میں کیا تھا۔ ایلسر کا ارادہ پوری عمارت کو بم سے اڑا دینے کا تھا، جس کے لئے اسے بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ کئی راتوں تک پب کے بند ہونے سے پہلے عمارت

کے اندر کسی جگہ پر چھپ جاتا تھا۔ جب سب لوگ چلے جاتے تھے اور وہ اطمینان کر لیتا تھا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا، تو وہ اس ستون کی طرف جاتا تھا جس کے پاس ہٹلر بیٹھا کرتا تھا اور جہاں پر تقریر کرنے کے لئے ڈائس رکھا ہوا تھا۔ ایلسر کی پلاننگ یہ تھی کہ اس ستون میں ڈائنامائٹ ڈال دیا جائے، جس کے لئے اسے ستون کے اندر ایک سوراخ کرنا تھا جس میں آلارم کلاک کو بھی رکھا جانا تھا جس کو وہ ہٹلر کی تقریر کے وقت پر سیٹ کرنا چاہتا تھا۔ عام طور سے ہٹلر لمبی چوڑی تقریر کیا کرتا تھا اس لئے آلارم کلاک کو شام کے نو بج کر اکیس منٹ پر سیٹ کیا گیا تھا۔ مگر اس روز ہٹلر نے خلاف معمول مختصر تقریر کی، جو نو بج کر سات منٹ پر ختم ہو گئی۔ اس کے مابعد ہٹلر وہاں سے چلا گیا۔ دھماکا اس کے جانے کے بعد ہوا، جو اس قدر زبردست تھا کہ ہال کی چھت پوری کی پوری گر گئی، جس کے نیچے دب کر سات افراد ہلاک ہو گئے اور چھ سو آدمی زخمی ہوئے۔ اس چیز سے ہٹلر کے چیلے چانٹوں نے یہ فال نکالی تھی کہ قدرت ان کے "فیوہرر" کی خود حفاظت کرتی ہے کیونکہ اس سے کوئی بہت بڑا کام لیا جانا مقصود ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ جب میں جرمن شاعر وولفگانگ بورشرٹ پر کتاب لکھ رہا تھا تو اسے ملنے کے لئے مجھے میونخ جانا پڑا تھا۔ انٹرویو کے دوران اس کے فسانے "جب مجھے ہٹلر نے ناشتے پر بلایا" کا ذکر آ گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہٹلر سچ مچ بعض اوقات بچوں کو اپنے دسترخوان پر آنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اس فسانے میں بورشرٹ نے بیان کیا تھا کہ وہ اپنے چچا کی معیت میں ہٹلر کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے گیا تھا مگر یہ کہانی اس کے ذہن کی تخلیق تھی، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب میں نے میونخ کے اس شراب خانے کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، جس کو ایلسر نے ڈائنامائٹ سے تباہ کر دیا تھا تو اس نے کہا کہ اگر اس وقت ہٹلر وہاں پر موجود ہوتا، تو مرنے والوں میں سرفہرست ہوتا۔ چنانچہ وہ مجھے وہاں پر لے گیا۔ اس نے اپنے لئے بیئر کا اور میرے لئے انگور کے رس کا آرڈر دیا۔ اسی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ہٹلر میری طرح نہ تو شراب پیتا تھا اور نہ سگریٹ نوشی کرتا تھا۔ پھر اس نے مجھے میونخ کی یونیورسٹی دکھانے کا پروگرام بنایا، جہاں پر طالب علموں کے ایک گروپ نے شہریوں کو بغاوت کرنے پر اکسانا چاہا تھا مگر ناکام رہے تھے۔

نیگلڑ نے کہا: "میں تمہیں اس بارے میں تفصیلات بتا سکتی ہوں۔ اس تحریک کا نام "سفید گلاب کے پھول" تھا جس کے کرتا دھرتا ہانس شول اور اس کی بہن صوفی شول تھے۔ دونوں میونخ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ان کے ساتھ پانچ چھ دوسرے افراد بھی شامل تھے، جن کے نام عام طور سے لوگ نہیں جانتے۔ ہانس نے جون ۱۹۴۲ء کو پہلا پمفلٹ شائع کیا تھا جو ڈاک کے ذریعے مختلف افراد کو بھیجا گیا تھا۔ فروری ۱۹۴۳ء تک کل چھ ایسے پمفلٹ چھاپے اور تقسیم کئے گئے تھے۔ آخری پمفلٹ میں جرمنوں کو کھلم کھلا نازی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ یونیورسٹی کے ایک کارکن نے بہن بھائی کو اوپر کی منزل سے پمفلٹوں کے بنڈل کو نیچے صحن میں پھینکتے ہوئے پکڑ لیا تھا اور پکڑ کر گسٹاپو کے حوالے کر دیا تھا۔"

میں نے کہا: "پیٹر نے مجھے وہ صحن دکھایا تھا جہاں فرش پر سیمنٹ میں اس پمفلٹ کے اوراق کی شبیہ کو آنے والی نسلوں کے لئے کھود کر دیا گیا ہے۔ پھر اس نے مجھے پولیٹیکل سائنس کا شعبہ بھی دکھایا، جس کا نام ہانس اور صوفی شول انسٹی ٹیوٹ رکھ دیا گیا تھا۔"

اس کے بعد کچھ دنوں تک ہمیں مل بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ نیگلڑ نے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ مجھے ہٹلر پر ہونے والے دوسرے حملے کے بارے میں بتائے گی، جو بدقسمتی سے پہلے حملے کی طرح ناکام رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی سالگرہ کے روز دوپہر کے کھانے پر بلانا چاہا، مگر وہ اس روز نہ آ سکتی تھی، کیونکہ امتحان کے دن قریب تھے اور عین اس روز ٹیوٹوریل رکھا گیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میری دعوت قبول کرے گی اور اس شخص کے ایک عزیز کو اپنے ساتھ لائے گی، جس نے ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور جس کے نتیجے میں اس کے خاندان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

امتحان ختم ہونے پر میں نے اپنی دعوت طعام کا اعادہ کیا اور یاد دلایا کہ وہ کسی دوست کو اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ اس شخص کے ساتھ اس کی اس دوران میں منگنی ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ کرسٹوفر کی معیت میں آئی۔ جس کا تعارف اس نے یہ کہہ کر کرایا کہ وہ کرافٹ فان شٹاؤفن برگ کا بھتیجا ہے جس نے ہٹلر کو بم سے اڑا دینا چاہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کرسٹوفر کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھا اور ہائیڈل برگ میں رہتا تھا جہاں پر نیگلڑ کو عدالت میں انٹرن شپ مل رہی تھی۔ اب صرف امتحان کا نتیجہ نکلنے کی دیر تھی، جو آئندہ دنوں میں متوقع تھا۔

کرسٹوفر سے میں ہٹلر پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں وہ باتیں سننے کا خواہشمند تھا جو اس کی فیملی میں بیان کی جاتی تھیں۔ میں کرافٹ فان شٹاؤفن برگ کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ ابتداء میں نازی پارٹی کا سرگرم رکن اور ہٹلر کا مداح رہ چکا تھا مگر یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور مشرقی یورپ کے باسیوں کے ساتھ کیا جانے والا سلوک اور سب سے بڑھ کر جس طریقے سے جرمنی جنگ لڑ رہا تھا اس کے ساتھ وہ اتفاق نہیں رکھتا تھا۔ سوویت یونین پر حملہ کرنا ہٹلر کی سب سے بڑی غلطی شمار کی جاتی تھی۔ جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ سٹالن گراڈ میں جرمن فوج کو دو برسوں تک محاصرہ کرنے کے بعد شکست ہو چکی تھی۔ ڈھائی تین لاکھ جرمن فوجی مارے گئے تھے اور پندرہ سولہ لاکھ روسی بھی جنگ کے صرف اس محاذ پر کام آئے تھے۔

کرسٹوفر نے کہا: "سٹالن گراڈ میں شکست کے بعد ملک میں عام طور سے نازی حکومت کے خلاف عوام میں بہت غصہ پایا جاتا تھا مگر نازی ڈکٹیٹر شپ کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی۔ البتہ فوج کے افسروں میں خفیہ طور پر ملک کو

نازی پارٹی سے نجات دلانے کے لئے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ اس وقت تک ملک کے سارے مرد جنگ کی بھٹی میں ڈالے جا چکے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ نوعمر لڑکے بالے اور بڑھے باپ بھی ملک کے دفاع کے لئے جبری طور پر بھرتی کئے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ملک کے کارخانوں کو چلانے کے لئے مشرقی یورپ کے ممالک سے لاکھوں انسان جبری طور پر جرمنی لائے گئے تھے۔ جس کے سبب عام طور سے یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ یہ غیر ملکی مزدور کسی وقت بھی ملک میں نراجی پھیلا سکتے ہیں۔ اس لئے حکومت کی طرف سے ایسی ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک خفیہ پلان بنایا جا رہا تھا۔ چنانچہ جن فوجی افسروں کے ہاتھ میں اس کی پلاننگ تھی، ان میں میرا ماموں بھی شامل تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایسی صورت حال پیدا ہونے پر فوج ملک کی حکومت پر قبضہ کر لے گی اور نازی پارٹی کے ان ممبروں پر الزام دھرا جائے گا، جو جنگ کے فرنٹ سے دور جرمنی میں بیٹھے ہوئے حکومت کے خلاف سازش کر رہے تھے۔"

میں نے پوچھا: "گراف فان شٹاؤفن برگ کے ساتھ کون لوگ سازش میں شریک تھے؟"

اس نے کہا: "سازش کرنے والوں میں کئی ایک سینئر فوجی افسر شامل تھے۔ جن کو انقلاب کے کامیاب ہونے پر حکومت سنبھالنی تھی۔ البتہ سوال یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھتا ہے یا دوسرے الفاظ میں ہٹلر کو راستے سے کون ہٹاتا ہے۔ ماموں ہٹلر کے ہیڈکوارٹر میں فوجی مشاورت کے اجلاسوں میں شامل ہوتے تھے، اس لئے یہ کام ان پر ڈال دیا گیا، کیونکہ ان کی تلاشی نہیں لی جاتی تھی۔ البتہ ماموں تھوڑا عرصہ قبل ایک ہوائی حملے میں بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور دائیں ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا اور بائیں ہاتھ کی بھی دو انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ اس وجہ سے بم کو شاپ کرنا ان کے لئے اتنا آسان نہ تھا۔ ان کے لئے ایک خاص زنبور اس کام کے لئے بنایا گیا تھا تا کہ وہ اپنی باقی ماندہ تین انگلیوں سے کام چلا سکیں۔ ان کو اجلاس کی میز پر ہٹلر سے کچھ ہٹ کر بیٹھنے کے لئے کرسی ملی تھی، جس کے نیچے انہوں نے اپنا بیگ زمین پر رکھ دیا تھا۔ جس میں بم کو شاپ کیا جا چکا تھا جسے چند منٹوں کے بعد پھٹنا تھا۔ اس لئے اجلاس کے شروع ہوتے ہی ماموں نے دوسرے کمرے سے ٹیلیفون کرنے کے لئے اجازت چاہی اور بیگ کو بم سمیت میز کے نیچے چھوڑ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ بلکہ وہاں سے سیدھے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے کیونکہ ان دنوں ہٹلر کا ہیڈکوارٹر برلن کی بجائے ایسٹ پروشیا کے ایک مقام پر تھا۔ جب بم پھٹا تو ماموں نے گمان کیا کہ ہٹلر اور اس کے ساتھ دوسرے سب لوگ مر گئے ہوں گے۔ جب کہ درحقیقت صرف چار افراد ہلاک ہوئے تھے، جن میں ہٹلر شامل نہ تھا۔ اگر یہ اجلاس کنکریٹ سے بنے ہوئے تہہ خانے میں ہوا ہوتا اور دھماکے کا پریشر عمارت سے باہر نہ نکل سکتا تو یقیناً سب شرکا مارے جاتے مگر اس روز کی میٹنگ ایک چوبی بیرک میں رکھی گئی تھی، جس میں بم کا دھماکا متوقع تباہی نہ برپا کر سکا۔"

میں نے پوچھا "میں نے پڑھ رکھا ہے کہ گراف فان شٹاؤفن برگ کو اسی رات تین دوسرے فوجی افسروں سمیت گولی مار دی گئی تھی اور اس کے بھائی کو ایک ماہ بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تمام اہل خانہ اور دوسرے رشتہ داروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور بچوں کو ان کے ماں باپ سے جدا کر دیا گیا تھا۔"

اس نے کہا "نہ صرف جدا کر دیا گیا تھا بلکہ ان کو نئے نام دیے گئے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ان کے ذہنوں سے اپنے خاندان کی یادداشت محو کر دی جائے اور اگر ان کو زندہ رہنے دیا جائے، تو صرف اس صورت میں کہ ان کو غیر لوگوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ نازی جرمنی کو بہت جلد اتحادی فوجوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی اور کانسنٹریشن کیمپوں کا خاتمہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں اس کے خاندان کے بہت سے افراد کی جان بچ گئی اور وہ اپنے بچوں کو دوبارہ حاصل کر پائے۔"

تھوڑے دنوں کے بعد زیگلنڈے نے بتایا کہ اس کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا تھا اور وہ کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اس خوشی میں اس کا باپ اپنے گھر پر ایک پارٹی دے رہا ہے، جس میں مجھے بھی شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔ اس سلسلے میں اسے میرے ڈاک کا پتا درکار تھا۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد مجھے چھپا ہوا دعوت نامہ مل گیا، جس میں درج تھا کہ مرد شرکا سے درخواست ہے کہ سموکنگ سوٹ میں حاضر ہوں۔ میرے پاس ایسا سوٹ نہیں تھا اور محض ایک پارٹی میں شمولیت کی خاطر میں اسے خریدنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے میں نے شامل ہونے سے معذرت کرنے کے لئے زیگلنڈے کو فون کیا۔ اسے بھی یہ بات ناگوار گزری تھی کہ باپ نے دعوت نامے میں یہ شرط رکھ دی تھی۔ اس نے کہا میرے باپ گراف روڈولف فان گرسٹن ڈورف کی جاگیر تو جاتی رہی ہے مگر جاگیردارانہ طور اطوار ابھی نہیں نکلے۔ اس نے بتایا کہ سموکنگ کرائے پر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تم اپنا قومی لباس پہن کر بھی تو آ سکتے ہو۔ اس طرح میری مشکل حل ہو گئی اور میں کالی اچکن، سفید لٹھے کی شلوار، بوسکی کی قمیص اور سر پر جناح کیپ رکھ کر حاضر ہو گیا۔

گراف فان گرسٹن ڈورف نے اس موقعے پر ایک تقریر کی، جس میں اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس شام اپنی زندگی کا ایک اہم راز کھول رہا ہے، جس کو اس نے اس وقت تک اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ اس کا تعلق اس چیز سے ہے کہ اس نے جنگ کے دوران ہٹلر پر قاتلانہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو دراصل ایک خودکش حملہ تھا۔ یہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی بات ہے جس روز جرمنی میں ہر سال پہلی جنگ عظیم میں مارے جانے والے ہم وطنوں کی یاد میں قومی ماتم منایا جاتا تھا۔ نازی پارٹی نے اس کا نام بدل کر "قومی ہیروؤں کا یادگار دن" رکھ چھوڑا تھا۔ اس زمانے میں وہ برلن میں پائے جانے والے فوجی

میوزیم کا کمانڈر تھا۔ جہاں پر دشمن سے چھینے جانے والے اسلحے کی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کا افتتاح پروگرام کے مطابق ہٹلر کو کرنا تھا۔ چونکہ اس کو ہٹلر کا استقبال کرنا تھا اور اس کو نمائش دکھانی تھی، اس لئے اس نے سوچا کہ ہٹلر کو مارنے کا یہ بہترین موقع ہوگا۔ البتہ اسے پتا تھا کہ پستول سے حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا، کیونکہ ہٹلر کے محافظ بہت چوکس ہوا کرتے تھے۔ اس لئے اس نے ٹائم بم استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس سلسلے میں یہ چیز حائل تھی کہ ٹائم کلاک کی ٹک ٹک وقت سے پہلے راز کھول سکتی تھی۔ اس کے پاس دو انگریزی مائنز تھیں، جن کو چلانے کے لئے تیزابی عمل کام میں لایا جا سکتا تھا جو بے آواز ہوتا ہے۔ مگر جس کے ذریعے مائنز کو چلانے پر دس پندرہ منٹوں کا وقفہ درکار ہوتا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہٹلر کو افتتاحی تقریر کے بعد بیس منٹوں تک نمائش دکھائی جانی تھی۔ گویا مائنز کو تیزابی عمل سے چلانے کے لئے کافی وقت مل سکتا تھا۔

ہٹلر کی تقریر بارہ منٹوں کی تھی، جس کے خاتمے پر گراف فان گرسٹن ڈورف نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی مائنز کو چلانے کی خاطر تیزابی عمل کا بٹن دبا دیا۔ مگر ہٹلر نمائش کے لئے رکھے ہوئے اسلحے کے پاس سے گولے کی طرح گزر گیا۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رکا اور تیز رفتاری سے ڈگ بھرتا ہوا میوزیم کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ گراف فان گرسٹن ڈورف کو پتا تھا کہ اس کی جیب میں رکھی ہوئی مائنز بارہ پندرہ منٹوں کے اندر پھٹ جائیں گی۔ اس لئے ضروری تھا کہ تیزابی عمل کو روکا جائے۔ چنانچہ وہ دوڑتا ہوا قریبی ٹائیلٹ میں گیا، جہاں پر اسے تیزابی عمل کو روکنے میں کامیابی ہوئی۔ اس طرح اس کا حملہ ناکام رہا۔ حاضرین محفل نے دل کھول کر گراف فان گرسٹن ڈورف کو داد دی۔ ننگلڈ نے مبارکباد دینے والوں میں سب سے آگے تھی۔ وہ اپنے باپ پر بے حد فخر مند تھی۔

☆☆☆☆☆

برسوں کے بعد مجھے جرمنی کے مرکزی فلم آرکائیوز میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں پر جنگ کے زمانے کی مختصر فلمیں محفوظ ہیں، جو ہر ہفتے ملک کے سینما گھروں میں فلم سے قبل دکھائی جاتی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے رواج پانے سے قبل ان فلموں کے ذریعے ہفتے بھر کی اہم خبریں عوام تک پہنچائی جاتی تھیں۔ میں نے آرکائیوز کے کارکن سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی فلم دکھا سکتا ہے جو فوجی میوزیم برلن میں دشمن سے چھینے جانے والے اسلحے کی نمائش کے افتتاح کے موقعے پر بنائی گئی تھی۔ منٹوں کے اندر وہ فلم نکال لایا، جس میں ہٹلر کو افتتاحی تقریر کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ معائنے کے وقت میوزیم کا کمانڈر گراف فان گرسٹن ڈورف اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ اوورکوٹ کے بغیر تھا جس کی جیب میں اس نے مائنز کو دھماکے کی خاطر رکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

(کرفیلڈ ۲۴ نومبر ۲۰۰۶ء)

O

اس پار سے نکلتا ہے اس پار کا مزا
ہوتا بہت ہے عشق میں گفتار کا مزا

ہم نے بھی دیکھ لی ہے جہاں بھر کی دشمنی
ہم نے بھی چکھ لیا ہے ترے پیار کا مزا

آنکھوں کو انتظار کی فرصت نہیں ہے جب
واجب ہے ہم پہ کب کسی دلدار کا مزا

کچھ ایسا کر چلیں کہ رہے عمر بھر نیا
اک پل میں ورنہ ختم ہے تکرار کا مزہ

تا کہ رہے نہ اس میں کسی کو بھی فوقیت
گڈمڈ کیا ہے سادہ و پرکار کا مزا

سینہ ہے جن کا نیزۂ خورشید سے فگار
پوچھو تم ان سے سایۂ دیوار کا مزا

گھر میں اگر نہیں ہے کوئی گھر کی بات طورؔ
بازار میں ہے کب کسی بازار کا مزا

کرشن کمار طورؔ

O

روشنی

مشتاق اعظمی

وہ ایک چھوٹا سا قصباتی ریلوے اسٹیشن تھا جہاں میری تقرری ہوئی تھی۔ چونکہ وہاں اسٹیشن ماسٹر ریٹائر ہو رہا تھا اس لئے مجھے فوری طور پر ڈیوٹی جوائن کر کے اُس سے چارج لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مجھے پتہ چلا کر قصباتی اسٹیشن ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی میل یا ایکسپریس ٹرین نہیں رکتی تھی۔ صرف لوکل ٹرینیں رکا کرتی تھیں۔ ملازمت ملنے کی خوشی میں میں سات گھنٹے کے تکلیف دہ سفر پر آمادہ ہو گیا۔ ٹرین جب اس چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تو میں نے ہاتھ پاؤں کھینچ کر تکان دور کی اور نل کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر اسٹیشن ماسٹر کے آفس میں داخل ہوا۔

بڑی سی میز کے سامنے کرسی پر پچپن عمر کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ایک فائل کھلی ہوئی تھی۔ جس پر اس کی نگاہیں گڑی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اسٹیشن ماسٹر مسٹر رام پرکاش سنگھ ہوں گے اس لئے میں نے بے تکلفی سے کہا.....

"سنگھ جی نمستے۔"

میری آواز سُن کر انہوں نے فائل سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بہت خوش اخلاقی سے کہا....

"ہاشمی صاحب آداب! میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے آپ کچھ کھا پی کر تازہ دم ہو جائیں تو میں آپ کو چارج دے دوں۔"

مجھے کرسی پر بٹھا کر سنگھ جی بکنگ کلرک سے مخاطب ہوئے جو مسافروں کے لئے ٹکٹ کاٹ رہا تھا.....

"رنجن بابو! ہاشمی صاحب نئے اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے چارج لینے کے لئے آگئے ہیں۔ آپ ٹکٹ کاٹ کر ذرا کینٹین میں ان کے لئے چائے ناشتے کے لئے کہہ دیجئے گا۔"

بکنگ کلرک نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور وہیں سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر اُس کے سلام کا جواب دیا۔

ٹکٹ کاٹ کر رنجن بابو باہر گئے اور جلد ہی اپنے ساتھ کینٹین کے لڑکے کو لے کر آ گئے۔ اُس نے دو طشتریاں میز پر سجا دیں اور چائے لانے کے لئے چلا گیا۔

ایک طشتری میں بڑے سائز کے چار گلاب جامن اور دوسری میں چار سموسے تھے۔ رنجن بابو نے پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس لا کر میز پر رکھ دیا۔ سنگھ جی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور شائستہ لہجے میں کہا....

"شوق فرمایئے۔"

اُن کے لہجے کی شائستگی نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ یوپی کے ہوں گے لیکن اس وقت میں نے اس سلسلے میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ صرف اس بات پر اصرار کیا کہ وہ اور رنجن بابو بھی ناشتے میں شریک ہو جائیں۔ ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کینٹین بوائے چائے لے کر آ گیا۔

چائے پی لینے کے بعد رنجن بابو بکنگ کاؤنٹر پر جا بیٹھے اور میں نے سنگھ جی سے تمام ضروری باتیں سمجھ کر اُن سے چارج لے لیا۔

"صاحب! آج آپ میرے مہمان ہیں اس لئے رات کا کھانا ہم لوگ ایک ساتھ کینٹین میں کھائیں گے۔ کل صبح کا ناشتہ بھی آپ میرے ہی ساتھ کریں گے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں کوارٹر کی چابی آپ کے حوالے کر کے اپنے بال بچوں سے ملنے کے لئے الٰہ آباد روانہ ہو جاؤں گا۔"

سنگھ جی نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا.....

"سنگھ جی! آپ تو میرے ساتھ اس اپنائیت سے پیش آ رہے ہیں جیسے ہم دونوں ایک ہی ماں کی سنتان ہوں!"

"ہاشمی صاحب! ایک ہی دھرتی پر جنم لینے کے ناطے ہم دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہی تو ہیں۔ وہ تو مفاد پرست سیاسی بھیڑیے ہیں جو گدی کے لالچ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے اور کٹواتے رہتے ہیں!"

سنگھ جی کے اس اعلیٰ خیال نے مجھے ان کا اور گرویدہ کر دیا۔

انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ رات کو آ کر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے جب آخری لوکل ٹرین جا چکی ہوگی۔

دوسرے دن سنگھ جی کوارٹر کی چابی میرے حوالے کر کے مجھ سے رخصت ہو گئے۔

نئی مصروفیتوں میں گھر کر میں تین دنوں تک آفس سے کہیں نہیں گیا۔ چوتھے دن جب اپ اور ڈاؤن کی ٹرینیں چلی گئیں تو رجن بابو سے کہہ کر میں اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکلا۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک ریٹائرڈ ٹیچر جعفری صاحب کے نام ایک خط دیا تھا جن کا مکان اسٹیشن سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

اسٹیشن کے گیٹ ہی پر ایک تانگہ مل گیا جس پر پہلے ہی سے تین مسافر سوار تھے۔ سات آٹھ سال کی ایک بچی بھی تانگے والے کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیوں بھئی تانگے والے! کیا ماسٹر جعفری صاحب کو جانتے ہو اور کیا مجھے وہاں تک پہنچا دو گے؟" میں نے تانگے والے سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں صاحب! آیئے بیٹھئے۔ میں ان سواریوں کو ان کے ٹھکانوں تک چھوڑ کر آپ کو ماسٹر صاحب کے گھر تک پہنچا دوں گا۔" اُس نے گھوڑے کی لگام پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

میرے سوار ہوتے ہی اس نے لگام ڈھیلی چھوڑ کر گھوڑے کو قصبے کی ناہموار کچی سڑک پر دوڑانا شروع کیا۔

راستے میں جب تینوں سواریاں اپنے ٹھکانوں پر اتر گئیں تو میں نے دیکھا کہ سات آٹھ سال کی وہ معصوم سی بھولی بھالی بچی اب تک تانگے والے کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی جسے میں نے پہلے کسی مسافر کی بچی سمجھا تھا۔ بچی لال فراک پہنے ہوئے تھی اور اس کے بالوں میں بھی لال ہی رنگ کا ربن بندھا ہوا تھا۔

"بھئی تانگے والے! یہ بچی کون ہے؟"

میں نے اپنی حیرت دور کرنے کے خیال سے تانگے والے سے سوال کیا.....

"یہ میری بچی ہے صاحب۔ روشنی!"

تانگے والے نے پیار سے اُس بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھائی میرے! ابھی تو اس بچی کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں اور تم اس طرح سے اپنے تانگے میں لیے لیے پھر رہے ہو؟"

"اسکول میں پڑھتی ہے صاحب! آج چھٹی ہے اس لئے تانگے پر بیٹھ کر چاروں طرف کی سیر کر رہی ہے۔"

میں اُس سے کچھ اور پوچھتا کہ ایک جگہ اچانک تانگہ رُک گیا۔

"جعفری صاحب کا مکان آ گیا صاحب!" تانگے والے نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سامنے پرانے زمانے کا ایک چھوٹا سا پختہ مکان تھا جو گزرے دنوں کی داستان سنا رہا تھا۔ میں نے تانگے والے کو پیسے دے کر رخصت کر دیا اور آگے بڑھ کر جعفری صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے دروازہ کھول کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں نے چند روز قبل یہ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے یہاں ڈیوٹی جوائن کی ہے۔ آپ کے دوست اکرام صاحب نے یہ خط دیا ہے۔"

میں نے انہیں سلام کر کے خط ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر بہت گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ سے خط لے کر مجھے گھر کے اندر لے جا کر بٹھایا۔ خط پڑھ لینے کے بعد انہوں نے اپنے لڑکے کو آواز دے کر بلایا اور اُسے چائے لانے کے لئے کہا۔

چائے پینے کے دوران ہم دونوں ادب اور ملک کے موجودہ سنگین حالات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ جعفری صاحب نے اپنی بات چیت سے مجھے متاثر کیا لیکن چونکہ دوسری ٹرین کے آنے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے میں ان سے اجازت لے کر پیدل ہی اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس طرح قصبے کی سیر بھی ہو گئی۔

قصبہ کیا تھا نیم شہر تھا۔ مکانات قدیم طرز کے تھے۔ مکانوں کے اندر دکانیں نکالی گئی تھیں .... کہیں آٹے کی چکی تھی، کہیں کوئی دھوبی کپڑوں پر استری پھیر رہا تھا، کہیں حلوائی کی دکان تھی، کہیں غلے کے ڈھیر لگے تھے اور کہیں چھوٹا موٹا جنرل اسٹور تھا۔

میں چلتے چلتے ایک جگہ ٹھٹکا۔ وہاں ٹوکری میں امرود لئے ایک ادھیڑ عمر کی عورت بار بار ہانک لگا رہی تھی....

"امرود لے لو.... الٰہ آباد کے امرود.... پیلے پیلے.... میٹھے میٹھے امرود۔"

میری آنکھیں یقیناً دھوکا نہیں کھا رہی تھیں کیونکہ وہ بچی روشنی

جسے میں نے ایک گھنٹہ قبل تانگے والے کے ساتھ دیکھا تھا اور جسے اُس نے اپنی بیٹی بتایا تھا اب امرود والی کی پشت پر سوار تھی اور امرود والی اپنے جسم کی جنبش سے اُسے پیار سے جھولا جھلا رہی تھی۔ تانگے والی بچی اور اس بچی میں اگر کچھ فرق تھا تو صرف یہ کہ پہلے وہ لال فراک پہنے ہوئے تھی اور اس وقت اُس کے جسم پر سبز رنگ کا فراک تھا اور بالوں میں ربن بھی سبز ہی رنگ کا تھا۔

میں نے امرود والی سے ایک کلو امرود لیے اور قیمت ادا کرتے ہوئے پوچھ بیٹھا.... "کیا یہ تمہاری بیٹی ہے....؟!"

میرے سوال پر اُس نے ایک ایسی مسکراہٹ سے جس میں بچی کے لئے پیار کا بے پناہ جذبہ تھا دیکھا اور کہا....

"ہاں بابوجی! یہ میری دلاری بیٹی کرن ہے!"

رُوشنی....! کرن....! میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور میں امرود تھیلے میں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

کوئی دو مہینے گزر گئے۔ میں اس عرصے میں اپنے گھر نہ لوٹ سکا کیونکہ گھر آنے کے لئے کئی روز کی چھٹیاں درکار تھیں اور نئی ملازمت میں ابھی ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس عرصے میں ماسٹر جعفری صاحب نے ایک دن میری ملاقات وہاں کے ایک رئیس سکندر خاں سے کرادی۔ وہ بڑے خوش اخلاق اور با ذوق آدمی نکلے۔ بات بات پر قہقہے، غالب کا پورا دیوان ازبر، ہر موقع پر غالب کے شعر کا حوالہ میں فن سے مل کر بہت خوش ہوا اور وہ غیر مانوسیت جو نئی جگہ جا کر ہوتی ہے سکندر خاں صاحب سے مل کر دور ہوگئی۔

ایک بار سکندر خاں صاحب کے یہاں ایک تقریب تھی۔ وہ اپنے حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت نامہ دینے کے لئے اپنی حویلی سے چل کر خود اسٹیشن آئے اور مجھ سے شرکت کا وعدہ لے کر واپس گئے۔

تقریب کے دن میں فن کے یہاں وقت پر پہنچ گیا۔ پوری حویلی رنگین قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔

میری آمد کی خبر سن کر خان صاحب جلدی سے باہر آئے۔ انہوں نے بلا تکلف مجھے سینے سے لگالیا۔ ایک زوردار قہقہے کے ساتھ غالب کا مصرع "وہ آئیں گھر میں ہمارے" کہا۔ پھر وہ اپنے وسیع ڈرائینگ کمرے میں لے گئے۔ میز پر کانچ سے بھری طشتری رکھی تھی۔ خان صاحب نے اسے میری طرف بڑھا دیا پھر انہوں نے ملازم کو آواز دی اور چائے لانے کے لئے کہہ کر میرے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے۔

ابھی مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہی بچی جسے میں نے روشنی اور کرن کے نام سے جانا اور پہچانا تھا اچانک زرق برق غرارے اور جمپر میں ملبوس دوسرے دروازے سے نمودار ہوئی اور بڑی بے تکلفی سے خان صاحب کی گود میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی کبھی پیار اور شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

میں اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا اور تقریباً ہکلاتے ہوئے اُن سے پوچھ بیٹھا.... "خان صاحب! یہ.... یہ.... بچی!؟"

"شمع میری بیٹی!"

خان صاحب نے یہ کہہ کر حسبِ عادت ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہہ تھما تو یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور بچی سے بولے "بیٹی تم اندر جاؤ۔"

بچی جب اندر چلی گئی تو انہوں نے اپنے آپ پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا....

"لگتا ہے اس بچی کو آپ نے کہیں اور بھی دیکھا ہے ضرور دیکھا ہوگا لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے...."

"سنیے....!"

ہمارے گاؤں کا ایک چوکیدار تھا، بے حد وفادار اور فرض شناس اس کا نام دھرم داس تھا۔ یہ بچی اُس کی بیٹی ہے۔ اس بچی کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی۔ ماں اسے جنم دیتے ہی مر گئی اور کچھ دنوں کے بعد چوکیدار دھرم داس ڈاکوؤں کے ساتھ تصادم میں مارا گیا۔ ایک رات ڈاکو قصبے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دھرم داس نے اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو چوکنا کر دیا اور ڈاکوؤں کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

چوکیدار کی لاش آئی تو قصبے کے تمام لوگ خون آلود لاش کے گرد جمع ہو گئے۔ چوکیدار دھرم داس کی المناک موت کا صدمہ گاؤں کے تمام لوگوں کو تھا لیکن اس سے بڑے صدمے کی بات یہ تھی کہ اس کی بچی بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔ لوگ اُسے تھام رہے تھے اور وہ بار بار لوگوں کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا کر اپنے باپ سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس دردناک منظر پر ہر ایک کا دل تڑپ اُٹھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب قصبے کے ہر فرد نے جس میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، اس بے سہارا بچی کی حفاظت کا عہد کیا۔

اُسی وقت سے یہ بچی پورے گاؤں کی بیٹی ہے.... یہ کہیں روشنی ہے، کہیں کرن ہے اور کہیں شمع!"

☆

چار دِن

ترنّم ریاض

گاڑی کے قریب پہنچتے ہی نہایت خوبرو اور خاصے تنومند نبیل کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، بلکہ ہونٹوں سے اٹھ کر سرخ و سفید چہرے پر سیاہ
چمکیلا حاشیہ بناتی داڑھی مونچھ پر سے پھسلتی ہوئی، سیدھی اوپر جا کر آنکھوں کی
پتلیوں میں تھرکتی، شانے تک بڑھ جانے والے لمبے بالوں میں لہرانے لگی۔ اس
نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا اور ڈرائیونگ سیٹ کے قریب سے بڑی سی زرد
گیند جس پر سیاہ حاشیوں والے پنج کونے خانے بنے تھے، دوسری طرف
اچھال دی جسے کرکٹ کی گیند کی طرح کیچ کر کے نو سالہ روحی زور سے ہنس پڑا
۔ پھر نبیل نے چھت کے اوپر سے لمبی بانہہ آگے کر کے اس کے بڑھے ہوئے
ننھے سے ہاتھ کو بزرگی معانقہ چھونے کی ناکام کوشش کی۔ روحی نے دُبلی سی کمر
کے بائیں اور کے خم میں سے گیند اٹھا کر دائیں جانب دھری اور پنجوں کے بل کھڑا
ہو کر بائیں ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ اتنے میں قدموں کے زور زور سے پڑنے کی
آوازیں آئیں تو دونوں ہنستے ہوئے سر گھما کر دیکھنے لگے۔ اکمل اور نکھل کسی
کی کامیاب نقل اتارتے کھلکھلاتے کے جوتے پہنے، لمبے لمبے موزے چڑھائے ان کی
طرف آرہے تھے۔ اکمل اپنے بارہ سالہ بھائی سے دو برس بڑا تھا۔ اس نے
لپک کر روحی کو اوپر اٹھایا اور نبیل سے ہاتھ ملا کر باغ باغ ہو گیا۔ اس وقت
تک کرن بھی ہانپتا ہوا پہنچ گیا۔

"یار۔۔۔ سوری۔۔۔ لیٹ ہو گیا۔"

اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر ذرا جھجکتے ہوئے اپنے دس سالہ مگر
پچاس کلو وزنی بدن پر روزانہ دیر سے آنے کے باعث طاری گھبراہٹ کو اپنی
جانب سے عام لہجے میں چھپانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے یار۔۔۔ تُو تو۔۔۔"

نبیل بھی اس کے لہجے کا بھرم رکھ کر ہم عمر دوستوں والے انداز میں
بولا۔ پھر ربڑ کا چھلا (جو اس نے ماں کی سنگھار میز سے اٹھایا تھا کہ یہ چھلا سیاہ
کپڑے میں بنا گیا تھا اور عام ربڑ کے چھلوں کی طرح بال کھینچ کر توڑتا
نہیں تھا اور لڑکیوں کے استعمال کے عام چھلوں سے قدرے بڑا تھا اس لئے
کوئی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس نے زنانہ چھلا بالوں میں پہن رکھا ہے)
شہادت کی انگلی کے گرد سے نکال کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور بالوں کو اس میں
پرونے لگا۔ بال پونی ٹیل کی صورت اس کے چوڑے شانوں کے بیچ لہرا
گئے۔

"اب کے پھر چھوٹے کزنوں کا پال۔۔۔ بہت ہو گیا ٹینشن
یار۔۔۔" اس نے گاڑی سٹارٹ کی۔

"نہیں بھیا۔۔۔ ابھی کچھ اور دن رہنے دیجئے نا۔۔۔ اتنے اچھے
لگتے ہیں۔۔۔"

نکھل نے باقی لڑکوں کی طرف دیکھا۔

"سچ۔۔۔؟" اس نے تائید چاہی۔

"ہاں بھیا۔۔۔" اکمل نے زور دیا۔

"آپ پیارے لگتے ہو۔۔۔" روحی مسکرایا۔

"وہ تو میں ویسے بھی لگتا ہوں۔۔۔"

نبیل نے قہقہہ لگا کر گردن موڑی اور سب کے چہروں کو دیکھ کر کہا
تو چھوٹی سی ٹیم بھی قہقہے لگانے لگی۔

بے سبب کی خوشی ان کے چہروں سے چھلکے پڑتی تھی۔ نبیل نے ونڈ
سکرین پر لگے چھوٹے سے آئینے میں ان کے چہروں پر ایک اور نظر ڈالی تو اس
کے چہرے پر کئی مزید لمحے تک مسکراہٹ چھلکتی رہی۔

انجن کی آواز بلند ہوئی۔ گاڑی کے نیچے لیٹا کچھ کچھ سیاہ ہو چکا
چھوٹا سا بھورا کتا باہر آ گیا اور دم ہلاتے ہوئے بڑی بڑی سیاہ اور پیار سے لبریز
تھرکتی ہوئی کالی پیلی پتلیوں سے گاڑی کی کھڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ گاڑی چلی، وہ
پیچھے دوڑا اور کچھ دور جا کر لوٹ آیا۔ گیا وداع کرنے گیا ہو۔ پچھلی نشست
پر بیٹھے کرن نے مسکرا کر اس کی چھٹی ہوئی وفادار دم کو ایک نظر دیکھا اور سامنے کی
اور پلٹ کر مزید کئی لمحے مسکراتا رہا۔

کتا وہیں اسی مقام پر پلٹ آیا کہ جہاں پہلے صبح جب گاڑی کھڑی تھی
تو پانی کا گاڑی کے نیچے کی پختہ گیلی زمین کو اچھی طرح سیراب کر گیا تھا۔
اور مئی کی تپتی گرمی کی اس صبح میں بھورے رنگ کے کچھ کچھ سیاہ
اور شب بیداری سے تھکے کو آرام کرنے کے لئے فی الحال اس سے زیادہ
آرام دہ جگہ دوسری نظر نہیں آئی۔ وہ زمین پر پڑے گاڑی کے کھونٹے کی طرح
چاروں ٹانگیں پھیلائے معصومیت سے پلکیں جھپکاتا رہا۔

برآمدے کے جنگلے سے لگی نیلوفر گاڑی روانہ ہو جانے کے دو ایک
منٹ بعد تک وہیں ایستادہ رہی پھر پلٹ کر کرسی پر آ بیٹھی۔ ننھوں سے تنگ تنگی
گول میز پر لگے گول کانچ پر رکھا چینی کا بڑا سا مگ انگلی کے پوروں سے چھوا۔
چائے ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ چلئے کچھ کام تو ہوا اس گرم صبح کا۔ چائے
کی شوقین نیلوفر نے اطمینان سے مگ ہاتھ میں لے کر چسکی لگائی۔ ایسا کرنے
سے اس کی گردن اوپر کو ہو گئی۔ گلاب کا درخت گول گول سرخی مائل سبز پھلوں سے لد
گیا تھا اور پتوں جیسے سبز رنگ کے پروں والی ایک چھوٹی سی چڑیا شاخوں میں
اِدھر اُدھر اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے پر اتنے چکنے تھے جیسے کسی نے موقلم سے
دیوار پر روغن کیا ہوا جیسے کوئی پلاسٹک سے بنا پرندہ ہو۔

دُھلی گاڑیوں کا پانی بہہ کر کنارے کے دو ایک چھوٹے چھوٹے

گڈھوں میں جمع ہوگیا تھا ۔ وہاں ایک کوا پانی پی رہا تھا ۔ ہوا چلنے سے اس کی گردن کے پروں میں بھنور سا پڑ جاتا تھا۔

کہیں سے بادلوں کی گرج کانوں میں پڑی۔ نیلوفر آسمان کی جانب دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ پانی کا ایک موٹا سا قطرہ اس کے پاؤں پر گرا۔ اس کے چہرے پر حیرت بھری خوشی چھا گئی۔ ہونٹوں پر ایک پرسکون سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے دونوں پاؤں پھیلا کر دوسرا پیر بھی بھیگنے کے لئے آگے کر دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ پل ایسے ہی بیت گئے۔ شاید بہت سے پل، کہ جب آنکھیں کھول کر وہ اپنی نشست سے کھڑی ہوئی تو اس وقت تک پوری گلی جل تھل ہو چکی تھی۔ نیم کے پیڑ کے نیچے آنے والے راستے پر ہوا سے بکھری بیشتر پیلی پیلی ٹولیاں سرسوں کے پھولوں سی لگ رہی تھیں اور پلاس کے بڑے بڑے باوقار، حسین اور کئی روز سے لٹکے ہوئے سرخ پھولوں کو اب موقع مل گیا تھا کہ وہ پتلی لمبی ڈنڈیوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے راستے پر بچھنے کے لئے آزاد ہو جائیں۔

نیلوفر نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان لمحوں کے اندر کئی اور تبدیلیاں بھی ہو چکی تھیں۔

بری بری تبدیلیاں، کہ درختوں کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ نیم کے چکیلے پتوں کی ہریالی دھل کر روشنی منعکس کرنے سے ہلکی ہری نظر آتی تھی۔ چنبیلی کا گہرا ہوا سبزہ گھنی شاخوں کے درمیان پہنچتے پہنچتے سیاہی مائل ہرا ہو جاتا تھا ۔ گلاب کے پتے بھیگ کر مخمل کی ہرے نظر آنے لگے تھے اور گھاس کچھ سکڑتی ہوئی سی ہری، جو نیم کے پتوں سے کچھ گہری اور چنبیلی کے پتوں سے کچھ ہلکی ہری تھی۔

کنکریٹ کی گلی فاسٹی سڑک پر پانی کی بیشتر لکیروں کے عقب سے نالوں میں پھنس کر راستے کا حصہ بن چکے رنگ برنگے کنکر دھل دھل کر شفاف ہو گئے تھے نہائی ہوئی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑی سکون سے بھیگ رہی تھیں۔ اور یہ نظارہ اس وقت تک ویسے ہی حسین رہنے والا تھا جس وقت تک بارشیں یوں ہی یکسوئی سے برستی رہنے والی تھیں اور کوئی منظر کو بد لنے کے لئے راستے سے گزرنے والا نہ تھا۔

کوا (غالباً بہت سا پانی پینے اور نہا تا ہوا بھیگنے کے لئے) کہیں اڑ چکا تھا۔

نیلوفر کی نگاہیں ہوا دار درختوں میں بھٹکنے لگیں تو مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ ہرے سبز پتوں میں گھنی سیاہ داڑھی سے لگے سرخ سخت منہ لبوں کے ساتھ موتی سی قطار لیے وقت نہیں پڑے۔ سیاہ سیاہ پتلیاں جو اکثر سنجیدگی کے زیر اثر نظر آتیں چمک چمک کر مسکرا اٹھیں۔ نیلوفر کے لبوں پر مسکراہٹ واضح ہو گئی لیکن پیشانی پر کچھ لکیریں بھی ابھر آئیں۔

اتنی مشابہت ۔ وہی چوڑے اور پشت پر ہلکی سی گولائی لئے

ثنا نے ویسا ہی صاف رنگ لیکن کھیل کود میں دلچسپی کے باعث نکھرا اور سرخی مائل۔ مگر ناک پر یہ غصہ۔ مرضی کے خلاف کچھ ذرا ہو جائے تو آسمان سر پر اٹھا لے۔ کلاس کے کانچ کی شفافیت میں دھندلا پن نظر آئے تو لازم کہ سر ہو جائے۔۔۔ اس کی عدم موجودگی میں کوئی اُس کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کرے تو طوفان کھڑا کر دے۔

مگر دل ہیرے کی کنی سا صاف۔ کولونی کے بچوں کا دوست، کپتان، استاد، لیڈر اور جانے کیا کیا کچھ کہ جس سے وہ محبت بھی کریں اور جس کا ان پر رعب بھی ہو۔

مگر وہ۔۔۔ کیا وہ بھی نبیل کی طرح صاف دل تھا۔۔۔ کو کہ نبیل کی ہی طرح ہر معاملے میں اپنی ہی کرنے والا۔

''نیلی! تم یہ حساب کتاب چھوڑو۔۔۔ اور مجھ سے شادی کر لو۔''

جمیل نے ایک دن حساب پڑھنے آئی اپنے والد کے دوست کی بیٹی سے وقتاً کہا تھا اور قلم پر ڈھکن لگا دیا تھا۔

''کیوں بیا ذرک سا سر کھپا کھپا کر خود کو کمزور کر رہی ہو۔''

اس نے نیلی کا سر داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہلایا اور بائیں سے حساب کی کھلی کتاب بند کر دی۔

''کیا کہہ رہے ہیں سر۔۔۔ میرا سر کمزور ہے یا آپ کا پڑھانے میں دل نہیں لگتا۔''

جمیل سے کوئی چار برس چھوٹی نیلی نے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

''میرا دل نہیں لگتا یا تمہارے دماغ میں حساب سماتا ہی نہیں۔۔۔ یہ تم جیسے 'رف اینڈ ٹف ' لڑکوں کا کام ہے۔۔۔ تم دھان پان سی لڑکی۔۔۔ ہوم سائنس پڑھو۔ لٹریچر پڑھو، موسیقی پڑھو ، سائکولوجی پڑھ لو، اور شادی کے لئے ہاں کرنے کا فیصلہ کر لو تو۔۔۔ ویسے بھی تم سے شادی کرے گا کون۔۔۔ تم سودے سلف کا حساب، دھوبی یا دھوبن کا حساب، بچوں کی فیس وغیرہ کا حساب تک رکھ نہیں پاؤ گی۔۔۔ ایسی صورت میں شوہر کا ریاضی داں ہونا نہایت ضروری ہو جاتا ہے اور میرے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔''

جمیل نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور کمال سنجیدگی سے نیلی کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا 'بی۔اے' یعنی 'چارٹرڈ اکاؤنٹنسی ' پورا ہونے ہی والا ہے اور ویسے بھی گھر والے میرے لئے لڑکی تلاش کرنے ہی والے ہیں ۔ اور میں ان سے تمہارے بارے میں کہنے ہی والا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ اور تم ہاں کرنے ہی والی ہو۔''

نیلی نے کچھ لمحے اس کی بات سمجھنے میں لگائے اور پھر ہنس پڑی۔

''آپ تو سر۔۔۔ ایک تو میں اتنی رومینٹک کرتی ہوں آپ کی اور

آپ ہیں کہ گھر والوں کے رشتے پر دھیان لگانے پر تلے ہیں۔"
نیلی نے سنجیدہ شکل بنالی۔
"اور دوسرے آپ کا رنگ گورا ہے۔"
نیلی نے حساب کی کتاب کھول کر وہ ورق سامنے کیا جس سے کچھ
دیر قبل کام ہو رہا تھا۔
"مطلب۔۔۔؟ رنگ گورا ہونا جرم ہے کیا۔ تمہارا تو مجھ سے بھی
زیادہ ہے۔"
جمیل نے کتاب دوبارہ بند کر کے ہاتھوں میں تھام لی۔
"اسی لئے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ کسی سانولے لڑکے سے
نسبت آئے گی تو ہاں کروں گی۔ مجھے اپنا رنگ بالکل پسند نہیں۔"
"اتنی بی بے تمیز۔"
جمیل نے سر ہلاتے ہوئے آواز باریک بنا کر نقل اتاری۔
"آج سے دعا کروں گا کہ تم کو ایسا شوہر ملے کہ پتہ ہی نہ لگے کہ چہرہ
کہاں ختم ہوا اور بال کب شروع ہوئے۔ وہ تمہاری طرف دیکھ رہا ہو اور تم کچھو
پیٹھ موڑ کر بیٹھا ہے۔ کافر نعمت۔۔۔ ناشکری لڑکی۔۔۔ محسن کش۔۔۔ میں تو
تمہارے بھلے کی کہہ رہا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ تم ہو کہ۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے۔۔۔ پھر نہ
کہنا آخری بار نہیں پوچھا۔"
جمیل اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ انگلی رخسار پر دھرے گویا کچھ
سوچ رہی ہو۔ کچھ لمحے خاموشی سے گذر گئے۔
"اب کچھ کہو بھی نیلی۔۔۔"
جمیل کی آواز میں ہلکی سی سنجیدگی گھل گئی۔ نیلی نے سر اٹھا کر اس کی
آنکھوں میں دیکھا۔
نیلی نے اسے جو کہا تھا سچ کہا تھا۔ خوش مزاج ہونے کے باوجود
جمیل کے گورے رنگ اور کچھ بھاری تھے نے اسے اس انداز سے اپنی طرف
متوجہ نہیں کیا کہ نیلی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال آتا۔ مگر ایک انسان
کے ناطے اس کی جمیل کے بارے میں اچھی رائے تھی۔ اس وقت اچانک جمیل
کو سنجیدہ محسوس کر کے وہ کچھ سوچتی سی کافی دیر ایسے ہی اس کی جانب دیکھتی رہی۔
پھر سر جھکا کر ایک نظر فرش کی طرف ڈالی اور ذرا اوپر دیکھا۔
"اور اگر آپ کی مونچھ ہوتی نا۔۔۔ تو۔۔۔"
وہ کچھ لمحے خاموش رہی پھر بغیر مسکرائے دبی دبی شوخی سے بولی۔
"تو۔۔۔؟ تمہاری خاطر بھی نہ منڈواتا۔۔۔"
جمیل نے آواز اونچی کر کے گویا سنجیدگی سے کہا۔ نیلی کو ہنسی آ گئی۔
" نہیں وجاہت نہیں۔۔۔ اس صورت میں۔۔۔ میں۔۔۔ شاید کچھ
سوچ سکتی تھی۔"
"بس۔۔۔؟ رکھ لی مونچھ۔۔۔ داڑھی بھی رکھنا ہو گی آقا؟"

اس نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔
"نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ پر اچھی نہ لگے۔۔۔ اور۔۔۔ میرا ارادہ
پھر بدل۔۔۔"
"نہیں کوئی ارادہ ورادہ نہیں۔ میں جا رہا ہوں ڈرائنگ روم میں
۔۔۔ تمہارے ڈیڈی سے رشتہ مانگنے۔ وہ وہیں بیٹھے ہیں اس وقت پاپا کے انتظار
میں۔۔۔ تم۔۔۔ تم مذاق سمجھتی ہو؟"
وہ اٹھا اور سچ مچ ہی ڈرائنگ روم میں جا گھسا اور نیلی دیکھتی کی
دیکھتی رہ گئی۔
زندہ دل حسین نیلی بڑی دلنواز اور ناز بردار بیوی ثابت ہوئی۔
مگر جمیل اچھا شوہر نہ بن سکا۔ شادی کے سال بھر بعد ہی دوسرے شہر سے آئی اپنی
چچازاد کے ساتھ تقریباً ہر شام گزارنے لگا۔ سنگھار میز پر نہایت مہنگی تیز
خوشبوئیں اور عمدہ شیمپو جمع ہونے لگے۔ غسل خانے سے پہروں گنگنانے کی
آوازیں آنے لگیں۔
نیلی کے ساتھ اس کا دوستانہ سا سلوک خاموشی سے رشتے میں بدل
گیا۔ ویسے عام طور پر اس کے شب و روز میں کوئی خاص تبدیلی بھی رونما نہیں
ہوئی۔ بس وہ زیادہ خود میں گم معلوم ہوتا۔
نیلی نے یہ تبدیلی شدت سے محسوس کی تھی۔
جب وہ کبھی کبھی بلا سبب مسکرایا کرتا تو نیلی سکڑ کر بھول سا جاتی
تھی۔
وہ بچے کو باپ سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے گھر نہیں
توڑا۔ وہ اداس رہی۔ اس نے موسیقی نہیں سنی۔ اس نے نئے ملبوسات نہیں
خریدے۔ اسے بے فکر نیند نہیں آئی۔
وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے سے بڑی بڑی باتیں کرنے لگی۔
"آپ کو پتہ ہے بیٹا۔۔۔ ماما کتنی اپ سیٹ رہتی ہیں۔"
وہ اس کے بال سنوار رہی تھی۔
"ہاں پتہ ہے۔"
ہاں کہتے وقت اس نے سر کو بالکل خم نہ کیا مبادا ماں کو دوبارہ مانگ
نکالنی پڑے۔
"کیوں ہیں ہم اپ سیٹ۔۔۔"
وہ اس کی ٹھوڑی تھام کر کانوں کے پاس نرمی سے کنگھا کرنے لگی۔
"اس لئے کہ پاپا کا اپنی کزن سے افیئر چل رہا ہے۔"
وہ سامنے کے گرے ہوئے دو دانتوں کے خالی مقام سے 'ا
فیئر' کی 'ف' پر زور لگا کر بولا۔ نیلی زمین پر اس کے قد کے برابر بیٹھی
حیران سی دیکھتی رہ گئی۔
"اس لئے نا۔۔۔"

اسے بغیر کسی تجسس کے کیا گیا اظہار کہا جا رہا ہے۔ نیلی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اسے گود میں اٹھا لیا اور ٹہلنے لگی۔ وہ اس کی گردن میں بانہیں پروئے، کمر کو ٹانگوں سے جکڑے، قدموں کی رفتار کے ساتھ کمرے میں بدلتی چیزوں کو دیکھا کیا۔

ننھی سی ٹھوڑی کا ننھا سا دباؤ بغلی کے بچلے سے گڑھے میں محسوس کرتی نیلی اس کے پھول سے جسم کا بوجھ سنبھالے، کروٹ بدلتا گردو پیش واقع ہوتا، خود اعتمادی سے کسی کام میں لگ جاتی۔ گویا ایک ہمراز پا کر دل کو قدرے بہتر محسوس کرتی۔

مگر ہمر د صاحب بڑے سو دائی واقع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ننھے ننھے سوالوں میں الجھے ماں کے اندر کی بہتر دہری کو کھاس تک نہ ڈالتے اور نیلی ایسے میں پیلی پڑ جاتی۔ خود ان کے بھی کچھ عجیب سے شکے ہوا کرتے جو عمر کے ساتھ بدلا کرتے۔ اور عمر تھی کہ تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

"ماں ـــ میں یہاں ہوں نا آپ کے پاس ـــ"

سکول کی کتاب سے سر اٹھایا گیا۔

"جی ہاں ـــ اور کیا میری جان ـــ"

"بس میں صرف یہاں ہی ہوں یا ـــ اور بھی کہیں ہوں ـــ"

وہ چنچل والے ہاتھ کی بند انگلیوں سے، ماتھے پر آرہے بالوں کو سر کی جانب سنوارتے ہوئے نہایت چمکیلی سیاہ پتلیوں والی گہری گہری آنکھوں سے پل بھر کے لئے نیلی کو دیکھ کر پوچھا گئے۔

"یعنی ـــ اور کہیں؟ ـــ اور کہاں؟"

ممتا کی تشویش بھری صدا ابھری۔

"کہیں بھی ـــ سکائی پر ـــ کوس موس میں ـــ اوزون کے پاس ـــ سپیس میں ـــ ٹائم کے بعد ـــ یا ـــ ٹائم سے پہلے ـــ"

سوال عام سے انداز میں کیا گیا اور سر پھر کتاب پر جھک گیا۔

نیلی کرسی سے نیچے کو آویزاں بکر میں چھپی پتلی پتلی مگر کچھ لمبی ہو چکی ٹانگوں کی مسکین پنڈلیوں کو دیکھتی حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔

یہ چھوٹی سی عمر اور یہ بڑوں سے بھی کچھ اُدھر کے سوال۔

یہ دبلی سا جسم اور یہ پہاڑی باتیں۔

وہ سر جھکا کر پھر ہوم ورک کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اور نیلی اسے دیکھتی ہوئی سوچوں میں غرق سی ہو گئی۔

اس ضرورت سے زیادہ حساس اور معصوم ذہن کو والدین کے باہمی تعلق سے بچانا ہوگا۔ آگے چل کر وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تو؟

اسے تو ماں اور باپ دونوں ہی مکمل چاہئیں۔ ورنہ یہ جواب کھوجنے والا دل جواب نہ پا کر پریشان ہو جائے گا۔

نیلی کتاب پر جھکے چہرے کو دیکھتی رہی۔

چھوٹا سا دانشور۔ پڑھتا کچھ اور سوچتا کچھ اور ہے۔

سارا فساد ہی لاجواب سوالوں کا ہے۔

خود نیلی بھی بچپن میں عجب سوال کرنے پر خاندان بھر کے بچوں میں مذاق کا نشانہ بنا کرتی۔ ایسے ہی اس کے سوالوں کا بھی کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہوا کرتا۔

'بابا جب دنیا نہیں تھی تو ـــ تو کیا تھا ـــ'

'کیا تھا ـــ کچھ نہیں تھا'

فورمز آفیسر صاحب فوراً ہی جواب دیتے۔

'اور ـــ کچھ نہیں ـــ سے پہلے؟'

بابا صرف ایک نظر اسے دیکھتے اور دوبارہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو جاتے۔ مثلاً اخبار پڑھنا یا فون پر بات کرنا یا کچھ ویسا ہی۔

'بابا ـــ جب دنیا ختم ہو جائے گی ـــ تو کیا رہے گا؟'

بابا بڑی خود اعتمادی سے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات طاری کر دیتے جیسے اس وقت کیا کرتے جب نیلی نے الٹے جوتے پہن رکھے ہوں۔

'بابا ـــ جہاں ساری کائنات کا آخری کنارہ ہے ـــ اس کے بعد کیا ہے؟'

وہ ذہین و دل کے اندر خوفناک سی اتھل پتھل مچاتے سوالات کے زیر اثر خود کلامی کے انداز میں کہتی گویا اسے معلوم ہوتا کہ بابا کے پاس ان کے سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ اور خود ہی سوال آگے بڑھاتی۔

'کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے نا ـــ تو پھر ـــ'

پھر سوال جوں کے توں رہ گئے۔ اپنی حیرت انگیزیوں اور ڈراونے پن کے ساتھ۔ جب تک کہ عمر نے کائناتی سوالات کی نوعیت بدل کر دنیاوی کر دی۔

وہ بیٹے کے عجیب سوالات کا اس کے والد سے ذکر کرتی۔ اور والد صاحب نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کس طرف دیکھتے۔ نیلی سوچتی کہ برسوں سے ناکول کے گرم گولے کی طرح سانسوں میں اٹکے اپنے غم کا مداوا بھی پوچھ لے۔ مگر اس کے اندر بسی خوددار عورت نے اپنے تعلق سے سوال کرنا اپنے شایانِ شان کبھی نہ سمجھا۔ سو موہن نیلی سلگتی پگھلتی رہی۔

عزت اور ہمدردی کی صورت تین چار برس ساتھ رہے۔ یعنی جب تک وہ شہر میں رہی۔ خدا خدا کر کے کہیں سے بیٹا آیا اور وہ گئی۔ مگر نیلی کی زندگی کے کچھ اہم سال ساتھ لے کر۔

جب کہیں جا کر مستقل دوستوں کی جاہی کے تھوڑی قید سے نیلی کا وجود رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگا۔

نیل بھی بڑا ہو گیا تھا۔

"ماں ـــ جو ہوتا ہے ـــ وہ تو ہوتا ہی ہمارے سمجھ پانے بنا"

بغیر بھی۔۔۔ مگر جو ہم کر سکتے ہیں۔۔۔ وہ ہمیں کرنا چاہیے۔۔۔ گزشتہ سوالوں کے جواب کھوجنے سے بہتر ہے کہ۔۔۔ جو سامنے ہے اس کی فکر کی جائے۔"

زندگی کو ذمے داری اور پائیداری سے گزارنے کے طریقوں پر باتیں کرنا وہ نیلی کو بہت سمجھدار معلوم ہوتا۔

باقاعدگی سے کثرت کر کے اس نے اپنے کمزور جسم کو چست اور مضبوط بنا دیا تھا۔ کھیل کود کا رسیا تھا۔ اس کے دوستوں میں کھلاڑی ہی ہوا کرتے۔ وہ بھی بغیر عمر کے کسی تصور کے۔ بس کھیل میں دلچسپی شرط تھی۔ وہ صرف ایسے ہی موضوعات پر خوشی سے بات کرتا۔

''سٹیڈیم۔۔۔ پلے گراؤنڈ۔۔۔ ماں۔۔۔ زندگی کا میدان ہے میرے خیال سے۔۔۔ جسم کو جینے کا طریقہ سکھانے والا۔۔۔ کھلے آسمان کے نیچے کھیلتے ہوئے لوگ۔۔۔ صحت کی عزت کرتے ہوئے لوگ کس قدر خوش ہوتے ہیں۔۔۔ یہ جسم ہماری روح کو ملا بے نظیر کا تحفہ ہے۔۔۔ ایک پارسل ہے یہ زندگی انسان کو۔۔۔ اسے اپنی زندگی سے محبت کرنی چاہیے۔۔۔ ان میلادی آدمی کو آپ کبھی خوش نہیں دیکھیں گی۔ جسم کے ساتھ اس کا ذہن بھی بیمار ہوتا ہے۔ دوسروں کو وہ کبھی خوش دیکھ سکتا ہے نہ خوشی دے سکتا ہے۔ بیمار رہ کر اپنا ٹائم اور پوری عمر برباد کر دیں یا تندرست رہ کر اس جسم سے ہر خوشی حاصل کر لیں، وہ ہم پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔"

ایک صبح کھیل سے جلد لوٹ کر وہ برآمدے میں لگی کرسی پر بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگا۔

"خوشی اصل میں اچھی صحت ہی ہے۔ یہ چائے کب چھوڑیں گی آپ ماں۔۔۔ یہ بھی ایک طرح کی سلو پوائزننگ ہے۔۔۔ یو کین ڈائی اِف یو ہیو اے ہنڈریڈ کپس ایٹ اے سٹریچ یو نو۔۔۔ ورنہ ڈیڈ نے تو گولف کلب جانا چھوڑ ہی دیا۔"

"میں نے کم کر دی ہے چائے بیٹا جب سے آپ نے کہا ہے۔۔۔ جلد چھوڑ دوں گی۔۔۔ اور سیر بھی تو کر رہی ہوں با روز صبح۔۔۔ آپ کے بیدار ہونے سے پہلے۔"

"تو سچ بتائیے کیا آپ خود کو ایکٹو محسوس نہیں کرتیں۔۔۔ خوش رہتی ہیں یا پہلے کی نسبت۔"

"آف کورس بیٹا۔۔۔ لگتا ہے جیسے زندگی میں کچھ اہم کرنے کو حاصل ہو گیا ہو۔۔۔ جو پہلے نہیں تھا۔۔۔ انتظار رہتا ہے صبح کی سیر کے وقت کا۔۔۔ دن بھر کے کام میں میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔۔۔ بھرپور زندگی جینے کا احساس ہونے لگا ہے مجھے۔۔۔ ہنڈرڈ پرسنٹ کریڈٹ گوز ٹو یو مائی چائلڈ۔"

"تھینک یو مام۔"

اس نے مسکرا کر سر زور سے اثبات میں ہلایا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا پھر باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

طویل قامت دھوبن سر پر استری کرنے والے کپڑوں کی گٹھری سنبھالے پانچ چھ سالہ بچی کو انگلی تھامے گلی کے دوسرے موڑ پر ایستادہ پیپل کے درخت کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ جہاں اس نے ادھر ادھر سے اینٹیں گارا جمع کر کے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا لیا تھا۔ آگے آگے اس کا سات سال کا بیٹا اپنے دونوں ہاتھوں میں بھاری بھاری کوئلوں والی استری اٹھائے چل رہا تھا۔

''یہ رگھو بہت پیتا ہے۔۔۔ کملی کام کرتی ہے اور یہ۔۔۔ بلڈی الکوہولک۔۔۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔

''مر جائے گا ایک دن جلد ہی۔''

اس کی غصیلی آواز میں دکھ شامل ہو گیا۔

''نہیں بیٹا خدا نہ کرے۔۔۔ بیچاری کملی کا کیا ہوگا۔۔۔ دو بچے اکیلی کیسے پالے۔''

''ابھی بھی پال رہی ہے اکیلی۔۔۔ اس کو بھی پال رہی ہے۔۔۔ اور یہ کھانے کی بجائے پینے میں لگا ہے۔۔۔ کتنی کوشش کی تھی اس کو ہسپتال لے جانے کی ہم سب نے۔۔۔ وہاں اس کی بیماری چھڑوا دی گئی ہوتی۔۔۔ مگر۔۔۔''

اس کا لہجہ درشت سا ہو گیا۔

''اب جو بھی لت ہے پاگل کو۔۔۔ مگر بچوں کا باپ تو ہے نا۔۔۔''

''ہاں وہ ان کا باپ ہے بس۔ بٹ ہی از ڈائنگ۔۔۔ آئی کین سی دیٹ۔۔۔''

اور اگلے دن ہی رگھو کو خون کی قے ہوئی اور شام تک چٹ پٹ ہو گیا۔

نیلوفر نے سنا تو دھک سے رہ گئی۔ دو تین سال پہلے تک بھلا چنگا تھا۔ کملی پریشان رہتی تھی کہ پینے لگ گیا ہے۔ پھر کہتی کہ روز پیتا ہے۔ پھر یہ کہتی کہ اب دن میں بھی اسے دارو چاہیے۔۔۔ اس کی لت اور ضد سے عاجز کملی نے خود بھی سنگو اور پی کبھی جب کولونی کے کسی گھر کا کوئی ملازم یا زمیندار ہوا۔ رگھو نے کام کرنا نہ کے برابر کر دیا تھا۔ بس کسی دن کچھ کپڑے جیسے تیسے استری کر دیتا کہ ان پیسوں سے شراب کا ایک پیک خرید سکے۔ پی کر پڑا رہتا وہیں پیپل کے درخت کے نیچے۔ جب تک کملی دوسرے پیک جتنے پیسے نہ دے دیتی۔ بہت ہی دیر ایک ہی انداز میں بیٹھا رہتا۔ کبھی نیم دراز کبھی گھٹنے پیٹ سے لگائے پیڑ کے تنے سے ٹکا ہوا سر اٹھائے کسی جانب دیکھتا ہوا۔ بچوں کی طرف۔ استری کر رہی بیوی کو یا راستے کی اور۔ اس کی ناک لمبی تھی۔ آنکھیں چھوٹی اور دہانہ چوڑا تھا جس میں سے کبھی جب وہ کام سے پہلے پیسے مانگتے وقت خوشامدانہ ہنسی ہنستا تو پورے بتیس دانت نظر آتے۔ دبلی ہوتی گردن پر آگے کو نکلا ہوا سر ایسا لگتا جیسے کسی دیسی نسل کا تربیت یافتہ مگر بے ضرر کتا مستعدی سے چوکیداری کر رہا ہو یا مالک کے حکم کا منتظر ہو۔

چھوٹے بچوں اور جوان بیوی کا پیچھے سے اداس چہرہ نظر آ رہا تھا۔ نیلوفر نے ایک لمبی سانس لی۔

نبیل کھیل سے اسی وقت لوٹ رہا تھا کہ گلی کے چبوترے پر کوئی دوسرا آدمی کپڑوں پر استری کرتا نظر آیا۔ نبیل نے گاڑی روک کر پوچھا تو دکھو کے بارے میں پتہ چلا۔

"اس آدمی کو بہت پہلے گولی مار دینا چاہیے تھی۔۔۔ "

اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"تمہیں ایسا نہیں کہتے۔"

کیوں نہیں کہتے مام۔۔۔ شکیلو، اثر پڑتا ہے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بھولے انسانوں پر۔۔۔ انہیں قدرت نے تھوڑی کوئی بیماری دی ہے۔۔۔ شے سے خود کو خود بیمار کر دیتے ہیں ایسے احمق لوگ۔۔۔ سرکار کو ایک لنگی ہی پالیسی بنانا چاہیے۔۔۔ کہ صرف سانس لینے کی خاطر سانس لیتے ہوئے یہ کیڑے کوڑے یا تو اپنے مند عادتوں کو ہی ختم کریں ورنہ۔۔۔ ورنہ ان کو کسی ادارے کے زیر جبراً زیرِ علاج رکھا جائے۔ جہاں یہ اپنے عزیزوں کی صورت تک نہ دیکھیں جو اس کی شراب نوشی کی وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا۔

"سچ نہیں ہے کیا۔۔۔ آپ بتایئے۔۔۔ ایک انسان دوسرے کو اتنا افلس کر سکتا ہے۔۔۔ شکیلو ہوا پونیشو۔۔۔ اثر تو پڑتا ہے نا۔۔۔ میرے دوست یہ بچے۔۔۔ جو میرے ساتھ کھیلتے ہیں بڑے ہو کر بلکہ اس وقت بھی اور لوگوں کو بیہودی طریقے سے جینا سکھائیں گے۔۔۔ انہیں دیکھ کر سیکھیں گے لوگ۔۔۔ یہ ایک کی ناتی پر بیٹھیں ہے۔۔۔ ضائع کیا کون نوٹا کر سکتا ہے۔ خود صحت مند زندگی گزارنا اور دوسروں کو اسپائر کرنا کیا سب سے بڑا کنٹری بیوشن نہیں۔۔۔ قوم کی طرف۔۔۔ اب گلی کے یہ بچے۔۔۔ یہ کچھ کچھ ہوش مند بچے باپ کو یاد کر کے رویا کریں گے۔"

وہ اداس ہو گیا۔ اور ایک گہری سانس لے کر دوبارہ ہچکولے لگا تو کر رہا تھا۔

ماں قانون پڑھ رہے بیٹے کو، زندگی موت کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے غور سے دیکھ رہی تھی کہ اس کی تکلیف سے پٹپٹا سی گئی۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

وہ جلدی سے بولی۔

"میرے پاؤں میں آج پھر موچ آ گئی ماما۔۔۔"

اس نے ماں کے چہرے پر ابھر آئے پریشانی کے تاثرات دیکھ کر فوراً کہا اور کرسی کا سہارا لے کر بمشکل کھڑا ہوا۔

"بڑی مشکل سے ڈرائیو کیا۔۔۔ سب نے اپنے رومال باندھ دیئے۔"

وہ مسکرایا اور سُوجا ہوا پاؤں ماں کے سامنے کر دیا۔

"یہ دیکھئے۔"

اس نے کہا۔ پھر ایک آدھا رزوسے کراہ کر گھر کے اندر کی طرف مڑ۔ ماں بازیں سیدھی کر کے سہارا دینے کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں بڑا ہو گیا ہوں مام۔۔۔ آپ کیسے سنبھالیں گی۔ الٹا دونوں گر جائیں گے۔۔۔ ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

اس نے گردن موڑ کر کہا اور زور کا قہقہہ لگایا۔

"ہائے۔۔۔ ماما۔"

دوسرا پاؤں فرش پر رکھتے ہی وہ اونچی آواز میں چلایا اور پھر چپ۔ اس کے بعد دیوار کے سہارے اندر کی جانب چلا گیا۔ اس کے عقب میں نیلوفر بھی اس پر نظریں لگائے آہستہ آہستہ اس کے کمرے تک جا کر اس وقت تک دروازے کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی جب تک آہستہ آہستہ وہ مسہری پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر سے فون پر بات کرنے لگا تھا۔

بیگم نیلوفر خان برآمدے میں بیٹھی سوچوں میں ڈوب گئی تھی۔

نبیل بالکل جمیل جیسا نظر آنے لگا تھا۔

اپنے باپ جمیل احمد خاں جیسا۔

مگر اب جمیل احمد خاں ویسے نہیں رہے تھے۔ پہلے جیسے زندہ دل۔

اب وہ لباس بھی کچھ سادہ پہننے لگے تھے ادھر دو چار سال سے۔

بدن کچھ اور بھاری ہو گیا تھا۔ بال چھدرے ہو گئے تھے۔ اب نئی کے نئے کپڑے بے کیف نظر آتے۔ ہوش ربا خوشبوؤں اور شیو کے بعد لگانے والے لوشنوں کی وہ اچھی خاصی تعداد جو خوابگاہ کی سنگھار میز یا غسل خانے میں لگے بڑے بڑے آئینوں کے ساتھ لگی طاقچوں پر سجا کرتی، رفتہ رفتہ غائب ہو چکی تھی۔ لباس کے ساتھ میچ کرنے والے یا پیار سوچ کے بعد خوبصورت تضاد پیدا کرنے والے جوتے، کمر بند، ٹائیاں اور اوپری جیب کے رومال، قیمتی گھڑیاں، چشمے کے فریم اور مختلف شکل اور ساخت کے بیش قیمت قلم اب اپنی اہمیت کافی حد تک کھو چکے تھے۔ شام ڈھلے سیدھے گھر آ جانا اور یہ بات کم کی طرح مان لینا بھی معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی شخص جانے پہچانے راستے پر کتاب پڑھتا ہوا چلتا ہو۔ یا جیسے اپنی غلطی کی تلافی کر رہے ہوں۔ گویا اب جمیل احمد خاں کے لئے چیزوں کا ہونا ہی زندگی ہو، اور چیزوں کے ہو چکنے پر ہی زندگی منحصر ہو اور اگر نہ ہو چکنے پر بھی منحصر ہو تو کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ بدرنگ سے جمیل احمد خاں کچھ ایسے لگنے لگے تھے جیسے کوئی قیمتی لباس دھونے کے بعد اپنی چمک کھو دے۔

نیلوفر نے نظریں اوپر کی جانب ڈالیں۔ سنہرے پروں والی چڑیا ڈال ڈال گھوم رہی تھی۔ درخت کی سب سے بلند شاخ کے سرے پر جانے کس طرح اپنا توازن برقرار رکھے بیٹھی ایک بلبل چہک چہک کر اپنے اطراف دیکھ

رہی تھی یا اطراف دیکھ دیکھ کر چہک رہی تھی۔

کیسے لگ رہے تھے جمیل احمد خاں جو روز پہلے جب نیلوفر اچانک غسل خانے میں شیمپو رکھنے گھس گئی تھیں۔ انہیں غسل خانہ اندر سے بند کرنے کی کبھی عادت نہ تھی۔ شاور سے پانی کی پھواریں جاری تھیں اور وہ زمین پر بیٹھے بال رگڑ رہے تھے۔ گول ہونے کی بجائے گھونے ہو چکے اُن کے عظام سے گوشت زمین سے خاصے اوپر اٹھے ہوئے تھے کہ پیٹ اُن کے اور اُن کی اکڑوں بیٹھی ٹانگوں کے درمیان نیل کی زرد رنگ گیند کی صورت تنا، فاصلے کئے ہوئے تھا۔ مگر جسم پر بال کم ہو جانے کے سبب پیٹ پر گیند کی طرح کی کوئی کالی لکیر واضح نہیں تھی۔ بھیگے بالوں نے ننگ سر کے تمام امراض وحشت انہام کر دئے تھے اور سر کی چپلاہٹ مائل سفید جلد یہاں وہاں سے جھانک رہی تھی۔ موٹے ہوئے موٹے گول گھٹنوں سے گول پنڈلیاں ٹخنے تک آتی ہوئی ہو بہو برج مسلم کی ٹانگ کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

نیلوفر نے پھواروں سے بچتے ہوئے عجلت سے شیشی، کانچ لگے تین طاقوں والی منقش چوبی الماری کے اوپری طاقچے پر رکھی اور اندر کا منظر ساتھ لئے باہر آ گئی۔

اس نے ایسی صورت بنائی جیسے بغیر شکر ملائے پھیکی چائے کا گھونٹ بھر لیا ہو۔

جمیل احمد اس دن بھی حسبِ معمول نہیں گنگنائے تھے اور جلدی سے نہائے تھے۔

کیا جمیل ناخوش ہیں اس لئے اب گنگناتے نہیں؟
کیا جمیل ' ان ہیلدی ' ہیں اس لئے ناخوش ہیں؟
یا خوش ہیں اس لئے صحت کی طرف سے لاپرواہ ہیں؟
بیچارہ کرانیا ' مائنڈ ' اور باڈی ' برباد کر رہے ہیں؟
انہیں ' اسپائر ' کیا زندگی کی طرف سب سے بڑا ' کنٹری بیوشن ' ہوگا؟

نیلوفر درختوں میں دیکھتی ہوئی جمیل کی کہی باتیں سنا کی۔
مگر جمیل احمد خاں تو کسی اور کے لئے خوش رہتے تھے۔

اُن دنوں باقاعدہ گولف کھیلا کرتے تھے۔ اور اب کبھی کبھی ہفتوں اور اکثر مہینوں ہو جاتے ہیں انہیں ' گولف کورس ' کا رخ کئے۔

شادی کے پہلے سال نیلوفر بھی جاتی تھی جمیل کے ساتھ۔ جب جمیل اسپیشا گولف کی سفید گڑھوں والی چھوٹی سی سخت گیند سے بھی چھوا کر بے حد زم اس کے ساتھ گولف کلب کے ریستوراں کے منفرد سینڈوچ بانٹ کر کھلایا کرتا تھا، نظر آتے ہوئے بھی۔ اور وہ اپنے ساتھ کہیں اس کی موجودگی کے تصور سے محظوظ ایک الگ دنیا میں شاداب کرتی تھی کلب کی خاص دارجلنگ چائے کے خوشبو سے حساس حسّی ناک کے اوپر پر سکون آنکھوں سے درختوں کی شاخوں میں نظریں دوڑا دوڑا کر آجر کا پرندوں کو ڈھونڈتی۔ ان کی مخصوصیت کو پہروں نہارا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہاں ہی نیم کے درخت پر اس نے پہلی بار کوئل کو کوکتے دیکھا تھا۔ نیم کی شاخوں کے نیم خوار بچوں میں بنے بے شمار بھنور جب ہوا کے تیز جھونکوں سے یہاں وہاں کو جھٹکنے لگتے، جب جا کر کہیں پردہ نشین کوئل کی جھلک ملتی۔ وہ بلبل کی طرح درخت کی سب سے بلند شاخ پر بیٹھ کر علی الاعلان برملا گیت نہیں گاتی۔ سیاہ پروں اور سفیدی ستاروں والی کوئلیا، جو ذرا سا گلا پھاڑ کر یوں چلاتی کہ اس کے کالے بے جسامتی شکل منظر میں چونچ کے اندر کی گلابی دنیا، گرم چیز سے ہاتھ چھو جانے کے سبب اچانک رو اٹھے شیر خوار بچے کے دہانے ایسی معلوم ہوتی۔

نیلوفر مسکرا دی تھی۔

جانے کیا تکلیف ہوتی ہوگی کوئل کو۔ شاید اسے سرد موسم پسند ہو۔ یا شاید اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ کوک کی طرح کوکتی اصل میں چہکتی ہو۔ کسی کو پکارتی ہو۔ دور سے سنائی دیتی اس کی کوک اچھی لگتی ہے۔

یا شاید آم کے موسم سے جڑی ہونے کی وجہ سے آم کے شوقین لوگوں کے لئے کسی خوش کن پیشگوئی سی معلوم ہوتی ہو۔

اُن دنوں جمیل احمد بیرون ملک سے لوٹتے وقت ' ڈیوٹی فری ' کا نیا ' گولف کِٹ ' لے آئے تھے۔ پہلے کا سرخ اور سبز خانوں والا نہایت عمدہ اور نہ رگڑ کر پھٹا کِٹ ہوتے ہوئے بھی۔ کیا ضرورت تھی بھلا اتنا مہنگا اضافی کِٹ خریدنے کی، جب ایک موجود تھا۔ اب دونوں اوپر کتابوں کی الماریوں کے درمیان دیوار سے لگے ایسے ساتھ ساتھ کھڑے کئے گئے ہیں جیسے نا زمانہ بالغ ہوئے رو ضرورت سے زیادہ صحت مند طلبا کو استاد نے کھڑا رہنے کی سزا دی ہو۔

مگر اب انسانی حقوق کا زمانہ ہے یہ تشبیہ کچھ مناسب نہیں۔

نیلوفر نے مسکرا کر سوچا پھر دوبارہ کچھ سنجیدہ ہو گئی۔

اور شام کو تو جانے سے پہلے اگر نیم تاریک کتب خانے میں نظر ڈالیں تو انسان دو دو گولف کِٹ اچانک دیکھ کر کچھ پل کے لئے خوفزدہ ہونے سے خود کو روک نہیں پاتا۔ کہ دو بڑے بڑے سروں والے بچوں جیسے چور حملے کی تاک میں کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔

نیچے کمرے میں گولف کے تین کلب نظر آیا کرتے ہیں۔ چھوٹے غلاف کے اندر کونے میں اکڑی بے حس و حرکت پڑے۔

جمیل صحت کی طرف دھیان دیں گے تو نیل کو خوشی ہوگی۔

اور وہ صحت کی طرف جب ہی دھیان دیں گے جب خوش ہوں گے۔

خوشی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے مگر جمیل احمد نے اپنے لئے خوش ہونا سیکھا ہی کہاں تھا۔

خوش رہنے کے لئے انہیں کسی اور کا سہارا چاہئے۔
نیلوفر کی نظریں درختوں سے ہوتی ہوئی آسماں کی جانب اٹھ گئیں۔
خدا ۔۔۔ خدا خوش رکھے ۔۔۔ انہیں ۔۔۔
نیلوفر کے دل نے دعا دی تو وہ چونک کر مسکرا اٹھی۔
پھر کچھ پل بعد اس کی مسکراہٹ اداس ہوگئی۔
ان کو خوش رہنے کی دعا دینا خود غرضی ہونے کی بددعا ہو جائے تو؟
کہ وہ کسی اور کی خاطر ہی خوش رہیں گے۔
یعنی کسی اور کے لئے گنگنائیں گے۔
کسی اور کے ساتھ کہیں جائیں گے۔
شام کو دیر سے آئیں گے۔
تو ۔۔۔؟
اچانک نیلوفر کو حلق کے بیچ تارکول کا گرم گرم گولا اٹکا محسوس ہوا۔
گھر ۔۔۔ دیر سے ۔۔۔ آئیں گے ۔۔۔ نبیل کی جانب سے لاپرواہ ہو جائیں گے ۔۔۔
اور نبیل اپنی ماں کو اداس دیکھ کر ۔۔۔
مگر نبیل اب بڑا ہو گیا ہے ۔۔۔
گلے میں اٹکا گولا جیسے پگھلنے لگا۔
اس نے غیر ارادی طور پر چائے کے مگ کو چھوا۔ حالانکہ اس میں کوئی چائے نہیں بچی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
نبیل کھیلنے گیا ہے۔
نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
نبیل اپنی پچکاری پارک لے گیا ہے۔
لوٹنے والا ہو گا میرا بچہ ۔۔۔ میری پچکاری۔
مسکراہٹ کچھ اور واضح ہو گئی۔
نیلوفر اندر کی طرف چل دی۔ مسکراتی ہوئی۔
کمرے میں آئی تو ٹھٹھک گئی۔
جمیل صاحب نے سنگھار میز کے آدھے سے کچھ ہی کم حصے پر خوشبوؤں کا خاصا سامان رکھا تھا ۔ متصل غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔
تو ۔۔۔ جمیل اب پھر ۔۔۔ پھر کہیں مصروف ہو رہے ہیں ۔۔۔ ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں ۔۔۔
اس خیال کے آتے ہی وہ اداس سی ہونے لگی تھی کہ پھر ایک خیال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
یعنی جمیل ۔۔۔ زندگی میں دلچسپی لینے والے ہیں۔
اور زندگی ۔۔۔ ایک بار ملتی ہے۔

اور نبیل کہتا ہے کہ ۔۔۔
اور نبیل سچ کہتا ہے ۔۔۔
اس نے میز پر سے پان کے پتے کی ساخت کی گہرے نیلے رنگ کے کانچ کی ایک ننھی سی شیشی ہاتھ میں لی اور ڈھکن کھول کر اسے اپنی ناک کے قریب لے گئی۔ خوشبو نہایت دلنواز تھی۔
'پیکو ربے نیں' برینڈ کی مردوں کے لئے مخصوص پرفیوم '۔
'ورمائی' کا حال ہی میں ڈیزائن کیا گیا سیاہ چشمہ سنگار میز کی خوش رنگ قیمتی پتھروں سی چمکتی ہوئی چیزوں کے درمیان کوہ نور ہیرے کی مانند نمایاں تھا۔ اور پاس ہی 'ٹیل مین' کی ٹیسر گھڑی کا سرخ لوگو اپنی انفرادیت کا اعلان کر رہا تھا۔
قریب دو نئے 'کف لنکس' پڑے تھے اور ان کے پاس سیاہ رنگ کا 'مونٹ بلاں' کا قلم رکھا تھا۔
یعنی کوٹ کی اوپری چھوٹی جیب سے جھانک کر چشمے کو مزید وقار عطا کرنے کے لئے یا چشمے کے ساتھ نظر آ کر اپنا وقار بڑھانے کے لئے ۔ اس نے آنکھیں میچ کر ایک بار پھر شیشی کو ناک سے چھوا اور آنکھیں کھول دیں۔ پھر چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ چشمہ آنکھوں کے باہری کونوں سے بڑا ہو کر کان تک کا حصہ ڈھکتا تھا۔
نیلوفر کے دادا جان ایک تصویر میں ایسا ہی چشمہ پہنے ہیں ۔۔۔ نئے ڈیزائن اصل میں پرانے ڈیزائن ہوتے ہیں۔
اس نے گویا اپنے آپ سے کہا اور چشمہ اتار کر خود کو آئینے میں دیکھا۔
اسے معلوم ہوا کہ وہ اداس نہیں ہے ۔
خوشی خود سے وابستہ رکھنے کی چیز تھی وہ کہاں اسے جمیل احمد میں کھوجتی رہی۔
عمر عزیز کا ایک طویل حصہ کسی اور کیلئے ضائع کر دیا جب کہ ہر ذی روح کی ایک جدا دنیا ہوتی ہے جو اسی کی مرضی سے چلتی ہے۔
اس نے جمیل احمد کے انتظار میں اداس رہنا پسند کیا ۔
جمیل احمد نے کسی اور کے لئے خوش رہنے کو ترجیح دی۔
اب جمیل احمد پھر زندگی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔
انہیں اپنے طور پر خوش رہنے کا حق ہے ۔
مگر کسی اور کی خاطر۔
چلئے ۔۔۔ کسی بہانے سہی۔
ایک انسان ۔۔۔
کوئی انسان زندگی سے محبت کرنے لگا ہے۔
نیلوفر کچھ لمحے چپ چاپ آئینے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کمرے سے نکل گئی۔

شناخت پریڈ.... گلزار جاوید

فیصلہ ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ماضی کی کھڑکی سے اچانک ایک پٹ کھلا اور بہت سے پرانے دریچے وا کر گیا۔ ایک لمحے کو اپنی بصارت اور یادداشت پر یقین نہ کرنے کو جی چاہا تھا دوسرے لمحے بدحواسی سے آنکھیں چار ہوتے ہی اپنی رائے سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مشابہت دنیا میں اکثر دیکھنے کو ملا کرتی ہے کہیں آنکھوں میں مماثلت ہوا کرتی ہے کہیں رخسار ملا کرتے ہیں' کہیں چہرے کی بناوٹ ایک جیسی ہوتی ہے' کہیں قد کاٹھ دھوکہ دیا کرتا ہے' کہیں ناک' کان' بال اور آواز میں یکسانیت ہو کر آتی ہے۔ یہاں تو سرتاپا ہر نقش اور ادا پرانی شناسائی کے دروازے کھول ور کھٹکھٹا کر خود کو آشکار کر رہی ہے۔ ہر چند میزبان خودی کا تقاضا اس امر کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ آنے والے کو خوش آمدید کہنے' چائے پانی' مشروبات کی پیشکش کرنے اور موسم کے مطابق کمرے کی کھڑکی' روشن دان اور پنکھے وغیرہ کی بابت دریافت کرنے کے بجائے مہمان کی شناخت پریڈ شروع کر دی جائے۔ دل و دماغ میں برپا ہیجان کا حل ڈھونڈنا بھی ضروری تھا۔

"جی میرا نام مشتاق ہے' ٹیلیفون پر میں نے ہی آپ سے بات کی تھی......"

"م..... مش..... مشتاق....." "جی! مشتاق چوہدری....."

پہلی بار اداس اور ویران نگاہوں نے ہمارے سراپے پر سرسری نظر دوڑا کر جائزہ لینے کی کوشش کی۔ "آپ چائے لیں گی یا ٹھنڈا..... یا..... پہلے گھر دیکھنا پسند کریں گی.....؟"

"کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں آپ لوگ یہاں' میرا مطلب ہے یہ گھر آپ نے کب بنوایا تھا اور کون کون رہتا ہے اس میں......؟" "جی..... میں..... بڑا غریب آدمی ہوں..... یہ تو آپ کی مہربانی ہے..... ورنہ....." "کیا کام کرتے ہیں آپ.....؟" "میں جی..... سرکاری ملازم تھا..... ایک سال پہلے ہی ریٹائر ہوا ہوں ملازمت سے..... سرکاری ملازم کے لئے مخصوص تنخواہ میں بچوں کی پرورش' تعلیم اور گھر کی دیکھ بھال بہت مشکل ہوا کرتی ہے' گھر بنانے یا اس کی بابت سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....." "درست کہہ رہے ہیں آپ....." خاتون نے نحیف و ناتواں آواز میں تمام تر طاقت سموتے ہوئے دوسری بار ہمارے سراپے پر اچٹتی نگاہ دوڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کرتے کرتے ارادہ بدل کر گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کر کے ہمارے دل و دماغ میں کلبلانے والے کیڑوں کا سر بڑی بے دردی سے کچل دیا۔

بیڈ روم' ڈرائنگ روم' کچن دیکھتے ہوئے خاتون اور تینوں بچوں کے تاثرات زیادہ خوشگوار نہ تھے۔ باتھ روم دیکھتے ہی اُن کے چہروں کی رنگت' شکنیں اور سلوٹیں اس طرح یکجا ہو گئیں جیسے باہم جو تم پیزار ہل خانہ' محلے اور پڑوس میں ہونے والی لڑائی پر ایک جان ہوا کرتے ہیں۔ "یہ لوگ گھر کی آرائش و زیبائش پر جس طرح توجہ اور دھیان دیتے ہیں' باتھ روم پر اس قدر کیوں نہیں دیتے.....؟" تازہ تازہ نمودار ہونے والی فرنچ کٹ کے حامل نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں اپنے سے دو تین سال چھوٹی بہن کے قریب ہوتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

"دیتے ہیں جی' کیوں نہیں دیتے' اپنی اپنی حیثیت اور جیب کی بات ہے۔ آئی ایٹ کے اکثر باسی' آبائی گھر' زمین' زیور یا قرضے لے کر گھر بناتے ہیں۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لئے سب سے اہم چیز چھت ہوا کرتی ہے۔ ڈرائنگ' ڈائننگ' کچن' باتھ روم ہر ایک کے چونچلے ہیں۔ آپ آئی ایٹ سے نکل کر جی ایٹ میں جائیں گے تو آپ کو واضح فرق نظر آئے گا۔ جی کے بعد ای' ایف والے پوش علاقوں میں جائیں گے تو وہاں کی دنیا الگ نظر آئے گی۔ گھر کی جگہ محل' کوٹھی' بنگلے اور ایک ایک آدمی کے لئے کئی کئی بیڈ روم' باتھ روم ہوں گے تاہم ایک ایک جائیں گے مگر پڑوسی کو پڑوسی جانتا تک نہ ہو گا حتیٰ کہ بعض گھروں کے مکین ایک دوسرے کے لئے اجنبی نظر آئیں گے.....!" ہمارے تفصیلی تلخ اور حقیقت آشنا جواب سے خاتون کے چہرے کی رنگت کئی بار تغیر کا شکار ہو کر نارمل ہونے کی کوشش کر رہی تھی جس میں فطری عمل سے زیادہ خاتون کی ذاتی اور ارادی کوششوں کا دخل بھی تھا۔ بڑا بیٹا' دوسرے نمبر کی بیٹی اور تیسرا بچہ بھی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"کرائے اور ایڈوانس کی بابت' آپ نے ابھی تک کچھ نہیں فرمایا.....!" چائے اور سامانِ خورد و نوش سے بے اعتنائی برتتے ہوئے خاتون نے فکرمند لہجے میں ہماری جانب سوال اُچھال کر جیسے ہوئے سمندر کو دھوپ دکھلا دی جو آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے پگھلتے پگھلتے بھاپ بن کر اڑنے لگا۔

"کیا ہوا صاحب خیریت تو ہے.....؟" "خیریت نام کی کوئی چیز دیکھی ہے کبھی تم نے میری زندگی میں.....؟" "سر..... سر..... آپ..... آپ..... پریشان لگ رہے ہیں.....!" "میری تنخواہ سے زیادہ کرایہ کی خبر لاؤ گے تو کیا کروں گا..... ناچوں..... گاؤں..... خوشی سے ناچنے لگوں گا.....؟" "لیکن سر..... اس میں میرا..... کیا.....؟" "جانتا ہوں..... اچھی طرح جانتا ہوں..... قصور وار کوئی..... اور.....!"

☆

نیر صاحب ملک کے ایک پڑھے لکھے' عزت دار اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندان کے دیگر افراد کے برعکس' نیر صاحب کا پڑھنے لکھنے سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ ہر سکول کرکٹ ٹورنامنٹ میں اچھی آل راؤنڈر پرفارمنس دینے کے بعد ان کو کرکٹ کا شوق جنون کی حد تک ہو گیا تھا۔ کالج کی تعلیم مکمل کرتے کرتے صوبے کی بڑی ٹیم' ڈویژن کی نمائندگی کرتے ہوئے فرسٹ کلاس کرکٹ تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے' کھاتے پیتے' چلتے پھرتے' سکول' کالج' گھر' میدان غرض ہر جگہ ان کا ایک ہی خواب' مکمل'

نکلیں گھومنا اور کرکٹ کے ذریعے نام اور شہرت کمانا تھا۔ جب سلیکشن کا وقت آیا تو زبیر صاحب کو سخت صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کی جگہ کم پرفارمنس والے اعلیٰ اسٹیٹس کے مالک خاندان کے چشم و چراغ کو منتخب کر کے انتظامیہ نے زبیر صاحب اور اُن کے خاندان کو صدمے سے دوچار کر دیا۔ زبیر صاحب کا خیال تھا کہ اُن کے والد بیٹے کے حق میں آواز اُٹھائیں گے۔ اونچے ایوانوں میں جا کر انصاف کی دہائی دیں گے۔ یہ سب اُن کی خوش فہمیاں تھیں جو اُن کے بااصول والد کی ذات سے وابستہ کرنا ہی غلط تھیں۔

معاملات تیزی سے اپنے رُخ کی تلاش میں تھے۔ سیماب طبیعت زبیر صاحب نے ملک کے اندر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بیرون ملک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ والد، والدہ، بہن بھائی، رشتہ دار، دوست احباب اس قلبِ ماہیت پر ششدر تھے کل تک جو شخص ملک کی نمائندگی کرنے اور ملک کا نام روشن کرنے کا پختہ عزم رکھتا تھا آج وہی شخص معمولی سی ناانصافی کے باعث وطن چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ زبیر صاحب نے اپنے دوست صائم کے ذریعے کالج کا پراسپیکٹس اور دیگر معلومات منگوا کر اہلِ خانہ کو اعلیٰ تعلیم کی خاطر باہر جانے پر آمادہ کر لیا۔

والد صاحب نے بیٹے کو رخصت کرتے وقت طرح طرح کی نصیحتوں کے علاوہ آدم بھائی سے رابطے میں رہنے کی تاکید کی۔ انہیں خاندانی روایات، عزت، وقار کا بڑا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دیارِ غیر میں کوئی نہ کوئی بڑا بزرگ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو زبیر صاحب کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے۔ آدم بھائی تین نسلوں سے برطانیہ میں مقیم تھے اس کے باوجود وطن سے اُن کا رشتہ اتنا ہی مضبوط تھا جتنا وطن میں رہتے ہوئے ہوا کرتا تھا۔ لندن کے پوش علاقے میں اُن کا بڑا جنرل سٹور تھا۔ زبیر صاحب چونکہ سٹوڈنٹ ویزے پر برطانیہ گئے تھے لہٰذا چار گھنٹے اخراجات پورے کرنے کے لئے کام کرنے کی اجازت تھی۔ آدم بھائی نے دوست کے بیٹے کو فراخ دلی سے خوش آمدید کہتے ہوئے ہر طرح کی مالی امداد کے علاوہ اپنے ہی سٹور پر کام کرنے کی آفر دے دی۔

دراز قد، نیلی آنکھیں، گلابی رنگت، سیاہ گھنی زلفیں، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، بیضوی چہرے میں موتی کی مانند جڑے ہیں جگمگ کرتے تھی ہیرے نما سات نگوں کی جھلک میں رکی مسکان اور شرق و غرب کا اعلیٰ ذوق زبیر صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زنجیر پہنا گیا۔ کنگسٹن میں مقیم ایرانی خاندان کے مراعات یافتہ لوگ مقیم تھے۔ جو انقلاب ایران کے بعد بھی ایران میں مقیم تھے مگر آہستہ آہستہ گھٹن کے احساس نے ان لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ بنیادی طور پر یہ لوگ لبرل اور آزاد خیال تھے اس لئے انہوں نے وطن چھوڑتے وقت اُن جاگیروں کی پروا بھی نہ کی جو انہیں شاہ کے دور میں مراعات کے طور پر عطا کی گئی تھیں۔

حوری دو بہنیں، ایک بھائی اور ماں باپ یعنی پانچ نفوس پر مشتمل خاندان تھا۔ بھائی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ میں مقیم تھا جس کے تھوڑے عرصے بعد بڑی بہن فاطمہ کی شادی بھی ایران کے صاحبِ ثروت خاندان کے لڑکے سے کر دی گئی جو ضیا ترک میں مقیم تھے۔ زبیر صاحب کو حوری کی ابتدائی ملاقاتوں میں کسی کو عشق محبت یا شادی کا گمان نہ تھا۔

ابتدائی ایام میں زبیر صاحب نے لندن میں لیگ کرکٹ کھیلنے کی کوشش کی مگر حوری سے ملاقات کے بعد اُن کا دل حوری کے علاوہ کہیں نہ لگتا تھا۔ حوری کو پرپوز کرنے کے بعد زبیر صاحب کو حوری کے ٹھاٹ باٹ اور اپنی خاندانی سفید پوشی کا شدت سے احساس تھا۔ چاروں جانب ہاتھ پیر مارنے کے باوجود لندن جیسے تیز رفتار مادی معاشرے میں دور دور تک کامیابی کے آثار دکھائی نہ دیتے۔ برطانیہ کی حکمرانی کا سورج غروب ہوتے ہوتے ماند ہونے کو ہے مگر اُن کی اعلیٰ درسگاہوں اور عدالتوں کا بھرم اب بھی دنیا بھر میں قائم ہے۔ یہ ادارے نہ صرف برطانیہ عظمیٰ کی عظمت و وقار میں اضافہ کا موجب ہیں بلکہ معقول زرِ مبادلہ کے ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت ایکسپورٹ کرنے کا بہترین ذریعہ اور سستی لیبر حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہیں۔ گھر سے چلتے وقت بیرون ملک کے خواب زبیر صاحب کو جس قدر سہانے دکھائی دے رہے تھے یہاں پہنچ کر اسی قدر تلخ اور ناممکن نظر آ رہے تھے۔ گاہے بگاہے زبیر صاحب کے کانوں میں والد کے یہ الفاظ گونجنے لگتے "بیٹا آج تک تمہاری پرورش اور نگہداشت کا میں ذمہ دار تھا آج کے بعد میری اور میرے خاندان کی عزت کے تم محافظ ہو"

زبیر صاحب نے والدین سے شادی کی اجازت طلب کی تو گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب کے لئے اپنے اس فیصلے کا دفاع کرنا ناممکن ہو رہا تھا جو انہوں نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک روانہ کرتے وقت سب کی مخالفت سے لڑ کر تنہا کیا تھا۔ دوسری فکر زبیر صاحب کے والد کو اخراجات کی بھی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد زبیر صاحب کے والد نے خود لندن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بظاہر بیگم کو وہ یہ کہہ کر گئے تھے کہ میں بیٹے کو سمجھا کر واپس گھر لے آؤں گا۔ لندن پہنچ کر حوری سے ملنے کے بعد زبیر صاحب کے والد کو بیٹے کی پسند کی داد دینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ پہلے انہوں نے وطن واپس جا کر شادی کی تجویز رکھی جو حوری کے اہلِ خانہ اور خاندان والوں کے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔ بڑی سوچ بچار اور تکرار کے بعد زبیر صاحب کے والد نے سادگی سے نکاح اور شاندار طریقے سے وطن میں رخصتی کی تجویز دے دی۔

زبیر صاحب کے والد اور اُن کا خاندان تمام تر وسائل خرچ کر کے بھی اس قدر سادہ شادی کی تقریب نہ کر سکتے تھے جس قدر سادہ حوری کے والدین نے اپنی دانست میں کی تھی۔ ریٹز کا بہت وسیع ہال کم کی شادی کو ٹیلی فون پر جس طرح زبیر صاحب کے والد نے سادگی سے نکاح بتلایا تھا یہ اُن کا دل ہی جانتا تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ انہوں نے زندگی میں نہ خود بولا تھا اور نہ کسی کو بولتے سنا تھا مگر پھر بھی اُن کے دل کو یہ اطمینان تھا کہ وہ کسی ذاتی مفاد یا دوسرے کے حق میں ایسا نہیں کر رہے بلکہ دو دلوں کو جوڑنے اور دو خاندانوں کی خوشیاں سمیٹنے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔

وطن واپسی پر زبیر صاحب کے والد نے بیٹا اور بہو کو دعائیں دیتے
ہوئے تاکید کرتے ہوئے اُسی طریقے پر استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا تھا جس طریقے پر
نئی شادی کا ہوا کرتا ہے۔ حوری کی والدہ گھٹنوں کے درد کے باعث سفر نہ کر سکی تھیں
اس لئے اُن کے والد بھی بیگم کی تیمارداری کے باعث نہ آ سکے۔ حوری کے دونوں
بہن بھائی امریکہ میں مقیم ہونے کے باعث آنے سے معذور تھے۔

حوری طبیعتاً خوشگفتار اور ملنسار تھی۔ زبیر صاحب کے والد کو ابتدائی
درجوں میں فارسی پڑھنے اور فارسی ادب سے شغف کے باعث بہو سے فارسی میں
گفتگو کر کے لطف آتا تھا اس لئے گھر کا ماحول جلد ہی بے تکلف اور اپنائیت کا
حامل ہو گیا۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کچھ وقت ضرور لگا البتہ مغربی تعلیم
کی مدد سے جلد ہی زبیر صاحب کو شاندار گریڈ کی نوکری، گھر، گاڑی اور ملازم وغیرہ
مل گئے تھے۔ حوری نے گھر کی تمام ذمہ داری احسن طریقے پر نبھانا شروع کر دی
تھیں۔ زبیر صاحب اور گھر والوں کو حوری کی شاپنگ کا انداز اکثر پریشان کیا کرتا۔
معیار اُس کے نزدیک سب سے اہم چیز تھی قیمت ثانوی۔ جبکہ سفید پوش گھرانوں
میں قیمت سب سے افضل گردانی جاتی ہے۔

گھر میں نئے مہمان کی آمد نے زبیر صاحب کی والدہ کی اُس دوری
کو قربت میں بدل دیا تھا جو وہ غیر ملکی بہو سے رکھا کرتی تھیں۔ اُن کی طرف سے
بہو کی شاہ خرچیاں اور منکرانہ انداز پر غصہ کی جگہ تعصب اور ناپسندیدگی نمایاں ہوتی تھی۔
ادھر حوری کو بچے کی دیکھ بھال اور نگہداشت سے فرصت نہ ملتی کبھی فارغ وقت ملتا تو
وہ کچن کے بجائے لائبریری، لان اور ڈرائنگ روم کو ترجیح دیتی۔ دونوں میاں بیوی تنہائی
میں بچے کے مستقبل کی بابت پروگرام بنایا کرتے۔ زبیر صاحب ہر پروگرام کے
بعد اپنی تنخواہ اور خرچ کے تخمینے کو ضرب تقسیم کر کے پریشان ہوا کرتے۔ جبکہ حوری
کے نزدیک اس طرح کی سوچ کا تصور ہی نہ تھا۔

ہر چند اسلام آباد گریڈوں اور سیکٹروں کا شہر ہے۔ بڑے گریڈ والے
کی بیگم ہرگز چھوٹے گریڈ والے کی بیگم سے شیر و شکر ہونا پسند نہیں کرتی۔ اسی طرح
پوش علاقے میں رہنے والے لوور کلاس سیکٹر کے مکینوں سے ہمیشہ فاصلہ رکھا
کرتے ہیں۔ زبیر صاحب کے والد اور خود زبیر صاحب کا ہر طرح کے لوگوں میں
ملنا جلنا، آنا جانا اور بیٹھنا اُٹھنا تھا جنہیں اکثر یہ فکر دامن گیر رہا کرتی کہ اُن کی بہو
اس معاشرتی حد کو محسوس نہ کر لے۔

حوری ہر حال میں خوش رہنے اور لوگوں کو خوش دیکھنے کی اُمید میں
اپنے حال میں مگن رہا کرتی۔ بچے کی پیدائش سے ابتدائی تعلیم تک اُس نے ایک
معیار کو سامنے رکھ کر پیش قدمی کی تھی۔ بچے کے داخلے کے وقت بھی اُس نے کسی قسم
کا سمجھوتہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ محدود اور مخصوص تنخواہ کے حامل سرکاری
ملازم کے لئے ملک کے اعلیٰ ترین سکول میں بچے کو تعلیم دلوانا ایک طرح سے
ناممکنات میں سے ہے اس کے باوجود زبیر صاحب کے والد نے معاملے کی نزاکت کو
محسوس کرتے ہوئے اپنا قطعہ اراضی فروخت کر کے بہو کی خواہش کا احترام کیا۔

بات بظاہر اتنی بڑی نہ تھی جتنا اُسے زبیر صاحب کے غصے اور تکرار
نے بنا دیا تھا۔ اول انہیں والد صاحب کو اعتماد میں لے کر قدم اٹھانا چاہیے تھا، دوئم
وسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حوری کو اعتماد میں لے کر مسئلے کا مناسب حل تلاش کرنے
کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ ایک مہینے کا ایڈوانس دینا مسئلہ نہ تھا مسئلہ مہینے کے مہینے
تنخواہ سے زیادہ کرایہ ادا کرنے اور دیگر اخراجات کے علاوہ بچے کے تعلیمی
اخراجات کا بھی درپیش تھا۔ میاں بیوی کی تُو تکرار سُن کر زبیر صاحب کے والد نے
دونوں کو سامنے بٹھا کر درپیش مسئلے کی بابت دریافت کرنے کی کوشش کی۔ پہلے آپ
پہلے آپ کی تکرار نے مسئلے کو اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ اصل میں دیکھا جائے تو
سرے سے اس مسئلے کو بنیاد بنا کر جھگڑا یا تکرار کرنا ہی فضول تھا۔ اتنے چھوٹے بچے
کی ذرا سی بات پر انتہائی قدم اٹھا لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔

کھچڑی کئی دنوں سے پک رہی تھی۔ کھیلوں کی مانند جھنجھناہٹ کی
آواز سے مسائل میاں بیوی کے اختلاف کا سبب چند دنوں قبل اسکول میں پیش
آنے والا واقعہ تھا۔ زبیر صاحب کے بیٹے خسرو نے اپنی والدہ سے دریافت کیا۔
"ماما ہم کہاں رہتے ہیں۔" حوری نے خسرو کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کہا
"ہم اسلام آباد میں رہتے ہیں۔" "مگر آج تو میں نے عمر سے کہا کہ ہم اسلام آباد میں
رہتے ہیں۔" "اچھا پھر عمر نے کیا کہا؟" "وہ کہنے لگا ہم ایف سیکٹر میں رہتے
ہیں۔ تم کون سے سیکٹر میں رہتے ہو؟" بچے کی بات سُن کر حوری گہری خاموشی میں
چلی گئی۔ بہت سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد شام کو شوہر کی آمد پر حوری نے دو ٹوک
الفاظ میں اعلان کر دیا۔ "میں اپنے بچے کو کسی طرح کے کمپلیکس میں مبتلا نہیں کر
سکتی۔ اگر مجھے اسلام آباد میں رکھنا ہے تو جلد سے جلد ہی ایف سیکٹر میں گھر کا
بندوبست کرو ورنہ جی سیکٹر میں رہنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔"

زبیر صاحب کے والد نے دونوں کی پریشانی اور اُس کی بابت اُن
کے خیالات سُن کر زبیر صاحب سے مسئلے کا حل دریافت کیا تو زبیر صاحب نے
انہیں بتایا کہ انہوں نے اپنے ماتحت کے ذریعے ایف سیکٹر میں گھر کا بندوبست کر
لیا ہے۔ کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ پوری تنخواہ دے کر بھی ایک مہینے کا کرایہ پورا نہیں
ہو سکتا۔ والد صاحب نے اپنی چیک بُک زبیر صاحب کے حوالے کرتے ہوئے
مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی جو زبیر صاحب کی شرمندگی کے ساتھ والد صاحب کو بھی
شرمسار کر گئی۔ والد صاحب نے حوری سے اپنا مکان فروخت کر کے ایف سیکٹر میں
شفٹ ہونے کی پیشکش کی۔ مسئلہ وہی رقم میں عدم توازن کا درپیش تھا۔ زبیر
صاحب کے والد ایف کے بجائے جی سیکٹر میں تین مکان کے مالک ہوتے تب بھی
انہیں فروخت کر کے مسئلہ حل نہ ہوتا تھا۔ تحمل اور تدبر کام میں لاتے ہوئے زبیر
صاحب کے والد نے حوری سے کچھ وقت کی مہلت طلب کر لی جس کی حقیقت سے
وہ اور اُن کے بیٹا، بہو بخوبی آگاہ تھے۔

آہستہ آہستہ گھر کے مکینوں کے درمیان بڑھتے خاموش فاصلے اور
طویل تلخ نوک جھونک سلسلے ایک روزمرہ کی شکل میں چھٹ گئے۔ حوری اور زبیر نے ملک

چھوڑ کر اسٹیٹ میں جوری کی بہن بنوتی کی مدد سے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ نیر صاحب کے والد، والدہ بے کل کی مچھلی کی مانند تڑپنے لگے۔ اس کے سوا اُن کے بس میں تھا بھی کیا؟ بیٹے کی جدائی جس قدر تکلیف دہ تھی اُس سے زیادہ پوتے کو خود سے دور کرنے کا غم گھپ اندھیرے کی مانند دل، دماغ میں پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ روک سکتے تھے، روکنا چاہتے تھے، مگر پھر بھی انہوں نے بیٹے اور بہو کی خواہشات کو اولیت دیتے ہوئے خاموشی کی چادر میں پناہ لینا ہی بہتر سمجھا۔

بند اتش نیر صاحب اسٹیٹ جا کر کافی پریشان ہوئے۔ بیوی کی امریکی شہریت اور شاہ پرستوں پر ایران میں آنے والے انقلاب کے باعث جوری کو آسانی سے ورک پرمٹ مل گیا۔ چند دنوں کی بھاگ دوڑ اور کوشش سے نیر صاحب کے لئے بھی ایک ادارے سے اسپانسر شپ حاصل کر کے ورک پرمٹ اپلائی کر دیا گیا۔ جوری نے ہاؤس وائف کی زندگی کو خیرآباد کہتے ہوئے ورکنگ وومن کا روپ دھار لیا۔ نیر صاحب نے ایک کے بعد ایک کام بدلتے ہوئے نیو یارک شہر کے معروف ڈپارٹمنٹل اسٹور سے مستقل ناتا جوڑ لیا جس میں ان کا سابقہ تجربہ بھی کارآمد ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ تین سال دوسری مرتبہ پانچ سال بعد والدین سے ملنے اکیلے وطن آئے۔ اس کے بعد نیو یارک کی معروف زندگی نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ پلٹ کر والدین یا وطن کی جانب دیکھتے۔ اس دوران قدرت نے انہیں دو اور پھول جیسی بچیوں سے نوازا۔ جوری پاکستان میں بھی اپنے بیٹے سے انگریزی یا فارسی میں گفتگو کیا کرتی تھی اب باقاعدگی سے امریکہ میں تینوں بچے گھر پر فارسی اور گھر سے باہر انگریزی بولتے پڑھتے اور لکھتے تھے۔ کبھی کبھی ماں کی غیر موجودگی میں نیر صاحب بچوں سے اُردو میں بات کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ہونق بن کر باپ کا منہ دیکھنے لگتے۔ نیر صاحب کا بیٹا ہے بچوں کو فارسی اور اُردو کے گہرے رشتے سے آگاہی کے ساتھ مشترک الفاظ اور معنوں سے واقفیت دے کر اُردو اور فارسی کے مضبوط رشتے سے آگاہ کر کے انہیں اُردو کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتے جس کے جواب میں بچوں کا استدلال ہوتا کہ اُردو آپ کی اور آپ کے ملک کی زبان ہے ہم سیکھ کر بھلا کیا کریں گے

جس ماں نے تمام عمر اپنے بچوں کو اعلیٰ حسب نسب، اعلیٰ رہن سہن، اعلیٰ بودوباش اور اعلیٰ سوسائٹی میں اعلیٰ تر مقام حاصل کرنے کی دھن میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ وقت اور حالات کی بے بسی نے اُسی ماں کو صرف پیچھے مڑ کر دیکھنے کے وقت کو پوری قوت سے آواز دیتے اور اندھیروں میں روشنی تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔

فضا میں بارود کی بو اور تازہ انسانی گوشت کے جلتے ہوئے لوتھڑوں کی بدبو اور عالیشان عمارتوں کے انہدام نے انسانی حواسوں کو جس بری طرح روند اور کچلا تھا اُس سے بھی زیادہ بھونڈے پن سے روشن دماغی کے دعوے داروں کے دلوں اور ذہنوں میں تعصب کی آگ بھڑکا دی تھی۔ آس پاس کا ماحول اور پاس پڑوس کے لوگوں میں گرم جوشی باقی نہ رہی تھی۔ جو لوگ نیر صاحب کی داڑھی اور اُن کے مذہبی رکھ رکھاؤ کو عزت و تکریم کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اب عزت یا تکریم کی بجائے اُن کی آنکھوں میں شک و شبہات نمایاں ہونے لگے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ محبت و قربت کی جگہ تنقید و تضحیک نمایاں ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر اُن کے اپارٹمنٹ پر رات کی تاریکی میں بلا وارنٹ پولیس کے چھاپے اور تفتیش نے پوری کر دی تھی۔ گوری تفریق کے نوجوان برملا اُن پر اور اُن کی اولادوں پر آوازیں کستے اور اُن پر بنیاد پرست ہی کی دہشت گرد ہونے کا الزام بھی لگاتے۔ اکثر اُن کے دروازے کے آگے گندگی اور غلاظت کے ڈھیر، کبھی دھمکی آمیز خطوط اُن لوگوں کو ہراساں کرنے کے لئے حربے کے طور پر استعمال کیے جاتے۔ تعلیمی اداروں میں اُن کی اولاد کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ملازمت کے اوقات میں کوئی نہ کوئی گورا اُن کی داڑھی کی بابت چبھتا ہوا سوال کر کے اُن کی پریشانی میں اضافہ کر دیتا۔ وہ لوگ راتوں کو سونے کی بجائے باری باری پہرہ دیا کرتے۔ گھر کا جو فرد بھی سونے کی کوشش کرتا اُسے بھی خواب میں انہی لوگوں کے ڈراؤنے چہرے دکھلائی دیا کرتے جو بہانے بہانے سے انہیں ڈرانے، دھمکانے اور خوفزدہ کرنے کی تدبیر ہی کیا کرتے۔ ماضی اُن کی دسترس میں تھا نہ حال پر انہیں اختیار حاصل تھا۔ مستقبل کی بابت غیر یقینی اتھاہوں پر تھی۔ بار بار سوچنے، غور کرنے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے کے بعد بھی اُن کو اپنی شناخت، اپنی بنیاد، اپنی شہریت، اپنے وطن کی بابت تسلی بخش جواب سجھائی نہ دیتا۔

سینٹر ٹیبل کے ایک جانب رکھی چائے اور دوسری جانب سجے مشروبات، اپنی اپنی خُو چھوڑ کر ایک دوسرے کی وضع اختیار کر چکے ہیں یعنی چائے ٹھنڈی اور مشروب گرم ہو چکا ہے.....

گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر تک موقوف رہنے کے باعث ماحول، سوگوار محفل کا پیش کرنے لگا ہے..... زبانیں گنگ اور آنکھیں بے جان ہو چکی ہیں..... دلوں میں اُلجھن اور ذہنوں میں غبار اٹھنے لگا ہے..... کہنے کو بہت کچھ..... سننے کو بے انتہا..... مگر..... زبانوں پر گنگ کے تالے پڑے ہوئے ہیں..... ہواؤں اور فضاؤں میں چیلوں اور چمگادڑوں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں.....

خاموشی کے سینے میں خنجر بھونکتے ہوئے..... نسوانی آواز کرید اور ٹٹولنے کے معاملات پر گفتگو کرنے کی خواہاں..... جبکہ..... ہماری خواہش..... ایک نامور شخص کی بابت بہت کچھ..... بلکہ..... سب کچھ دریافت کرنے کی ہے.....

دل میں..... کئی دوسرے..... سوالات پھانس بن کر چبھنے لگے ہیں..... مگر..... شاید..... ہمارے اندر..... وہ..... ہمت..... طاقت..... اور..... جرأت کہاں..... جو..... ایسے گمبھیر سوالات دریافت کرنے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے..... ویسے بھی..... ایک دل..... ایک دماغ..... اور..... ایک روح..... تو ہیں..... اور..... نسلوں کا..... کرب..... سہنے کی تاب کہاں رکھتی ہے!!!

سُخنِ معطّر

پروفیسر زُبیر کُنجاہی (راولپنڈی)

جو ہمسفر بِلا' وہ سراپا حیا کا تھا
گزرا وہ اِس طرح سے کہ جھونکا ہوا کا تھا

کِس نے کہا تھا تُم سے کہ سی لو دہانِ زخم
مَر جاؤں گھٹ کے مشورہ کِس آشنا کا تھا

بیٹھا رہا مَیں ذات کے گُنبد میں ہو کے بند
کُچھ اِس طرح اسیر مَیں اپنی انا کا تھا

مَیں گُنبدِ خیال سے نکلا جو ایک شام
ایسا لگا اسیر مَیں اپنی انا کا تھا

وہ عہد خود ہی مٹ گیا' کافور ہو گیا
جِس دورِ ابتلا میں ستم انتہا کا تھا

سب کچھ اُڑا کے لے گیا جو کچھ تھا میرے پاس
کہنے کو یُوں تو ایک ہی جھونکا ہوا کا تھا

جو خاک تھے زُبیرؔ وہ اکسیر ہو گئے
احسان ہم پہ یہ بھی کسی کی عطا کا تھا

O

ملک زادہ جاوید (نوئڈا، بھارت)

اپنی غزلوں میں تازگی رکھنا
عہدِ حاضر کی شاعری رکھنا

ہر شجر کے لئے ضروری ہے
تازہ پودوں سے دوستی رکھنا

عمر بھر بھاگنا پڑے تم کو
خواہشیں اس قدر بڑی رکھنا

دھوپ اور چھاؤں کے توازن سے
اپنی اس فکر کو نئی رکھنا

ان بزرگوں نے صرف سیکھا ہے
اپنے بچوں سے دشمنی رکھنا

طنز کے تیر کھا کے بھی جاویدؔ
تم طبیعت ہری بھری رکھنا

O

نجمہ عثمان (لندن یو کے)

نئی رتوں کے عجب شجر ہیں' ہوا سے کہنا
ہرے تو ہیں اور بے ثمر ہیں' ہوا سے کہنا

جو ہجرتوں کی مسافتیں جھیلتے رہے ہیں
وہ آج بھی یوں ہی دربدر ہیں' ہوا سے کہنا

ہرا ہے وہ' اس کی چاہتوں پر بھی شک ہوا ہے
یہ وحشتوں کے عجیب ڈر ہیں' ہوا سے کہنا

ہوا سے کہنا' نئی اڑانوں کو روک دے اب
کہ کچھ پرندے زمین پر ہیں' ہوا سے کہنا

جو کلفتوں کی مسافتوں سے ہیں تھک کے لوٹے
وہ پھر سے آمادۂ سفر ہیں' ہوا سے کہنا

ہوائے ناسازگار میں بجھ کے پھر جلے ہیں
چراغ یہ بھی تو معتبر ہیں' ہوا سے کہنا

وہ بیٹیاں جن کے بال چاندی سے ہو چلے ہیں
وہ فیصلوں کی منڈیر پر ہیں' ہوا سے کہنا

جو جبر و نفرت کے حبس میں گھٹ کے جی رہے ہیں
ہوائے تازہ کے منتظر ہیں' ہوا سے کہنا

زمیں کی مٹی کے جو امیں تھے نہیں رہے اب
معاملے اب سپردِ زر ہیں' ہوا سے کہنا

سیاہ کاری منافقت سے جو لڑ رہے ہیں
وہ حوصلے بھی صلیب پر ہیں' ہوا سے کہنا

O

ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج بھارت)

یوں تو علاج درد کا آسان تھا بہت
لیکن مرا طبیب پریشان تھا بہت

محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ نہ تھا مجھے
تہذیب سے میں آپ کی انجان تھا بہت

اس نے کیا تھا وار مری پیٹھ پر مگر
خنجر زمیں پہ گر پڑا نادان تھا بہت

لفظوں سے کر سکا نہ کبھی اس کا شکریہ
مجھ پر مرے عزیز کا احسان تھا بہت

سیفی نہ مجھ سے ہو سکا اس میں کوئی کمال
ورنہ یہ شاعری کا تو میدان تھا بہت

O

علیم صبا نویدی (چنئی بھارت)

فلک چھونے والا ہمارا نصیب
غلط شہر آیا بچارا نصیب

جسے دیکھ آیا تھا میں ایک شب
ہوا کب کسے وہ نظارا نصیب

ہے ہر سمت نقلی تبسم کی بھیڑ
کسے سونپ آؤں میں پیارا نصیب

ستاروں نے بڑھ کر جبیں چوم لی
گیا اوج پر جب کنوارا نصیب

خزاں کے بھنور میں کہیں ڈوب کر!
صبا کو ہوا ہے کنارا نصیب

رؤف خیر (حیدرآباد،بھارت)

اثر پذیر ہوئے اتنے قافیئے سے مرے
دیئے جلائے ہیں یاروں نے بھی دیئے سے مرے

سوائے میرے اگر سب دکھائی دیتا ہے
تو آئینہ ہے غلط کار زاویئے سے مرے

سخن نواز سخن سازیوں میں طاق بھی ہے
ہزار معنے نکالے اشاریئے سے مرے

یہ سانپ کیا مری اپنی آستین میں تھا
نکل گیا ہے یہ کانٹا بھی حاشیئے سے مرے

میں آدمی تو کسی اور ہی جہان کا ہوں
مگر قریب کے رشتے ہیں دہریئے سے مرے

ملال یہ ہے کہ میں اس کی دسترس میں نہیں
تعلقات کشیدہ ہیں رویئے سے مرے

ترے خطوط نہ آنے کا دکھ الگ ہے سو ہے
حجاب سا مجھے آتا ہے ڈاکیئے سے مرے

میں اپنی خاک نشینی میں مست اتنا ہوں
کہ تخت و تاج بھی جلتے ہیں بوریئے سے مرے

اسیر کذب کبھی مردِ حق نہیں ہوتا
شگاف پڑ گئے باطل میں توریئے سے مرے

مرے جنوں نے مصلیٰ بنا لیا ہے اُسے
کسی نے پونچھے تھے منہ ہاتھ تولیے سے مرے

رؤف خیرؔ روایت عزیز ہے جن کو
ترائیلے سے ہوئے خوش نہ ماہیئے سے مرے

تابش خانزادہ (نیویارک،امریکہ)

فیصلہ اک جارہانہ کر دیا
جا تو سکتا تھا' بہانہ کر دیا

وقت نے بوڑھوں کو بچہ کر دیا
وقت نے بچہ سیانا کر دیا

تنکا تنکا آشیانے کا بنا
تنکے تنکے آشیانہ کر دیا

آنکھ سے موتی پروئے اور پھر
موتیوں کو دانہ دانہ کر دیا

سرف ہم نے زندگی کا راستہ
آپ کے شانہ بشانہ کر دیا

یوں بھی تابشؔ ماننے والا نہ تھا
ترک ہم نے سر کھپانا کر دیا

O

رب نواز مائل (کوئٹہ)

جیسی حسرت شکن، اب ہر اک یاد ہے
کچھ نہ تھے اُن کے کیا، جو یہ بے داد ہے

شاعری جس سے لیں کیا نہ تشبیہ کو
سو جہاں اس سے بھی کیسا آباد ہے

اِک نظارے نے دیں دِل کو خوشیاں کئی
اِک نظارے سے پھر دِل غم آباد ہے

بعدِ گُزرانِ عُمر اب وہ ایسا ہے کیا
جو کہیں زیست سے ساری برباد ہے

بخش سے کچھ حکمرانوں کے ہاتھوں ہی تو
اِس زمیں پر سدا کوئی اُفتاد ہے

جس کی ہوں خواہشیں ڈھیروں ہو کے بھی کم
ہم کو تو بس وہی مردِ آزاد ہے

O

حصیر نوری (کراچی)

کارہائے دین و دنیا مختصر میں نے کیا
راہ مشکل تھی وفا سے مگر میں نے کیا

پھر بھی تیرا حق ادا میں کر نہ پایا کیا کروں
میرے بس میں بھی نہیں تھا جس قدر میں نے کیا

پیش رفت اس نے ہی کی تھی اس میں میرا کیا قصور
اس پہ طرہ یہ کہ خود کو بے ہنر میں نے کیا

گر نہیں منزل ملی تو یہ مقدر ہے مرا
سمتِ منزل کی طرف گرچہ سفر میں نے کیا

عشق کے عیب و ہنر کا کوئی اندازہ کرے
آہ برلب بھی رہے اور چشم تر میں نے کیا

زندگی کو اب کوئی مجھ سے توقع ہی نہیں
زندگی کو ایسی حالت میں بسر میں نے کیا

ہر جگہ میری شکایت کر رہا ہے وہ حصیرؔ
جبکہ اس کو این و آں سے باخبر میں نے کیا

O

صابرؔ عظیم آبادی (کراچی)

فلک کے چاند تارے بولتے ہیں
جو دیکھو ماہ پارے بولتے ہیں

زباں خاموش جب رہتی ہے اُن کی
نگاہوں کے اشارے بولتے ہیں

سیانے لوگ تو کہتے نہیں کچھ
مصیبت ہی کے مارے بولتے ہیں

کبھی لگتا ہے دریا شور کرنے
کبھی دریا کے دھارے بولتے ہیں

کہیں الفاظ کر لیتے ہیں باتیں
کہیں لہجے ہمارے بولتے ہیں

وہاں چُپ چاپ کیوں رہتی ہیں آنکھیں
جہاں چہرے تمہارے بولتے ہیں

فضا سرگوشیاں کرتی ہے جب بھی
یہ موسم اور نظارے بولتے ہیں

زباں کھلتی نہیں اہلِ زباں کی
جو گونگے ہیں بچارے بولتے ہیں

سیالوں کی عجب فطرت ہے صابرؔ
جو اِک بولا تو سارے بولتے ہیں

ڈاکٹر نثار ترابی (راولپنڈی)

عمر بھر خون ہی رلائے گی
چشمِ نم اور کیا ستائے گی

ہر محبت کا یہ وطیرہ ہے
داغ، سینے پہ چھوڑ جائے گی

روشنی قید ہو نہیں سکتی
یہ تو خود راستہ بنائے گی

عشق جنگل کی آگ جیسا ہے
اور یہ آگ پھیل جائے گی

کیا کریں جب یہی مقدر ہو
زیست ہے، رنج تو اٹھائے گی

رات کھولے گی راز خوشبو کے
اور خوشبو بدن چرائے گی

منتظر ہوں اُسی ہوا کا نثارؔ
جو وفا کا دیا جلائے گی

O

شگفتہ نازلی (لاہور)

چلو! نہر کے کنارے چلیں، بہانہ کریں
خوشی کے پھول بھی سنگ سنگ کھلیں، بہانہ کریں

چھپا کے رکھی ہیں جو تتلیاں کتابوں میں
خیال و خواب میں ہی وہ اُڑیں، بہانہ کریں

پلٹ کے دیکھے بنا دُور تک چلے جائیں
اور واپسی کے نہ رستے ملیں، بہانہ کریں

ہو رات سانولی ایسی کہ سارے چھپ جائیں
ستارے زُلف میں آ کر سجیں، بہانہ کریں

ہاں! رات دیر تک پڑھنے سے ذہن بوجھل ہے
چلو! پہاڑ پہ چڑھتے چلیں، بہانہ کریں

وہ جن کی کھوج میں منزل کا انتظار رہا
وہ سارے راستے ایسے کھلیں، بہانہ کریں

کسی بھی وقت کو ہم طے ہی کر نہیں پائیں
سویرے شام میں ایسے کھلیں، بہانہ کریں

فرازؔ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہا ہو گا
تو آؤ ہم بھی غزل ہی کہیں، بہانہ کریں

عدمؔ کے سارے شگفتہ بہانے کر ڈالے
اور اب شگفتہ طبیعت ملیں، بہانہ کریں!

علی آذر (کراچی)

چُپ چاپ بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا
آنسو بہانے بیٹھنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

جس کی فضا میں ہوں نہ محبت کی خوشبوئیں
ایسے مکاں میں رہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

مجنوں سی محبت ہو یا فرہاد کا جذبہ
مجھ کو ہے پیار کہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

اعمال بتا دیتے ہیں کہ کون ہے یہ شخص
سیّد پٹھان کہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

ہو پیار کے نگینے بھی پہنے ہوئے دلہن
زرباف کپڑے گہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

جو آئیں نہ سمجھ میں کسی کی علی آذرؔ
اشعار ایسے کہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا

O

مشتاق شبنم (کراچی)

وہ مجھ سے ملتا رہا ہے عجب کمال کے ساتھ
وہ وجہِ راحتِ جاں بھی رہا ملال کے ساتھ

خلیج بڑھتی گئی قربتوں میں دوری کی
عجیب ہجر کی منزل ملی وصال کے ساتھ

میں کیا جواب دوں حسنِ طلب کے قیدی کو
وہ جب بھی ملتا ہے مجھ سے نئے سوال کے ساتھ

تضاد اس کے ہیں اسلوب و طرز میں ایسے
یقیں کا شائبہ شامل ہے احتمال کے ساتھ

وگرنہ آدمی پھر آدمی نہیں رہتا
خوشی و رنج ضروری ہے اعتدال کے ساتھ

یہی ہے مصلحتِ وقت کہ سمجھتے سچ
وہ جھوٹ بول رہا ہے بڑے کمال کے ساتھ

مسیحِ وقت کا یہ بھی ہے معجزہ شاید
ہرے ہوئے ہیں کئی زخم اندمال کے ساتھ

ہزار منظر خوش رنگ میں رہا شبنم
بھلا سکا نہ میں ماضی کو اپنے حال کے ساتھ

O

فیصل عظیم (کینیڈا)

ایک اڑتی ہوئی خبر میں ہوں
کچھ زبانوں پہ، کچھ نظر میں ہوں

اپنے گھر کا پتہ بتاؤں کیا
کتنی نسلوں سے میں سفر میں ہوں

راستے میں ہوں آج بھی شاید
یوں سمجھ لیں کہ اپنے گھر میں ہوں

کیجئے کیا شکایتیں مجھ سے
میں بھی حالات کے اثر میں ہوں

پاؤں مٹی میں دھنسنے لگتے ہیں
اس لئے مستقل سفر میں ہوں

جانے کل میرے بعد کیا ہو گا
میں جو تہذیب کے کھنڈر میں ہوں

O

پروین حیدر (کراچی)

اہتمام اور اس قدر مجھ عشق پرور کیلئے
کتنی تلواریں کھنچی ہیں اک مرے سر کیلئے

چاندنی پر گفتگو کیسے کریں وہ بام و در
لکھنے والے نے لکھی ہو دھوپ جس گھر کیلئے

آسمانوں پر کہاں تھیں خاکداں سی رونقیں
ترک کمتر کو کیا ہے ہم نے برتر کیلئے

سرد پیکر نیند کا' آنکھوں میں میری صبح تک
کروٹیں لیتا رہا خوابوں کی چادر کیلئے

سسکیاں لیتے ہوئے تہذیب کے ایوان کو
کتنا خوں درکار ہے دیوار اور در کیلئے

ہے سرابوں کا سفر زار سفر ہیں آبلے
دسترس میں تھا یہی پیاسے سمندر کیلئے

باعثِ تخلیق آئنہ ہے میرا عکسِ ذات
آئنہ خانے بنے ہیں میرے پیکر کیلئے

اک دریدہ جسم کو بس خاکِ صحرا تھی کفن
سائبانِ بیکسی تھا اک کھلے سر کیلئے

یہ سخن تحلیل ہے جس میں مرے دل کا لہو
آئنہ ہے دشمنِ پروین حیدر کیلئے

شہاب صفدر (ڈیرہ اسمٰعیل خان)

ہاں ہمیں اک دوسرے کو بھول جانا چاہیے
اور بھی کچھ فرض ہیں جن کو نبھانا چاہیے

جب کیا ہم سے ہماری خوش نصیبی نے گریز
لازمی ہے تم کو بھی دامن چھڑانا چاہیے

شاہزادی دیو کے چنگل سے باہر آ سکے
اب کہانی میں کچھ ایسا موڑ آنا چاہیے

کر دیا مجھ کو مری محرومیوں نے زودرنج
ہو سکے تو دوست کم کم مسکرانا چاہیے

ہے مری تنہائیوں کی اب یہی حسرت شہابؔ
اُس کے آگے آنسوؤں میں دل بہانا چاہیے

O

پرویز ساحرؔ (ایبٹ آباد)

شکستِ فاتحانہ چاہتا ہوں
میں خود کو آزمانا چاہتا ہوں

میں اپنی موت سے پہلے جہاں میں
کوئی پودا لگانا چاہتا ہوں

مری پرواز کو کم ہے یہ وسعت
فضائے بے کرانہ چاہتا ہوں

زمانہ ہو گیا ہے دل لگائے
نیا صدمہ اُٹھانا چاہتا ہوں

بھلا کب تک پھروں یوں دربدر میں
کسی دل میں ٹھکانہ چاہتا ہوں

ابھی مجھ میں ہے جینے کی تمنا
ابھی میں چہچہانا چاہتا ہوں

بڑی مدت رہا خود سے میں ناراض
سو اَب خود کو منانا چاہتا ہوں

جہاں سے میں نکلوایا گیا تھا
اُسی کوچے میں جانا چاہتا ہوں

کبھی جو میرے نام اُس نے لکھے تھے!
وہ سارے خط جلانا چاہتا ہوں

کسی صورت نہیں بنتا جو میرا
اُسے اپنا بنانا چاہتا ہوں

میں اپنا خاک داں ہوتے ہوئے بھی
فلک پر آشیانہ چاہتا ہوں

عجب اک آرزو ہے مجھ میں ساحرؔ
اُفق کے پار جانا چاہتا ہوں

پروفیسر گل محمد خان (جنوبی وزیرستان)

اُس کا مسکرانا کچھ بے سبب نہ تھا
دل مرا مائل بہ کرم جب نہ تھا

وہ آئے مسکرائے گلے ملے
اک شخص جو اب مری طلب نہ تھا

خود سے اُلجھ پڑے اکثر یہ سوچ کر
وہ تو مرے دل کا سرور و جذب نہ تھا

نگاہیں وہ ہم سے کیا ملاتا کہ!
حوصلہ اس میں ملانے کا اب نہ تھا

آیا تھا وہ بانہوں میں باہیں ڈالنے
پر اب کے اداؤں میں وہ غضب نہ تھا

نظرِ عنایت اب وہ نہ رہی مجھ پر
خدا کیا سمجھوں کہ وہ مرا رب نہ تھا

O

قرطاسِ احترام

مانک ٹالا

نام

نام: گوپال کرشن مانک ٹالا
قلمی نام: مانک ٹالا
والدین: شری رام رتن شریمتی بسنت دیوی (مرحومین)
پیدائش: ۲۱ ستمبر ۱۹۲۲ء (اقبال پورہ لاہور)
تعلیم: بی ایس سی (B.Sc) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ملک کی تقسیم سے پہلے ایم اے (انگریزی) اور ڈپلوما ان جرنلزم (Diploma in Journalism) میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تقسیم کے بعد ناساعد حالات کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

تصانیف: (I) تخلیقی ادب:

(۱) پیاسی چتل (افسانے) اپریل ۱۹۶۲ء
(۲) گنگا کا رشتہ (افسانے) جولائی ۱۹۷۳ء
(۳) ماڈرن قصہ چار درویش (مزاحیہ وطنزیہ ناولٹ)
(۴) دامن کی آگ (ناولٹ) ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۶ء کے دوران شائع ہوئے
(۵) پنجرے کے پنچھی (افسانے) ستمبر ۱۹۸۴ء
(۶) عورت کا دوسرا جنم (افسانے) فروری ۱۹۹۹ء

(II) تحقیقی وتنقیدی ادب:

(۱) پریم چند اور تصانیف پریم چند کچھ نئے تحقیقی گوشے (نومبر ۱۹۸۵ء)
(۲) پریم چند کچھ نئے مباحث (اکتوبر ۱۹۸۸ء)
(۳) پریم چند..... حیاتِ نو (جولائی ۱۹۹۳ء)
(۴) پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین (تحقیق و تالیف، اپریل ۲۰۰۱ء)
(۵) توقیتِ پریم چند (۲۰۰۲ء)

(III) ترتیب وتدوین:

"زمانہ پریم چند نمبر" کی نئے سرے سے تدوین کی اور بہت سی تحقیقی خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لئے پیش گفتار کے ساتھ حاشیے بھی تحریر کئے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو کی طرف سے جولائی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔

(IV) متفرقات:

بیادِ اردو ادب اوران یوسف (متفرق تحقیقی تنقیدی اور تخلیقی مضامین) (اکتوبر ۲۰۰۵ء)

جناب مانک ٹالا کم گو گوشہ نشین ہیں۔ بہت کم ادیبوں سے ملاقات ہے اور بہت ہی کم سیمیناروں میں حصہ لیتے ہیں۔ بہاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ نے تین تصانیف پر پہلے انعام کا حق دار سمجھا۔ بہار اسٹیٹ اردو اکادمی کمیٹی نے "پریم چند کچھ نئے مباحث" پر دوسرے اور "پریم چند حیاتِ نو" پر پہلے انعام سے نوازا۔ اسی اکادمی نے اپنے سب سے بڑے ایوارڈ .... سراج انور آبادی ایوارڈ (1996-97) سے نوازا۔

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے 7-6 دسمبر 2005 کو پریم چند کے 125 ویں یوم ولادت پر ایک سیمینار رکھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں عزت مآب ڈاکٹر اختر حسین رضوی نے ایک شال اور گلدستہ ان کی نذر کئے (پریم چند سے متعلق خدمات کے سلسلے میں) اسی موقع پر جناب یوسف ناظم نے نئی تصنیف کتاب "بیادِ اردو ادب اوران یوسف" کا اجرا بھی کیا۔

سدابہار تخلیق کار

مانک ٹالا

پریم چند کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عنفوانِ شباب میں "طلسمات ہوش ربا" اور "چندر کانتا" جیسی ہزار ہا صفحات کی طلسماتی اور منطق سے عاری داستانوں کو بڑے انہماک اور دلچسپی سے پڑھنے کے باوجود اردو اور ہندی فکشن کو ان طلسماتی داستانوں کی غیر فطری فضاؤں کی بلندیوں سے دھرتی کے سینے پر اتار کر زندگی کی سنگین سچائیوں سے بڑے فنکارانہ طریقے سے روشناس کرایا۔ انہوں نے ٹیگور، بنکم وغیرہ کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب کے جدید فکشن کا مطالعہ کیا تھا، جس نے ان کے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑا تھا۔ نتیجے میں انہوں نے اردو اور ہندی فکشن کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس لحاظ سے موصوف کو بلاشبہ اردو اور ہندی فکشن کے نئے اسلوب و نئی ڈگر کا بانی اور پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

پریم چند کا جنم ایک نہایت ہی غیر معروف سے گاؤں لمہی میں ایک نچلے متوسط گھرانے میں ہوا تھا۔ بچپن اور زندگی کا بڑا حصہ اس دیہات میں ہی گزرا۔ ابتدائی زندگی عسرت اور بعد کی زندگی مسلسل جد و جہد میں بسر ہوئی۔ اس باعث ان کا مشاہدہ بہت گہرا و وسیع تھا۔ اس زمانے کی مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی تحریکوں نے بھی ان کے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ نتیجے میں حقیقت پسندی کے رجحان سے مملو ان کی تخلیقات اس زمانے کے قاری کے لیے بالکل نئی اور انوکھی بات تھی۔ چنانچہ ان کی تخلیقات کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ پریم چند نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں تین سو کے لگ بھگ کہانیاں اور چودہ چند ناولوں کو خوب خوب موضوعات سے سجا سنوار کر پیش کیا۔ اس کے علاوہ درجنوں معیاری مقالوں، تبصروں اور ترجموں کا انبار بھی لگا دیا۔

پریم چند کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کے روز بنارس سے چار پانچ میل کی دوری پر بسے ہوئے ایک غیر معروف، چھوٹے سے گاؤں لمہی میں ایک کائستھ، سری واستو گھرانے کے ایک نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی سے ڈاک منشی عجائب لال کے گھر ایک خوبصورت، گورے چٹے بچے نے جنم لیا۔ گھر بھر میں خوشیاں منائی گئیں، خاص کر اس لیے بھی کہ تین بیٹیوں کے بعد نرینہ اولاد کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ باپ نے اس سرخوشی کے عالم میں بچے کا نام دھنپت رائے رکھا۔ گھر میں اسے پیار سے نواب کے نام سے پکارا جانے لگا لیکن بچے کا بچپن اور عنفوانِ شباب عسرت کی گود میں گزرا، ایسے میں دھن اور دولت اور نوابی ٹھاٹھ باٹھ کہاں۔ دھنپت رائے کو زندگی میں بھی دھن دولت کمانے کے لیے مسلسل جد و جہد کرنا پڑی اور نوابی آن بان اس سے کوسوں دور رہی اور وہ انجام کار وسط درجے کی زندگی ہی گزار سکا۔

پانچ سال کی عمر میں لمہی سے متصل موضع لال پور گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں اس کی اردو اور فارسی کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

منشی عجائب لال کے مختلف مقامات پر تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے باپ کے پاس چلا جاتا، کبھی گاؤں ہی میں رہ جاتا۔ اس لیے ابتدائی تعلیم مناسب طور پر نہ ہو سکی۔

دھنپت کی عمر بمشکل سات یا آٹھ سال کی تھی۔ منشی عجائب لال ان دنوں الٰہ آباد میں تھے اور وہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ وہیں گیا ہوا تھا۔ یہاں ایک طویل بیماری کے بعد اس کی شفیق ماں اسے روتا بلکتا چھوڑ کر بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔

پہلی بیوی کی وفات کے لگ بھگ ایک سال کے اندر اندر منشی عجائب لال نے دوسری شادی کر لی۔ دھنپت کی سوتیلی ماں ایک روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ وہ انتہائی سخت گیر اور بد دماغ تھی۔ اس کی بد سلوکیوں کے باعث دھنپت کو اپنی شفیق ماں کی یاد بہت ستایا کرتی اور وہ اکیلے میں بیٹھ کر رو دھو کر اپنے دل پر لگی چوٹوں پر مرہم رکھ لیا کرتا۔

۱۸۹۲ء میں منشی عجائب لال کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا۔ وہاں دھنپت کو اندازاً تیرہ سال کی عمر میں ایک باقاعدہ اسکول میں چھٹے درجے میں داخل کرا دیا گیا۔ اسکول کی پڑھائی کے دوران دھنپت کو کہانیاں اور ناول پڑھنے کا چسکا لگ گیا۔ قریب کے ایک کتب فروش کی دکان پر کھڑے کھڑے شرر، سرشار، مرزا رسوا وغیرہم کے ناول اور رینالڈس کے ناولوں کے ترجمے پڑھ ڈالے۔

دراصل قدرت کا کیمیا گر ایسے سامان اور حالات پیدا کر رہا تھا کہ یہ دھن چھو کر زندگی میں آگے چل کر ایک بڑا تخلیق کار بن سکے۔ قدرت نے اپنی کیمیاگری سے پیتل کو سونے میں تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا اور وہ خود اوٹ پٹانگ کہانیاں لکھنے لگا لیکن جب دوبارہ پڑھ کر اسے تسلی نہ ہوتی تو خود ہی پھاڑ ڈالتا۔

عجائب لال نے خود تو ادھیڑ عمر میں شادی کرنے کی غلطی کی ہی تھی لیکن ۱۸۹۵ء کی ابتدا میں دھنپت کی بھی شادی کرا دی۔ دھنپت کی بیوی بھدی، موٹی، سیاہ فام اور پھوہڑ تھی۔ ساس بہو میں اکثر و بیشتر لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ ہوتا رہتا۔

اس سال کے ختم ہوتے ہوتے عجائب لال کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور گھر بھر کی کفالت کا ذمہ دھنپت کے سر پر آن پڑا۔ ساری جمع جتھا تو والد کی بیماری اور تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئی۔ نتیجتاً اگلے سال کے اوائل میں میٹرک کا امتحان نہ دے سکا۔ یہ امتحان اس نے اگلے سال ۱۸۹۹ء کے اوائل میں دیا۔

اسکول کی فیس معاف ہو گئی تھی اور دھنپت پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک ٹیوشن دے کر گھر کا خرچ چلاتا۔ نتیجے میں دوسرے درجے ہی میں پاس ہو سکا۔ اس باعث کسی کالج میں بھی اس کا داخلہ نہ ہو سکا کیوں کہ دوسرے درجے میں پاس ہونے والے طالب علموں کی فیس معاف نہیں ہوتی تھی۔ ادھر علم الحساب میں بھی وہ بہت کمزور تھا اور ریاضی ایک لازمی مضمون تھا۔ دھنپت کا ارادہ اونچی تعلیم حاصل کر کے وکیل بننے اور زندگی میں اونچا مقام حاصل کرنے کا تھا لیکن سب ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔

تاہم وہ ناامید نہیں ہوا۔ اس نے بنارس جا کر کسی لائبریری میں بیٹھ کر ریاضی کے مضمون کو پختہ کرنے کی ٹھانی۔ ایک دوست کی معرفت اسے ایک وکیل کے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے پانچ روپے کی نوکری مل گئی۔ وکیل صاحب نے اپنے اصطبل کے اوپر رہنے کے لیے ایک کوٹھری بھی دے دی۔ اس نے گھر میں لازماً تین روپے ماہوار بھیجنا شروع کر دیے۔ دو روپے میں اپنا خرچ چلاتا۔ ایک وقت کا کھانا خود ہی صبح کے وقت بنا لیا کرتا۔ دوپہر سے پہلے کھانا کھا کر ایک لائبریری میں علم الحساب کو پختہ کرنے کے ارادے سے جاتا' لیکن حساب تو ایک بہانہ تھا۔ وہاں ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد انہی دنوں پڑھا۔ چندرکانتا سنتتی بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی لائبریری میں جتنے مل سکے پڑھ ڈالے۔

کچھ عرصہ بعد چنار گڑھ کے ایک مشنری اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹری کی مطلی اٹھارہ روپے ماہوار پر مل گئی لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے ایک رفیق کار مولوی ابن علی سے ہو رہی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی تو مولوی صاحب کے ساتھ دھنپت رائے کو بھی نوکری سے نکال دیا گیا۔

کافی جدوجہد کے بعد بہرائچ کے سرکاری اسکول میں ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کے روز نائب ہیڈ ماسٹر کے طور پر بیس روپے ماہوار پر اس کی تقرری ہو گئی۔ وہاں سے دو تین ماہ بعد اس کا تبادلہ پرتاپ گڑھ میں ہو گیا۔ پرتاپ گڑھ میں وہ ایک باذوق لوگوں سے اس کی راہ و رسم بڑھی اور دھنپت کے ادبی ذوق کو بھی مہمیز لگی۔ وہ افسانے لکھ کر اپنے دوستوں کو سنا کر ان سے مشورہ لیتا۔ تاہم منزل ابھی دور تھی۔

ادھر انیسویں صدی نے آخری ہچکی لی' ادھر بیسویں صدی نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے دامن میں ایک نئے ادیب کی سوغات بھر لائی جو دھنپت رائے' نواب رائے کے ناموں سے لکھتا لکھتا آخر پریم چند کے نام سے مشہور و مقبول ہوا۔

دھنپت رائے نے سوچا کہ اگر مقدر میں درس و تدریس کے پیشے ہی کی غلامی لکھی ہے تو کیوں نہ ٹریننگ حاصل کر کے مستقبل کی ترقی کی راہیں ہموار کی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے نصف تنخواہ پر دو سال کی چھٹی حاصل کی اور الٰہ آباد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں ۲ جولائی ۱۹۰۲ء کو داخلہ لے لیا۔

اس قیام کے دوران ان کی پہلی ناول نما تحریر "اسرار معابد" کے نام سے ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء تک بنارس کے ایک غیر معروف ہفتہ وار اخبار "آوازہ خلق" میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس سے غالباً کچھ یافت بھی ہوئی ہو گی۔ یہ تحریر دھنپت رائے عرف نواب رائے کے نام سے شائع ہوئی۔

یہ ناول نما تحریر آریہ سماج کی سماجی' اصلاحی اور اخلاقی تحریک سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ یہ بہت ناقص اور مبتدیانہ تحریر تھی جس کا پلاٹ بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اس میں رتن ناتھ سرشار کے طرز تحریر کی نقل کی گئی تھی۔ وہی شگفتگی و رنگینی آمیز طرز نگارش لیکن مولوی مدن کی سی بات کہاں۔ اس میں مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کی عیش کوشیوں' خرمستیوں اور حرام کاریوں کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ لیکن ایک بالغ نظر اور حساس ادیب کی منزل بھی کافی دور تھی۔

چنانچہ یہ ناول نما تحریر کبھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی اور نہ ہی پریم چند نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے تاہم انہوں نے اپنی مستقبل کی تخلیقات میں کئی مقامات پر اس خام مواد کو بہت بہتر طور پر استعمال کیا ہے۔

انہوں نے ٹیچرز ٹریننگ کے ساتھ ساتھ اسپیشل ورنیکلر (اردو ہندی) کا امتحان بھی دیا اور مئی ۱۹۰۴ء کے اواخر میں واپس پرتاپ گڑھ پہنچ گئے اور اپنے پرانے عہدے کا چارج سنبھالا۔ پرتاپ گڑھ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد "زمانہ" کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم سے ان کی خط و کتابت کی ابتدا ہوئی جو آہستہ آہستہ گہری دوستی میں بدل گئی اور آخری دم تک چلی۔ خط و کتابت کے کچھ عرصہ بعد ان کے مضامین نواب رائے کے نام سے "زمانہ" میں یکے بعد دیگرے شائع ہونے لگے۔ ابتدا کتابوں پر تبصرے سے ہوئی۔ پھر سوانحی اور متفرق مضامین بھی شائع ہونے لگے۔

نو ماہ بعد انہیں الٰہ آباد کے ماڈل اسکول میں عارضی طور پر ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء کے وسط میں ان کا تبادلہ کانپور ہو گیا۔ منشی دیا نرائن نگم کو جب ان کے اس تبادلے کا پتہ چلا تو نگم صاحب نے انہیں اپنے ہاں قیام کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ عارضی طور پر نگم صاحب کے ہاں ٹک گئے۔

اس کے بعد ان کا ایک ناول "ہم خرما و ہم ثواب" وسط ۱۹۰۶ء میں نول کشور پریس' لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اسی سال کے اواخر میں ان کا دوسرا ناول "کشنا" کے نام سے میڈیکل ہال پریس' بنارس کی طرف سے شائع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے "ہم خرما و ہم ثواب" کا ہندی میں ترجمہ کروا کر انڈین پریس' الٰہ آباد سے شائع کروایا۔ اس ناول کے توسط سے ہندی کے قاری بھی ان کی پہلی تخلیق سے روشناس ہوئے۔

۱۹۰۶ء کی گرما کی تعطیلات میں دھنپت رائے/نواب رائے اپنے گاؤں لمہی میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ساس بہو کے جھگڑوں اور بیوی کی بدکلامی سے تنگ آ کر انہوں نے اسے ہمیشہ کے لیے اس کے میکے بھیج دیا۔ اواخر ۱۹۰۷ء کے آس پاس انہوں نے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود موضع سلیم پور کی ایک

بال بدھوا شیورانی دیوی سے شادی کرلی۔

"زمانہ" کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں ان کا پہلا افسانہ "عشق دنیا اور حبِ وطن" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ چار دیگر غیر مطبوعہ کہانیاں شامل کر کے "سوزِ وطن" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب 'زمانہ پریس' سے شائع کرالی۔ اس میں بیشتر کہانیاں جذبۂ حبِ وطن سے رنگی ہوئی تھیں۔

اواخر جون ۱۹۰۸ء میں انھیں ترقی دے کر ضلع ہمیر پور میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز بنا دیا گیا۔ انھیں قرب و جوار کے دیہاتوں کے اسکولوں میں جانے کے لیے دورے کرنا پڑتے تھے۔ انہوں نے مہوبا کو مستقر بنا کر دوروں کا کام شروع کیا۔

۱۹۰۹ء کے اواخر میں سی۔آئی۔ڈی کے توسط سے ضلع کلکٹر کو پتہ چلا کہ نواب رائے کے نام سے "سوزِ وطن" جیسی حبِ وطن سے معمور کہانیاں لکھنے والا شخص دراصل دھنپت رائے ہے جو اس علاقے میں سب ڈپٹی انسپکٹر ہے۔ صاحب نے اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ کتاب کی ایک جلد اس کے سامنے پڑی تھی۔ کلکٹر کے پوچھنے پر دھنپت رائے نے اقرار کیا۔ صاحب بہت ناراض ہوئے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ غیر فروخت شدہ ساری کی ساری کتابیں صاحب کے حضور میں پیش کی جائیں اور یہ کہ آئندہ وہ محکمے کی منظوری کے بغیر کوئی چیز شائع نہیں کروائیں گے۔ دھنپت رائے نے سمجھا کہ سستے چھوٹے۔ انہوں نے اپنے اسٹاک میں پڑی ہوئی سب جلدیں کلکٹر کی خدمت میں پیش کر دیں، جنہیں اس نے ضائع کروا دیا۔ نگم صاحب کے اسٹاک میں پڑی ہوئی جلدوں کی کسی نے سدھ نہ لی اور وہ آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔

نواب رائے کا قلمی نام ترک کرنے کے بعد انہوں نے فرضی ناموں سے لکھنا شروع کیا لیکن اس سے انھیں ذہنی تسکین نہیں ملتی تھی۔ آخر نگم صاحب کے مشورے سے انہوں نے "پریم چند" کا قلمی نام اختیار کیا۔ اس بات کا انھیں ملال تھا کہ اتنے برس تک انہوں نے نواب رائے کا نام فروغ دینے میں جو محنت کی تھی وہ اکارت گئی لیکن انھیں کیا پتہ تھا کہ پریم چند کا نام آخر کار انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گا۔

بہرحال پریم چند کے نام سے ان کی پہلی کہانی "بڑے گھر کی بیٹی" 'زمانہ' کے دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں شائع ہو کر مشہور و مقبول ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب ہندی میں بھی انہوں نے اپنی اردو کہانیوں کے ترجمے شائع کرانے شروع کر دیے۔ ہندی میں بھی ان کی بہت پذیرائی ہوئی اور امید سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ آخر ہندی میں لکھنے کی مشق کر کے ۱۹۱۵-۱۶ء کے قریب براہِ راست ہندی میں بھی لکھنے لگے۔

مہوبا پہنچنے کے بعد وہ راجپوتانہ کی تاریخ کے سچے واقعات سے متعارف ہوئے۔ ان واقعات کو انہوں نے اپنی انشا پردازی کے سہارے سجا سنوار کر افسانوں کے روپ میں پیش کیا۔ یہ افسانے تھے۔ رانی سارندھا، راجہ ہر دول، آلھا، نگاہ کا اگن کنڈ، راج ہٹ وغیرہ۔ ان کہانیوں کے توسط سے پریم چند سارے ملک اور قوم کو شجاعت، بہادری اور حمیت کا سبق دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ راجپوتوں کو آپسی پھوٹ کے مضر نتائج سے بھی آگاہ کرتے ہوئے بین السطور میں ساری قوم کو ایک طاقتور تنظیم یعنی برطانوی حکومت کے خلاف متحد ہو کر لڑنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

مہوبا میں قیام کے دوران انہوں نے دیہاتیوں اور زمینداروں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ بذاتِ خود دیہات ہی کے رہنے والے تھے اور دیہاتی زندگی سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ اس قیام کے دوران ان کے ذہن میں کئی کہانیوں نے جنم لیا۔ کچھ کہانیاں بڑی تلخ حقیقت نگاری کی مظہر ہیں۔ طنز و مزاح سے بھرپور چٹکلے کوزے میں سمندر سمیٹ لاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں نہ صرف زمینداروں کے مظالم کا تذکرہ ہے بلکہ کسانوں کی آپسی پھوٹ اور سر پھٹول کے منظر بڑے فنکارانہ طریقے پر پیش کیے ہیں۔ اس زمانے کے آس پاس لکھی گئی کہانیوں میں۔ بےغرض محسن، نالۂ عمر، خون سفید، ماؤں کی رات اور دیا تا زمیندار نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ اس سے پہلے ایک بہت ہی مقبول کہانی "پنچایت" 'زمانہ' کے مئی جون ۱۹۱۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جو پنچایتی انصاف اور ہندو مسلم اتحاد کی مظہر ہے۔

مہوبا کی آب و ہوا اور دن رات کے دوروں کے نتیجے میں انھیں پیچش کی بیماری لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی درخواست پر انھیں یکم جولائی ۱۹۱۴ء کو بستی میں بھیج دیا گیا، لیکن یہاں کی آب و ہوا اور دورے بھی انھیں راس نہیں آئے۔ آخر ان کی استدعا پر انھیں بستی کے ہائی اسکول میں بطور اسسٹنٹ ماسٹر تعینات کر دیا گیا۔ اس عہدے کا چارج انہوں نے ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو لیا۔

۱۲ اگست ۱۹۱۶ء کو ان کا تبادلہ گورکھپور میں کر دیا گیا۔ یہاں ان کا تعارف رگھوپتی سہائے فراق سے ہوا جو دوستی میں بدل گیا۔ پریم چند نے ۱۹۲۳ء میں جب سرسوتی پریس جاری کیا تو فراق صاحب بھی اس کے ایک حصہ دار تھے۔ یہیں ان کی دوستی "ہندی پستک ایجنسی" کے مالک مہاویر پرشاد پودار سے بھی ہوئی۔ پودار صاحب کا کلکتہ میں ایک پرنٹنگ پریس بھی تھا جہاں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پریم چند کی کہانیوں کے چار پانچ مجموعے اور دو ناول شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

اس دوران تحریک آزادی زور پکڑنے لگ گئی تھی۔ کانگریس نے آخر کار سرکار کے ناجائز رویے سے تنگ آ کر گاندھی جی کی رہنمائی میں ترکِ موالات کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران گاندھی جی نے ملک بھر میں طوفانی دورے شروع کر دیے۔

ان ہی دوروں کے دوران گاندھی جی ۸ فروری ۱۹۲۱ء کو گورکھپور پہنچے۔ غازی میاں کے میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ پریم چند خرابی صحت کے باوجود بیوی بچوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچے۔ گاندھی جی کی تقریر نے

ان پر جادو کا اثر کیا اور انہوں نے غلطی کی سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ گھر آکر بیوی سے مشورہ کیا۔ آخر کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے ۱۴ فروری کو استعفیٰ دے دیا اور ۱۵ فروری کو سرکاری ملازمت سے نجات حاصل کر لی۔

اب مستقل ذریعۂ معاش کا مسئلہ درپیش ہوا۔ تحریر و تالیف سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ چرخوں کا کاروبار شروع کیا جو جلد ہی ٹھپ ہو گیا۔ اسی سال ۲۳ جون کو کانپور کے مارواڑی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی لیکن اسکول کے منیجر سے نہ بن سکی۔ اگلے سال پھر بنارس واپس آکر پہلے ماہنامہ "مریادہ" میں عارضی ایڈیٹری کی۔ پھر بنارس ودیا پیٹھ کے اسکولی حصے کے ہیڈ ماسٹر بنے۔ اگلے سال جولائی ۱۹۲۳ء میں یہ اسکولی حصہ بند کر دیا گیا تو پریم چند کو بھی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تاہم اس دوران وہ بنارس میں اپنا پرنٹنگ پریس کھولنے کا ڈول ڈال چکے تھے۔ آخر ۳۰ جولائی کے روز ان کا پرنٹنگ پریس "سرسوتی پریس" کے نام سے جاری ہو گیا۔ اس کے چار حصے دار تھے۔ پریم چند، ان کا سوتیلا بھائی مہتاب رائے، چچیرا بھائی بلدیو لال اور فراق گورکھپوری۔ آخری دو حضرات غیر فعال یعنی سلیپنگ پارٹنر تھے۔ کام کرنے والے صرف پریم چند اور مہتاب رائے تھے۔ لیکن دونوں ہی کاروباری سوجھ بوجھ کے مالک نہیں تھے۔ پریس لگاتار نقصان میں چلتا رہا۔ پریم چند اپنی ذاتی آمدنی سے تھوڑا بہت پیسہ جھونکتے جا رہے تھے۔ انہیں یہ فکر ستاتی تھی کہ حصہ داروں کو ان کے حصہ کا منافع نہیں تو کم از کم سود کی رقم ہی ملتی رہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ آخر اگست تا ستمبر ۱۹۲۴ء میں پریس مہتاب رائے کے حوالے کر کے گنگا پستک مالا کے بانی دلارے لال بھارگو کے ادبی مشیر کے طور پر ایک سو روپیہ ماہوار پر لکھنؤ تشریف لے گئے لیکن ایک سال بعد پریس کی فکر انہیں پھر بنارس کھینچ لائی۔ اس دوران میں ان کا طویل ناول رنگ بھومی (چوگانِ ہستی) گنگا پستک مالا کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی بہت دھوم مچی۔ جنگ آزادی کے ساتھ اس میں اور بہت سے مسائل کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن پانچ ہزار کا تھا لیکن اس سے ملی رائلٹی کا بیشتر حصہ پریس ہی کے پیٹ کا گڑھا بھرنے میں صرف ہو گیا۔

دوسری طرف فروری ۱۹۲۲ء میں چورا چوری کے پرتشدد ہنگامے سے بددل ہو کر گاندھی جی ترک موالات کی تحریک کے خاتمے کا اعلان کر چکے تھے اور فرقہ وارانہ عناصر نے برطانوی حکومت کی شہ پر ملک کی فضا مسموم کرنا شروع کر دی تھی۔ "شدھی" اور "تبلیغ" کی تحریکوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند کے قومی جذبات کو ٹھیس لگی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کئی مضمون اور افسانے شائع کرائے اور کئی فرقہ وارانہ کتابوں اور کتابچوں پر انتہائی سخت الفاظ میں تبصرے کیے۔

پریم چند "سرسوتی پریس" کا چارج مہتاب رائے سے لے چکے تھے۔ لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود اس کی حالت نہ سدھار سکے۔ آخر ۱۹۲۷ء فروری کے اواخر میں انہیں لکھنؤ میں دو سو روپے ماہوار پر "مادھوری" کے مشترک مدیر کے طور پر نوکری مل گئی۔ اس دوران بلدیو لال اپنی نوکری سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ پریس کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ اس کے ساتھ اوپری دیکھ ریکھ اور جاب ورک (Job Work) کے لیے پرواسی لال ورما کو منیجر بنا دیا۔

"مادھوری" کی نوکری کے دوران ان کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ 'مادھوری' کے جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں ان کی ایک کہانی "موٹے رام شاستری" کے نام سے شائع ہوئی جس میں اہل پیٹو پنڈتوں کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ لیکن لکھنؤ کے ایک وید شالگ رام نے سمجھا کہ موٹے رام کی آڑ میں ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس نے مقدمہ دائر کر دیا لیکن دو ایک پیشیوں کے بعد یہ مقدمہ خارج ہو گیا اور پریم چند باعزت طور پر بری کر دیے گئے۔

دراصل پریم چند نے اہل برہمنوں کا ایک نمائندہ کردار ۱۹۱۶ء میں اپنے ناول "جلوۂ ایثار" میں تخلیق کیا تھا۔ انہوں نے اس کہانی کے قبل اور بعد میں بھی اس فرضی نام سے کئی کہانیاں تخلیق کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

'مادھوری' کی نوکری کے دوران انہوں نے اپنا ماہنامہ 'ہنس' بھی اپنے پریس سے مارچ ۱۹۳۰ء میں جاری کیا۔ اگلے سال ایک ہفت روزہ 'جاگرن' کا بوجھ بھی سنبھالا لیکن تینوں ادارے گھاٹے کی فصل اگا رہے تھے۔

آخر ۱۹۳۴ء کے وسط میں انہیں بمبئی میں اجنتا سنے ٹون میں ایک سال کا کنٹریکٹ آٹھ ہزار میں مل گیا۔ پریم چند نے فلم کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ فلم فیل ہو گئی اور کمپنی کا دیوالیہ پٹ گیا۔ آٹھ ماہ بعد پریم چند واپس بنارس چلے آئے۔

اس دوران میں وہ خوب نوبہ نو موضوعات پر کہانیاں لکھتے رہے جن کی کمائی کا بیشتر حصہ ان تین سفید ہاتھیوں کی نذر ہوتا رہا۔

اسی زمانے میں انہوں نے اپنے بچپن سے وابستہ کئی کہانیاں لکھیں جو تجربے اور تخیل کا حسین سنگم تھیں۔ ان کی ایک کہانی "قزاقی" آج بھی دل کی گہرائیوں کو چھو جاتی ہے۔

آخر ۱۶ جون ۱۹۳۶ء کو سفر آخرت پر جانے کی تیاری ہو گئی۔ اس روز آگ برساتی دوپہر میں وہ بازار سے پریس کے لیے کاغذ خریدنے کے لیے گئے۔ واپسی پر لو لگ گئی۔ بیوی نے گڑ ہوا پانی دیا۔ رات کو کھانا کھانے بیٹھے لیکن ایک چپاتی بھی نہ کھا پائے۔ پیٹ میں سخت درد محسوس ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے تین مرتبہ قے ہوئی۔ بیوی نے پودینہ وغیرہ پیس کر پلایا۔ کچھ افاقہ ہوا لیکن رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کے بعد وہ بستر سے نہیں اٹھ سکے۔ کئی علاج کرائے لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

آخر ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو صبح کا سورج نکلنے پر اردو اور ہندی ادب کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

ہمارے عہد کا صاحبِ بساط فنکار....

محمد ایوب واقف

اس جہانِ آب و گل کے انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ نفسیاتی آرزوؤں اور خواہشوں کا پتلا ہوتا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا کام کر گزرنا چاہتا ہے جس سے اسے شہرت اور ناموری کے ساتھ تحفظاتِ دینوی بھی حاصل ہوں۔ شہرت اور ناموری کی خواہش کوئی بری چیز نہیں لیکن جب اس کے حصول کے لئے انسان ہیر پھیر کا طریقہ (Circumbendibees) اور غیر انسانی حربے اور ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے تو پھر نقص اور بگاڑ کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے اور پھر بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو روند کر آگے نکل جانے کی سعی نامشکور شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کے غیر انسانی اور غیر روادارانہ عمل سے مہذب انسانی سماج سخت دل اور بے درد (Callous) بن جاتا ہے۔ ہمارے سماج کا وہ طبقہ جو قلم و قرطاس کا حامل ہوتا ہے جس کے ہاتھ کا مقدس قلم خدا کے بندوں کو ظلم، جبروت اور دغا (Treachery) سے نجات دلانے کا ہی کام کر سکتا ہے اگر وہ طبقہ انسان بھی اپنے فرضِ منصبی سے منہ موڑ لے تو دنیا امن کا گہوارا کم اور جہنم زیادہ نظر آنے لگتی ہم نے دیکھا بھی ہے اور محسوس بھی کیا ہے کہ قلم و قرطاس سے آراستہ و پیراستہ بندگانِ آفریدگار اکثر اپنے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ جانبداری اور جلبِ منفعت کو اپنا شب و روز کا شعار بنالیا ہے اور ایمانداری، غیر جانب داری اور حق بینی کے پرخچے اڑا دیے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ اہلِ قلم کا پورا طبقہ ایسے بے جان روح اور ابتر حالات کا شکار نہیں ہے۔ ہمارے اہلِ قلم کے طبقے میں ہر عہد میں ایسے کچھ یادگارِ زمانہ افراد ضرور رہے ہیں جنہوں نے قلم جیسی نعمتِ خداوندی کی عدالت اور بسالت کی حتی المقدور حفاظت کی ہے ایسے نیک دل اور نیک سرشت اہلِ قلم میں موجودہ عہد کے صاحبِ بساط فنکار جناب مانک ٹالا کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے ہمارا خیال ہے کہ منشی پریم چند اور منشی دیا نرائن نگم جیسے اکابر اہلِ قلم اور ان کے خوش خصال والدین سے ذہنی لگاؤ کا یہ خاطر خواہ نتیجہ ہے۔

راقم الحروف نے مانک ٹالا صاحب کی ساری تحریروں کو دیکھا اور پڑھا ہے اور خود ان کو قریب سے جانا اور سمجھا ہے۔ ان کی کتابوں کے گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے محض تفریحِ طبع کی خاطر ہی قلم نہیں اٹھایا ہے بلکہ ایک ذی ہوش انسان کی حیثیت سے انہوں نے عاقبت نااندیش انسانوں کی سنگ دلی، بے رحمی اور بے دردی (Heartlessness) کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اور پھر سماجی زندگی کے اس بگاڑ کو دور کرنے کی حتی الوسع جدوجہد کی ہے۔ ان کے ناولٹ اور افسانوں میں اس طرح کی تعمیری سوچ بھرپور طریقے سے دکھائی دیتی ہے صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں اب یہ الگ بات ہے کہ انہیں کرشن چندر، رشیدی اور خواجہ احمد عباس جیسی شہرت نہیں ملی۔ گوشے میں بیٹھ کر فکر و فن کی قندیل روشن کرنے والوں کا حال اکثر و بیشتر یہی ہوا ہے۔

ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں میں انصاف، حق گوئی اور بے باکی ان کا بیّن ثبوت ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ شر پسند اربابِ قلم بہ جائے صحت پریم چند کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے سیکولر کیرکٹر کو مسخ کر کے پیش کر رہے ہیں تو ان کی سازشوں کا پردہ فاش کرنے کے لئے وہ تن تنہا میدان میں ڈٹ گئے اور اس وقت تک منشی پریم چند کا دفاع کرتے رہے جب تک دشمنانِ پریم چند نے ہتھیار ڈال نہیں دیے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ منشی پریم چند کے دفاع میں کوئی اوچھا اور بے ڈھنگم راستہ اختیار کیا ہو بلکہ ایک غیر جانب دار اور منصف مزاج محقق کی طرح چھان پھٹک کی اور سچائی کی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالا اور پھر انہیں عوام کی عدالت میں پیش کیا۔ جیسے یہ بھی اچھا ہی ہوا اگر پریم چند کے خلاف محاذ آرائی نہ ہوئی ہوتی تو وہ ماہرِ پریم چندیات کیسے بنتے۔ مانک ٹالا کے صداقت شعار قلم نے بابائے اردو مولانا عبدالحق اور آج کے نامور محقق ادیب اور انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے دفاع میں بھی کام کیا۔ ہم جناب مانک ٹالا صاحب کے حق میں اور صداقت اور صداقت شعار قلم کو سلام کرتے ہیں۔ اور یہ امید کرتے ہیں کہ فتنہ پروری کی آگ کو وہ اسی طرح محبت، رواداری اور انصاف کے آبِ مصفا سے بجھاتے رہیں گے۔

☆

عاشقوں کی فہرست

انوار الحسن وسطوی

"زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے نہ اس کی کوئی ذات اور قوم ہوتی ہے اور نہ کوئی وطن ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کی تحصیل میں محنت کرتا ہے اُسے بولتا اور صحت و فصاحت سے لکھتا ہے اس کی زبان ہے اور وہی زبان داں اور اہلِ زبان ہے۔" (خطبات عبدالحق ص ۲۳۲)

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اس خیال کے تناظر میں اگر ہم اردو زبان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم بلا جھجک اور بغیر کسی تردد کے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک مسلم ادیبوں اور شاعروں کے شانہ بشانہ غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کے فروغ اور ترقی میں قابلِ ذکر اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان کا منبع گرچہ فارسی اور عربی ہے اس کے باوجود بے شمار غیر مسلموں نے نہ صرف اسے اپنایا بلکہ اس سے ٹوٹ کر محبت بھی کی اور اس کی خوبصورتی میں چار چاند بھی لگائے۔ اردو کے غیر مسلم ادیبوں میں منشی ہرگوپال تفتہ سے لے کر پروفیسر جگن ناتھ آزاد تک ایک بڑی اور لمبی فہرست ہے۔ اس فہرست کا ایک اہم نام جناب مانک ٹالا صاحب کا ہے۔ ایک منفرد افسانہ نگار، ایک مستند محقق و ادیب اور ایک ماہر پریم چند کی حیثیت سے اردو ادب میں مانک ٹالا صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ افسانے، تراجم اور تحقیقی موضوعات پر موصوف کی ایک درجن کتابیں منظر عام پر آ کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ پریم چند سے متعلق ان کی تحقیقی کتابیں پریم چند پر کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں سے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف پروفیسر نثار احمد فاروقی، جناب رشید حسن خاں، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور جناب محمد ایوب واقف جیسے جید اور نامور ادیبوں اور ناقدوں نے کیا ہے۔ جناب محمد ایوب واقف نے اپنے ایک مضمون "ماہر پریم چندیات: مانک ٹالا" میں ٹالا صاحب کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"انہوں (ٹالا صاحب) نے گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں انہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان کے نام اور کام کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی تو اس اقدام سے ان کا جو نقصان ہوگا وہ تو ہوگا لیکن اردو ادب کا جو نقصان ہوگا اس کی تلافی یا بھرپائی ناممکنات میں سے ہو جائے گی۔" (ماخوذ "بابائے اردو اور برادران یوسف" مصنف مانک ٹالا ص نمبر ۱۰)

مانک ٹالا صاحب جیسی قدآور ادبی شخصیت کے نام سے تو میں واقف ضرور تھا لیکن ان کے کارناموں اور ان کی ادبی فتوحات سے مجھے پوری واقفیت نہیں تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہفت روزہ "ہماری زبان" دہلی (یکم تا ۷ اگست ۲۰۰۵ء) میں موصوف کا مضمون "بابائے اردو اور برادران یوسف" نظر نواز ہوا۔ مضمون پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا اور اتنی اچھی تحریر رقم کرنے پر انہیں بذریعہ خط مبارکباد دی۔ انہوں نے بھی اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ جیسے معمولی اور کم علم انسان کو نہ صرف اپنے جواب سے نوازا بلکہ مضمون کی تعریف کرنے کے لئے ناچیز کا شکریہ بھی ادا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موصوف نے محض میری حوصلہ افزائی کے لئے میرا شکریہ ادا کیا ورنہ ان کی تخلیقات کی پذیرائی تو بڑے بڑے ناقدینِ ادب پہلے ہی کر چکے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ٹالا صاحب نے میرے چند الفاظ کو شرفِ قبولیت سے نواز کر میرا حوصلہ بڑھایا جس کے لئے میں موصوف کا ممنون ہوں۔ انہوں نے اپنی تازہ تصنیف "بابائے اردو اور برادران یوسف" کا ایک نسخہ بھی مجھے ارسال کیا۔ مانک ٹالا صاحب کی اس ذرہ نوازی پر میں نازاں بھی ہوا اور ان کی شریف النفسی اور منکسر المزاجی پر مجھے رشک بھی آیا۔ چنانچہ میں نے بھی ٹالا صاحب کے عاشقوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے کی غرض سے ایک ٹوٹی پھوٹی تحریر لکھنے کی جسارت کر لی۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ کسی رسالے کے گوشہ میں مانک ٹالا صاحب جیسے عظیم فنکار کی شخصیت و خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے قابلِ تحسین کارنامہ سمجھا جائے گا۔ ہماری دعا ہے کہ مانک ٹالا صاحب کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رہے اور وہ طویل مدت تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم عمل رہیں.....

مجلسِ چہارسُو

"چہارسُو" کے ابتدائی سفر میں ہماری توجہ وطن سے دور مقیم اہلِ ادب اور ماہتابانِ اردو کی جانب اُس طور مبذول نہ ہو سکی جس طور ہماری ذمہ داری کا تقاضا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اہلِ دل اور اہلِ درد سے روابط و تعلقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو ہمیں اپنی کوتاہی کا شدت سے احساس ہوا کہ اشتیاق، عشق اور جنون اردو زبان سے غیر مشروط ہے جبکہ دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم خلوصِ دل سے اس امر کا اعتراف کریں کہ اردو زبان، اردو ادب اور اردو شاعری کے گلشن میں کھلنے والے خوشنما گل بوٹوں میں غیر اردو داں اور غیر مسلموں کا خون بھی اسی قدر شامل ہے جس قدر اہلِ زبان، اہلِ وطن اور اہلِ مذہب کا ہے۔ ذیل کے صفحات میں ایسی ہی ایک گم گشتہ اور گمنام ماہرِ اردو جناب مانک لالا کو روشناس کرانے کی ادنیٰ کوشش کی جا رہی ہے جس نے ہر طرح کی دنیاوی آسائش سے منہ موڑ کر ہر طرح کی کاوشوں سے وابستہ ہو کر اور ہر طرح کے صلہ و ستائش سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر وہ کارنامے سرانجام دئے جو بڑے بڑے ادارے اور بڑی بڑی انجمنیں بھی شاید ہی سرانجام دے پاتے!!!

گلزار جاوید

☆ 'مانک لالا' کس زبان کا لفظ ہے؟

☆☆ 'مانک' قیمتی ہیرے جواہرات کو کہتے ہیں۔ 'پٹیالہ' جو اُس وقت شرقی پنجاب میں ایک اوسط درجے کی ریاست تھی، یہاں چند خاندان ہوا کرتے تھے جو قیمتی ہیرے جواہرات کا کاروبار کرتے تھے۔ اس لئے کاروباری مناسبت سے یہ خاندان 'مانک لالا' کہلاتے تھے۔ 'لالا' کے معنی مجھے خود معلوم نہیں ہیں، بہر حال اس کو یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس کاروباری طبقہ کی ذات تھی۔ 'مانک لالا' یعنی قیمتی ہیرے جواہرات کا کاروبار کرنے والا...... میں نے سنا ہے کہ وہاں کے نوابین بہت فراخ دل ہوا کرتے تھے اور مذہبی تعصب سے ہمیشہ بالاتر ہوتے تھے.... تاہم ڈیڑھ دو سو برس پہلے اس زمانے کے نواب کا نجانے کیوں عتاب نازل ہوا کہ سبھی 'مانک لالا' خاندانوں کو ریاست سے نکال باہر کیا۔ اور سبھی مانک لالا خاندان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور اس زمانے کے پنجاب کے مختلف شہروں یا علاقوں میں جا بسے۔ ہمارے چار چھ خاندان لاہور سے اندازاً پانچ میل کی دوری پر شالامار باغ کے قریب ایک قصبے باغبانپورہ میں بس گئے۔ ابتدائی مشکلوں کے بعد سبھی خاندان خوشحال ہو گئے۔ لیکن غالباً کسی نے ہیرے جواہرات کا کاروبار نہیں کیا تاہم 'مانک لالا' کا لاحقہ ہمارے ناموں کے ساتھ جڑ گیا۔ بنیادی طور پر 'مانک لالا' ہندوؤں کی ایک ذات 'اروڑا' سے متعلق ہیں۔

☆ ساہوکار نے بیٹے کو وکیل کس جذبے کے تحت بنایا اور وکیل کا لڑکا کن خواہشات کے زیرِ اثر صحافی بننا چاہتا تھا؟

☆☆ میرے والد صاحب تعلیم میں بہت لائق تھے اور اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور ساہوکاروں کو ان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ وکیلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ممکن ہے کہ میرے دادا نے اسی مقصد کی خاطر انہیں وکیل بنایا ہو۔ مجھے اسکولی کورس کے علاوہ بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ ابتدا میں رسائل میں صرف افسانے اور روزناموں کے اداریوں کے علاوہ فکاہیہ کالم بھی دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ اس طرح میرے اندر صحافی بننے کا جذبہ موجزن ہونے لگا۔

☆ اگر آپ کا ماحول بچپن سے مطالعہ کے لئے ناسازگار تھا تو مطالعہ کا شوق کیونکر پروان چڑھا؟

☆☆ ادب کی تخلیق کے لئے فی الواقع میرا ماحول بچپن ہی سے ناسازگار تھا۔ والد صاحب بہت مصروف شخص تھے۔ تاہم جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے مجھے خود بخود پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہمارے اسکول میں الگ سے کوئی لائبریری نہیں تھی۔ ہر کلاس میں دیوار کے اندر چار چھ خانوں والی ایک الماری ہوتی تھی۔ یہی الماری ہر جماعت کی لائبریری تھی۔ میں آٹھویں یا نویں کا مانیٹر بنا تو کلاس کے استاد نے اس الماری کی چابی میرے حوالے کر دی اور کہا کہ اگر جماعت کا کوئی لڑکا کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنا چاہے تو رجسٹر میں اندراج کر کے وہ کتاب یا رسالہ اس کے نام جاری کر دوں۔ تاہم جہاں تک مجھے یاد ہے میرے کسی ہم جماعت نے کبھی کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنے کے لئے اپنے نام پر جاری نہیں کروایا۔ لیکن میں نے خود ہی کئی کتابیں اور رسالے پڑھ ڈالے۔ خواجہ حسن نظامی اور پریم چند سے میں یہیں متعارف ہوا۔ باقی ادیبوں کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ رسالہ "پھول" (ہفت روزہ) کے بھی کئی شمارے چاٹ ڈالے۔ بعد میں کالج کی لائبریری میں کئی دیگر ادیبوں کے ناول اور افسانوی مجموعے پڑھ ڈالے۔

☆ 'آنکھ مچولی' کب اور کس تحریک پر لکھا اور کس وسیلے سے 'پھول' میں اشاعت کے لئے ارسال کیا۔ چھپنے کے بعد احباب کا ردِ عمل کیا تھا؟

☆☆ غالباً دسویں جماعت میں میری یہ پہلی طبع زاد کہانی 'پھول' میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کا پلاٹ میرے ذہن میں ایک کوندے کی طرح آ چکا تھا۔ میں نے دو تین کوششوں کے بعد اسے قابلِ اشاعت بنایا اور بذریعہ ڈاک 'پھول' کو ارسال کر دیا۔ میری اُمید کے خلاف جب یہ شائع ہوئی تو مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ میرے قریبی دوستوں نے بھی اسے پسند کیا۔

☆ 'آنکھ مچولی' کے بعد کی کہانیاں غیر معیاری گردان کر کے تلف کیوں کر دی گئیں؟

☆☆ اس کے بعد میں نے ادبی کہانیاں لکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی

مناسب پلاٹ میرے ذہن میں نہیں آتا تھا اس لئے کہانیاں لکھتا اور پھاڑتا گیا۔ تاہم ایک شکایہ مضمون "لیڈر" کے عنوان سے تحریر کیا جو ہفت روزہ 'ریاست' دہلی میں شائع ہوا تھا۔

☆ تقسیم کے بعد باقاعدہ ادبی سرگرمی کب اور کس تحریک پر شروع ہوئی؟

☆☆ لکھنے کی تحریک تو بہت عرصے سے تھی لیکن مشاہدہ اور تجربے کی کمی کے باعث کوئی قابلِ اطمینان کہانی ذہن میں نہیں آتی تھی۔ شروع شروع میں میری چند کہانیاں ادبی اور نیم ادبی رسائل میں شائع بھی ہوئیں لیکن میں خود ان سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ میرے افسانوی مجموعوں میں یہ کہانیاں شامل نہیں کی گئیں۔

☆ ابتدا میں آپ نے جن غیر ملکی ادیبوں کو اُردو میں ترجمہ کیا ان میں سے کون سی تخلیقات آپ کی شخصیت اور فن پر اثر انداز ہوئیں؟

☆☆ میں نے کسی ادیب کی کسی تخلیق کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا۔ تاہم بہت سے ادیبوں کی تحریروں نے مجموعی طور پر مجھے متاثر کیا۔ گورکی، چیخوف (چیخف!) موپاساں، چارلس ڈکنس اور ٹیگور کے ترجموں نے مجھے بہت متاثر کیا تاہم لکھتے وقت میں نے ان کا اثر قبول نہیں کیا۔ خود اپنی الگ ڈگر نکالی۔

☆ حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاسوں میں شرکت کا سبب اور اس کے آپ کی زندگی میں اثرات کی بابت کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ لاہور میں حلقہ کے ہفتہ وار اجلاس (غالباً وائی ایم سی اے YMCA) میں ہوتے تھے۔ ایک ادب دوست نے اس کے بارے میں مجھے بتلایا۔ چنانچہ ان اجلاس میں اکثر و بیشتر میں حاضر ہوتا تھا۔ دہلی میں آزادی کے بعد اردو کا ایک نئے جاری شدہ روزنامہ اخبار "پاراولیس" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام مل گیا۔ اسی زمانے میں اُردو کے مشہور شاعر کرشن موہن سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کے ہفت روزہ اخبار 'آواز' کے ایڈیٹر اور ایک بہت ہی اچھے افسانہ نویس پریم ناتھ دَر کے گھر پر ہر اتوار کی شام کو حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس ہوتے ہیں۔ میں جب تک دہلی میں رہا ان اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتا رہا۔ لاہور اور دہلی کے حلقہ اربابِ ذوق کی ایک روایت تھی کہ ان میں جو تخلیقات پڑھی جاتیں ان پر ہر زاویے سے غور کیا جاتا تھا اور ان پر تعمیری نقطہ نظر سے بحث کی جاتی تھی۔ خاص کر نئے لکھنے والوں کو بہت مفید مشورے دیئے جاتے تھے تا کہ ان کی ذہنی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ ان مشوروں کے نتیجے میں مَیں نے اپنی کچھ کہانیاں غیر معیاری سمجھتے ہوئے تلف کر دیں۔

☆ ترقی پسندی کے زیرِ اثر لکھے گئے ادب اور اس نظریے کی بابت آج آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ اواخر ۱۹۴۸ء میں مَیں بمبئی آ گیا تھا اور یہاں ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس میں باقاعدہ جانا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ پُرآشوب دور تھا جبکہ کیمونسٹ پارٹی کی تلنگانہ بغاوت اپنے پورے شباب پر تھی اور کیمونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی لیکن اس کے تحت اس کے محاذی ادارے غیر قانونی قرار نہیں دیئے گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی اس کا ایک محاذی ادارہ تھی لیکن اس زمانے کا ترقی پسند ادب اکثر ادب و آداب کے دائرے سے باہر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں تنقید دشنام طرازی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک اجلاس میں تو ساحر لدھیانوی کے منہ پر نیاز حیدر نے تھپڑ بھی جڑ دیا تھا..... بہر حال اس دشنام طرازی کا سب سے بڑا نشانہ خواجہ احمد عباس کو بنایا جا رہا تھا کیوں کہ وہ 'پارٹی لائن' کے مطابق کچھ بھی لکھنے کو تیار نہیں تھے اور نہ ہی اپنے ہندی ماہنامہ "سرگم" میں اس طرز کے ادب کو جگہ دینے کے لئے تیار تھے۔ آخر کار پارٹی اور انجمن سے ان کی رکنیت ختم کر دی گئی تھی۔

میں نے بھی اس تحریک سے متاثر ہو کر چند افسانے لکھ کر انجمن میں پڑھے تھے اور انہیں کافی پسند بھی کیا گیا تھا۔ ان کی ترقی پسند رسائل میں اشاعت بھی ہوئی تھی۔ لیکن میں خود ان افسانوں سے مطمئن نہیں تھا اس لئے یہ افسانے میرے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ دو ڈھائی سال بعد میں نے انجمن کے اجلاس میں جانا بند کر دیا تھا اور نہ ہی کسی ترقی پسند ادیب سے دوستانہ رکھا۔ حالانکہ اس وقت تک 'کسی حد تک ان لوگوں نے مجھے شہرت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ اس زمانے میں بہت ہی کم ترقی پسند ادیبوں نے معیاری ادب تخلیق کیا تھا۔ جب میرے جیسے کئی ادیبوں نے اصل حقیقت کو جاننا اور پہچاننا شروع کر دیا تو یہ تحریک خود اپنی موت مر گئی حالانکہ اس کی ابتدا بہت عظیم مقصد کے تحت شروع کی گئی تھی اور بہت اچھا ادب بھی تخلیق ہوا تھا۔ تاہم نوے فیصدی ادیبوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کٹھ پتلیاں نچانے کی ڈور دوسرے ہاتھوں میں ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں اور کرداروں کی بابت احباب میں آپ کی آپ بیتی کا تصور کس بنیاد پر قائم ہوا؟

☆☆ میں نے اپنے کئی افسانوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے اور انہیں زوردار بنانے کے لئے صیغہ واحد متکلم میں لکھا۔ چنانچہ کچھ ادیبوں اور کیا ادب دوستوں نے انہیں پڑھ کر میری آپ بیتی سمجھا۔ حالانکہ یہ افسانے تجربہ اور تخیل کا سنگم تھے۔

☆ آپ کے خیال میں تخلیق کار کی شناخت میں اس کی شخصیت اور فن کا تناسب کیا ہونا چاہیے؟

☆☆ ایک اچھا فنکار بنیادی طور پر شریف النفس ہونا چاہیے۔ تھوڑا بہت تیز، حاضر جواب ہونے میں حرج نہیں لیکن اگر وہ بنیادی طور پر شریف النفس انسان

نہیں ہے تو اُس کی شخصیت اس سے معیاری ادب کی تخلیق نہیں کرا سکتی۔ ہر ادیب کی تخلیق میں اُس کی اپنی ذہنیت بھی کسی نہ کسی طور پر آشکارا ہوتی رہتی ہے۔ شخصیت اور فن کا تناسب اُس کی تخلیقات میں خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔

☆ آپ کہانیوں کا مواد حقیقی زندگی سے لیتے ہیں اس کے باوجود آپ کی اکثر کہانیاں فکاہیہ اور طنزیہ تحریریں کیوں بن جاتی ہیں۔

☆☆ میں حقیقی زندگی پر مبنی تخلیقات کو مشاہدے اور تجربے کا نچوڑ سمجھتا ہوں۔ ان میں تخیل کا بھی بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ ضرورت کے مطابق طنز و مزاح کا چٹخارہ بھی شامل کر لیتا ہوں..... افسانے کی دال میں طنز و مزاح دیگی مرچ کے تڑکے کی طرح ہوتا ہے..... میں نے کبھی بلا ضرورت طنز و مزاح کا استعمال نہیں کیا۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت سے مرعوب ہو کر الگ راہ تراشنے میں اس روش کے مرتکب ہوئے جسے احباب نے پسندیدگی کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا؟

☆☆ میں نے ان سبھی ادیبوں کو پڑھا ہے تاہم میں نے اپنے تجربے، مطالعے اور مشاہدے کو بھی وسعت دی ہے۔ میں نے کبھی ان ادیبوں کی نقل میں کچھ بھی نہیں لکھا بلکہ اپنی الگ راہ تراشتے ہوئے بہت حد تک کامیابی سے اپنی تخلیقات کو معرض وجود میں لایا ہوں۔ اگر کسی ادیب کی تخلیقات کا میری تخلیقات پر اثر پڑا ہوتا تو کوئی نہ کوئی تبصرہ نگار اس طرف اشارہ ضرور کرتا۔ نہ ہی کبھی میرے احباب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

☆ آپ کے ہاں افسانہ نگاری پر واقعہ نگاری کو ترجیح دینے کے باعث آپ کے اکثر افسانوں میں جھول کی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے۔

☆☆ میں نے واقعہ نگاری کو کبھی ضرورت سے زیادہ طول نہیں دیا۔ تاہم میرے اکثر افسانوں میں جھول کی کہیں کیفیت نہیں ملتی۔ بہت ہی کم افسانوں میں موضوع پر مکمل پکڑ نہیں رہی..... اگر یہ کیفیت اکثر افسانوں میں واضح ہوتی تو کوئی نہ کوئی تبصرہ نگار یا تنقید نگار اس کی طرف اشارہ کرتا..... یہاں میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی بیشتر تبصرہ نگار مجھ سے ذاتی طور پر متعارف نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی ان سے میری خط و کتابت ہوئی ہے۔ ویسے جن ادیبوں کے آپ نے نام لکھے ہیں کیا ان کے بھی افسانے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں؟ ان کے کچھ افسانوں میں بھی جھول نظر آ جاتے ہیں۔

☆ آپ کی طویل بیانی بھی آپ کے قاری کو بہت کھلتی ہے۔

☆☆ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے ماحول اور فضا کے مطابق ہی افسانوں کی تخلیق کی ہے۔ اسی باعث میرے بہت ہی کم افسانے زیادہ طویل ہیں۔ کہیں کہیں کسی افسانے میں ماحول اور فضا کی وضاحت کے لئے میرے کچھ افسانوں میں طوالت ملتی ہے۔ میں ضرورت کے مطابق ہی اپنے افسانوں کی طوالت کا معیار قائم رکھتا ہوں۔

میرے دوسرے افسانوی مجموعہ "گناہ کا رشتہ" پر ماہنامہ "کتاب" (لکھنؤ) میں مرحوم منظور آ صاحب اپنے تبصرے میں تحریر فرماتے ہیں.....

"مانک ٹالا کی کہانی لکھنے کی تکنیک نہ یک رنگی ہے نہ پر تصنع۔ افسانے کے ماحول کے مطابق ان کا قلم حرکت کرتا ہے اور وہی لکھتا ہے جس کی ضرورت ہے۔ ان کی عبارت میں خیال آرائی اور رنگینی کی کمی نہیں لیکن یہ چیزیں محل اور موقع ہی سے آئی ہیں..... سب سے بڑی خوبی مانک ٹالا کے افسانوں میں یہ ہے کہ فن کے شریف کردار کا عکس ان کی ہر کہانی میں موجود ہے..... میں مانک ٹالا کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب ان کا فن ایک دور رس میں داخل ہو گیا ہے"

اس وقت تک منظور آ صاحب سے نہ ملاقات تھی اور نہ کبھی خط و کتابت ہوئی تھی۔

ماہنامہ "ساقی" کراچی کے ایڈیٹر مرحوم شاہد احمد دہلوی سے بھی میرے ذاتی تعلقات نہیں تھے نہ کبھی ملاقات ہی ہوئی تھی۔ میری پہلی کتاب پر ان کے تبصرے کے کچھ حصے پیش خدمت ہیں۔

"..... مجموعہ ایک بڑی گہری حقیقت کا نہ ہے جس ہر ایک میں نقشہ کھینچا ہے۔ فن کاری کے سلسلے میں بھی مانک ٹالا صاحب نے بڑی ہی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر کوئی افسانہ اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچا تو کوئی فن کے اوسط درجے سے گرتا بھی نہیں۔ ہر افسانہ شعور سے لکھا گیا ہے اور اتحاد تاثر سے معمور ہے کہیں بھرتی یا محض سنسنی خیزی نہیں ہے۔ ان کی سب سے نمایاں صفت واقعیت ہے۔ مصنف نے اپنے گوناگوں تجربوں کو بہت دلچسپ طریقے پر نمایاں کیا ہے۔ ہندوستان کی معاشرت کے وہ پہلو سامنے آئے ہیں جو اب تک عام نظر سے اوجھل تھے اور جن پر دوسرے مصنفین نے اب تک توجہ نہیں دی تھی....."

☆ سود خوروں اور ساہوکاروں کو آپ کے ہاں اس قدر دخل کیوں ہے؟

☆☆ کیونکہ میں نے اسی ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی تھی۔ میرے دادا خود سود خور ساہوکار تھے لیکن میرے ہوش سنبھالنے تک ان کا کاروبار تقریباً ٹھپ پڑ چکا تھا۔ کیونکہ اس وقت کی یونینسٹ (Unionist) سرکار جس کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات خان تھے ان کے ایک وزیر چوہدری چھوٹو رام (جو خود جاٹ تھے اور انہیں ساہوکاروں کے استحصال کا پورا پورا اندازہ تھا..... اسی طرح مسلمان آرائیں کسانوں کی حالت ان سے بھی بدتر تھی) نے پنجاب اسمبلی میں ایک بل پاس کرایا تھا کہ جو لوگ خود کسان / زمیندار نہیں ہیں ان کے پاس گروی شدہ بھی زمینیں ہیں ان مالکوں کو بلا معاوضہ واپس کر دی جائیں۔ نتیجے میں میرے

دادا کے پاس بھی گروی شدہ جتنی ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ اس کے باوجود میرے افسانوں میں استحصال زدہ کسانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے اور میں نے سود خور مہاجنوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا ہے۔

☆ آپ کے کئی افسانوں میں منشی پریم چند کے خیالات اور الفاظ کو ہو بہو برتا گیا ہے جس کی مثال آپ کا افسانہ ''ہوری کا دوسرا جنم'' ہے؟

☆☆ ''ہوری کا دوسرا جنم'' پریم چند کے ناول ''گئودان'' سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ اس افسانے کا بھی مرکزی کردار ہوری ہی تھا۔ منشی پریم چند نے اس کے استحصال اور مصائب کا تذکرہ بہت ہی فنکارانہ طریقے سے کیا ہے..... ملک کی آزادی کے بعد بھی اس طرح کا استحصال جاری تھا چنانچہ میرے ذہن میں ایک طویل افسانے کے پلاٹ نے جنم لیا۔ جس کا مرکزی کردار بھی ہوری ہی تھا اور وہ اور اس کا خاندان آزادی ملنے کے بعد بھی ان حالات میں سے گزرتا دکھایا گیا ہے۔ اس میں کہیں کہیں ضرورت کے مطابق داوین میں میں نے پریم چند کے کچھ جملے استعمال کئے ہیں.... اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے میں نے اپنے نوٹ میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے۔ میرے اور کسی افسانے میں نہ کہیں پریم چند کے کسی افسانے کا تاثر ہے نہ میں نے اپنے کسی افسانے میں کہیں پریم چند کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ 1981 میں پریم چند پر تحقیق شروع کرنے سے پہلے میرا ذہن پریم چند کے مجموعی تاثر سے خالی ہو چکا تھا۔ کالج کے زمانے کے بعد میں نے شاید ہی کبھی پریم چند کو پڑھا ہو۔ نہ ہی ان کے متعلق ضروری معلومات تھیں۔

☆ اگر ہم آپ سے اردو افسانے میں آپ کی کمزور شناخت کی بابت دریافت کریں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ مجھے آپ کے سوال سے اتفاق نہیں ہے۔ میری سبھی افسانوی کتابوں پر ہندو پاک کے مختلف ادبی رسائل نے بہت عمدہ تبصرے کئے ہیں۔ تاہم جسے آپ ''کمزور شناخت'' کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں ایک گوشہ نشین شخص ہوں کسی ادبی کلک (Clique) سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا اور فطرتاً میں نہ خود اپنی ڈفلی بجاتا ہوں اور نہ کسی سے بجواتا ہوں۔

☆ منشی پریم چند پر تحقیقی کام کا آغاز کرتے ہوئے آپ کو اس کام کی اہمیت اور پسندیدگی کا اندازہ تھا؟

☆☆ تحقیق و تنقید کی طرف میری خاص رغبت نہیں تھی۔ لیکن میرے عزیز دوست مرحوم کالی داس گپتا رضا نے میری تحریروں سے متاثر ہو کر کئی مرتبہ مجھے تحقیق کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تاہم میں بات ٹالتا رہا۔ پریم چند صدی پر کچھ نام نہاد ادیبوں نے اپنی فطری تنگ نظری و فرقہ پرست ذہنیت کا اظہار کرنے کے لئے پریم چند پر فرقہ پرستی وغیرہ کے الزام لگائے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اسکول اور کالج کے زمانے میں پریم چند کو پڑھا تھا۔ پریم چند کی تخلیقات کا مجموعی تاثر میرے ذہن میں محفوظ تھا اور وہ میرے دل میں ایک شریف، کشادہ نظر، انسان دوست اور سیکولر ادیب کے طور پر جلوہ فگن ہے۔ لیکن ان فرقہ پرست ذہنیت کے نام نہاد ادیبوں کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دینے کے لئے میں نے پریم چند کی کتابوں کے علاوہ ان پر اردو اور ہندی میں لکھی گئی تحقیقی و تنقیدی کتابوں کو حاصل کر کے پڑھنا شروع کیا۔ تخلیقات کی نشاندہی کی گئی تھی اور ان کی تحریروں کے اقتباسات سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کئے گئے تھے وہی تحریریں جب پورے تناظر میں پڑھیں تو پتہ چلا کہ پریم چند ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور دیگر بہت سی اعلیٰ و ارفع انسانی اقدار کے علم بردار تھے اور اس مقصد کے لئے وہ زندگی کی آخری سانس تک سرگرم رہے۔ چنانچہ ان حضرات کے بے بنیاد الزامات کے جواب میں میں نے کئی مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع کرائے جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ پریم چند پر وار کرنے والے اپنی ہی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے نظر آئے۔ اختصار کے پیش نظر میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اردو کے تقریباً سبھی قد آور ادیبوں نے میری اس محنت کو سراہا اور جب پریم چند پر میری پہلی کتاب ''پریم چند اور تصانیف پریم چند'' (اشاعت ۱۹۸۵ء) شائع ہوئی تو اس پر ہندو پاک کے اہم ادبی رسائل نے بہت اچھے تبصرے شائع کئے۔ ان سے مجھے اس قدر تقویت ملی کہ میں نے پریم چند پر مزید تحقیق کرنے کی ٹھانی۔ دوسری کتاب ''پریم چند.... کچھ نئے مباحث'' (۱۹۸۸ء) میں شائع ہوئی تو ماہنامہ ''نگار'' کراچی نے ملاخطات میں بہت تعریف کی اور جولائی ۱۹۸۹ء کا پورے کا پورا شمارہ میرے اور میری تحریروں کے لئے وقف کر دیا۔ جس میں میرے تقریباً آدھے مضامین ہو بہو نگار میں شائع فرما دیئے۔

ڈاکٹر انور سدید نے بھی قومی زبان (کراچی... جون ۱۹۸۹ء) میں ایک طویل تبصرہ شائع کرایا تھا۔

اس کے علاوہ بھی ہندو پاک کے بہت سے اہم ادیبوں کے تبصرے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

مجھے اپنے اس تحقیقی کام کی اہمیت اور پسندیدگی کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے یہ تحقیق ایک غیر جانبدار اور ایماندار محقق کے طور پر کی تھی۔ میرے ان مضامین کی پسندیدگی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لئے ادق اور ثقیل زبان کا استعمال نہیں کیا تھا بلکہ جس طرح افسانے لکھتا تھا اسی طرح رواں دواں اور سادہ زبان میں یہ مضامین تحریر کئے۔ میں یہاں تحریر کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے صرف اپنی داہنی آنکھ سے ہی یہ سارا کام انجام دیا ہے کیونکہ آنکھوں کے ایک ماہر سرجن نے میری بائیں آنکھ سے موتیا بند نکالتے ہوئے اس آنکھ کی روشنی بھی ختم کر دی تھی۔

☆ آپ کی محنت، لگن اور جستجو اس امر کی متقاضی تھی کہ آپ کو اس

اہم خدمت کے عوض ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کر کے اس اہم کام کو بہتر طریقے پر محفوظ کیا جاتا؟

☆☆ میں نے آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا خیال ذہن میں رکھ کر یہ کام کیا ہوتا تو شاید اس قدر محنت، لگن اور جستجو سے یہ کام سرانجام نہ پاتا۔ ذہن میں کسی صلے کا خیال جاگزیں ہو تو ہر وقت ذہن اسی خیال میں گم رہتا ہے۔ (تاہم میرے تقریباً سارے اہم مضامین میری کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہے؟)

☆ اردو ادب پر انگریزی اور دیگر زبانوں کے چربے کا الزام اکثر لگتا ہے۔ منشی پریم چند کے بارے میں ایک حلقے کی یہ رائے ہے کہ منشی جی نے جو کہانیاں ۱۹۳۱ء کے بعد لکھی ہیں وہ ادب کا حصہ ہیں مگر اس سے پہلے پریم چند نے نقالی کی ہے اور فصیحتیں ہی تحریر کی ہیں؟

☆☆ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی چند تخلیقات کو چھوڑ کر ان کی کہانیاں اس عیب سے پاک ہیں۔ موصوف نے اردو اور ہندی فکشن کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ اردو اور ہندی فکشن کے نئے اسلوب اور نئی ڈگر کے بانی اور پیش رو ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ممکن ہے اپنی کچھ کہانیاں لکھتے وقت کہیں کہیں کسی افسانہ نویس کی کسی تحریر کا تاثر ذہن میں رہ گیا ہو۔ موصوف نے کچھ ترجمے بھی کیے تھے جن میں کتابی صورت میں اشاعت کے وقت اصل مصنف کا نام نہیں دیا گیا تھا لیکن اکثر و بیشتر انہوں نے ان کہانیوں کے اصل مصنف کا نام دیا تھا۔ ٹالسٹائی کی تیس کہانیاں ہندی میں ترجمہ کی تھیں۔ انہیں الگ سے ایک کتاب میں شائع کیا گیا اور باقاعدہ ٹالسٹائی کا نام دیا گیا۔ اس طرح رتن ناتھ سرشار کی "فسانۂ آزاد" کی تلخیص اور سیر کہسار کو ہندی ترجمے میں سرشار کے نام سے شائع کیا گیا۔

☆ منشی پریم چند کے حوالے سے ایک تاثر یہ بھی ہے کہ آپ فن کے کردار پر بڑی گرفت کو اس طور پر صاف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جس طور پر منشی جی کی شخصیت کا تقاضہ تھا؟

☆☆ پریم چند نے تقریباً تین سو (۳۰۰) کہانیاں لکھیں۔ ہم بھی کہانیوں کو شاہکار کہانی کا درجہ نہیں دے سکتے۔ ان میں سے چند ہی کہانیاں کمزور تھیں۔ موصوف کی تقریباً ایک سو کہانیاں اول درجے کی کہانیاں تھیں۔ باقی کہانیاں اگرچہ دوسرے درجے کی تھیں لیکن بہت ہی کامیاب کہانیاں تھیں۔ بہت ہی کم کہانیاں تیسرے درجے کی کہانیاں تھیں لیکن ان میں بھی دم خم اور پریم چند کے طرزِ تحریر کا سحر موجود تھا۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص برصغیر میں تخلیق کار کی تخلیق سے زیادہ شخصیت میں قاری کی دلچسپی سے تخلیق کار کو فائدہ ہوتا ہے یا نقصان.... نیز پریم چند کو اس حوالے سے کس طرح کے نتائج کا سامنا ہے؟

☆☆ اچھی تخلیقات ہی تخلیق کار کی شخصیت سے قاری کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ویسے ان کی کہانیوں میں ان کی شخصیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ پریم چند اپنی ادبی زندگی کے ایک سو سال گزرنے کے بعد بھی آج اسی طرح جگمگا رہے ہیں جس طرح وہ اپنی زندگی میں جگمگاتے رہے تھے۔ اردو اور ہندی ادب میں ایسے فنکاروں کا بالکل فقدان ہے جو اس قدر طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود مشہور و مقبول ہوں۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ منشی پریم چند کو اصل میں ہندی والوں نے زندہ رکھا ہوا ہے مگر اردو والوں نے انہیں کب کا مار دیا ہے؟

☆☆ پریم چند کو ہندی والوں نے زندہ رکھا ہے نہ اردو والوں نے بلکہ وہ اپنے فن کی خوبیوں کی بناء پر زندہ ہیں۔ ان کی زندگی میں اردو والوں سے زیادہ ہندی والوں میں ان کے حاسد پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے فن پر بہت کیچڑ اچھالی لیکن وہ پریم چند کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

☆ ایک رائے یہ ہے کہ (آج کے) مشینی اور سائنسی دور میں پریم چند کی سادہ اور سپاٹ کہانیاں ایک طرح سے out of date ہو چکی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

☆☆ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پریم چند کب کے زمین کے کئی گز نیچے دفن ہو چکے ہوتے۔ ان کی بہت سی کہانیاں پڑھتے وقت "ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تجربہ اور تکنیک کی ہم آہنگی اور جذباتی کیفیت نے اسلوب خلق کیا ہے۔ اسی کے بطن سے اسلوب کی شدت اور تحلیل اور نوکیلا پن، اس کی آنچ اور آہنگ، اور رفعت sublimity اور بلندی کا جنم ہوا ہے....."

پریم چند کی مقبولیت آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کے جس قدر ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں ان کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے ادیب کے حصے میں نہیں آیا۔

☆ آپ کے خیال میں اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کون ہے یا مستقبل قریب و بعید میں کن افسانہ نگاروں کو (Legend) کا روپ دھارتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ ابھی تک پریم چند کے علاوہ دور دور تک کوئی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جو لیجنڈ کا روپ دھار سکے۔ مستقبل کا حال خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

☆ اگر یہی سوال آپ سے آپ کی بابت دریافت کیا جائے کہ آپ افسانہ نگاروں کی کہکشاں میں کہاں ہیں اور کس طور پر جگمگا رہے ہیں.... یا مستقبل میں کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ آسمان میں سورج اور چاند کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ بطور تخلیق کار میں بھی اس کہکشاں کا ایک ستارہ ہوں۔ کچھ ستارے مجھ سے زیادہ جگمگا رہے ہیں اور کچھ کم۔ حالانکہ میں ایک تخلیق کار پہلے ہوں اور ایک محقق بعد میں تاہم اگر

میں تحقیق میں اس قدر محنت اور دماغ سوزی نہ کرتا اور اس کے کام پر 'درجۂ اول' کا ایک (تحقیقی) ستارہ نہ کہلاتا تو شاید میری تخلیق کی جگمگاہٹ کو بھی ادب نواز فراموش کرچکے ہوتے۔ پیرانہ سالی اور ضعفِ بصارت کے بعد شاید اب میں اس سے زیادہ نہ کرپاؤں۔

☆ اردو زبان و ادب کی رفتار، معیار اور مقدار کی بابت آپ کا حسنِ ظن کیا ہے؟

☆☆ جتنا زبان کسی ادب کی ضروریات کی ضامن نہیں ہو سکتی اُس زبان کے ادیبوں سے بہتر معیار اور مقدار کی امید کرنا فضول ہے۔ ہم لوگ پہلے بھی بطور ہابی (Hobby) ادب تخلیق کرتے تھے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔

☆ بھارت میں قیامِ پاکستان سے پہلے کی نسل کے بعد اردو زبان اور اُردو ادب کے مستقبل کو کیا خطرات درپیش ہیں؟

☆☆ آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کے زبردست عروج و فروغ کے باعث آج کل انگریزی ہی کا بول بالا ہے۔ ممبئی میں بہت سے ایسے اسکول تھے جن کا ذریعۂ درس و تدریس اردو، گجراتی یا مراٹھی تھا (یعنی درجۂ اول کے ایسے اسکول)... ان سبھی نے انگریزی زبان کو درس و تدریس کا ذریعہ بنالیا ہے کیونکہ نچلے اوسط درجے کے والدین بھی اپنی اولاد کو انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔

☆ عالمی زبانوں میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ بہت زیادہ درخشاں نہیں ہے۔ بہت سی عالمی زبانوں کے ادیب صرف ایک یا دو شاہکار تخلیق کرکے پوری زندگی کا تحفظ کرلیتے ہیں۔ ہندو پاک کی کسی زبان میں ابھی تک یہ طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اس کا کوئی ادیب ادب کی کمائی پر زندہ رہ سکے۔ پریم چند کو بھی زندہ رہنے کے لئے زندگی بھر منشی کی کی طرح مصروف رہنا پڑا تھا۔ پھر بھی وہ اوسط درجے کی زندگی ہی گزار پائے۔

نوٹ: میں یہاں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ انتہائی احتیاط کے باوجود پریم چند کی تحقیق میں کہیں کہیں تحقیق کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ پریم چند کا سرمایۂ ادب بہت بڑا تھا اور ان کی کئی تحریریں اب بھی کچھ رسائل میں بکھری پڑی ہیں جن پر رسائی ناممکن تھی۔ بہرحال کسی بھی ادیب (خاص کر پریم چند پر) کی تحقیق پر حرفِ آخر کسی بھی محقق کے بس کا روگ نہیں۔

☆

نماز

سید محمد علی زیدی ولد سید امراؤ زیدی 1863 تا 1956 نام و رشاعری میں قریب پون صدی تک مضطر دہلوی کے نام سے روشن و درخشاں رہے۔ آپ کے کلام بلاغت سے قوسِ مضطر سید صابر احمد نقوی صاحب نے تحفتاً گراں مایہ رسال فرما کر چہارسو کے قارئین کی ضیافتِ طبع کا اہتمام فرمایا ہے۔ (گ۔ ج)

اے مومنو! پڑھو کہ ہے فرضِ خدا نماز!
پڑھتے رہو نہ ہونے دو ہرگز قضا نماز!

اسلام میں ہے سب سے بڑی چیز ایک ہی
ہے ابتدا نماز تو ہے انتہا نماز

فتویٰ شریعت اس پہ لگاتی ہے کفر کا
جو شخص جان بوجھ کے کردے قضا نماز

خد ہے کہ سوچ جاتے تھے پاؤں گھڑے گھڑے
پڑھتے تھے رات رات بھر حبیبِ خدا نماز

دیکھو حسینؑ کے پیاسے ہوئے شہید
لیکن ایک بھی نہ ہوئی ان کی قضا نماز

ملتے ہیں جا کے شوق سے مسجد میں پانچ وقت
ہے عاشقوں کے واسطے یہ دل رُبا نماز

گھر بھر میں آپ پر ہی نہیں ہے نماز فرض
تاکید کیجئے کہ پڑھیں اقرباء نماز

مضطر رات بھر تو سوئے ہو چین سے
اب صبح ہو گئی اُٹھو کر لو ادا نماز

○

سَت یُگ کا اِنسان

مانک ٹالا

ہمیں زندگی بھر اُس کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ مذہب سے وہ مسلمان تھا۔ ماں باپ نے اللہ رکھا، اللہ دتا، خدا بخش یا غلام رسول.... کچھ بھی نام رکھ دیا ہوگا مگر ہم اُسے ''گونگا'' کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ وہ جنم سے گونگا اور بہرا تھا۔ اشاروں سے بات کرتا تھا اور اشاروں کی بات سمجھتا تھا۔

نجانے دادا جان کے پاس وہ کب سے نوکر تھا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اُسے دادا جان کی اردلی میں دیکھا تھا۔ دادا جان کی موت کے بعد بھی وہ اسی گھر کی چوکھٹ سے چمٹا رہا۔ اِس گھر سے اُس کا جنازہ ہی نکلا۔

زندگی میں دادا جان نے ہزار اُتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ وہ ہر اچھے بُرے وقت میں ساتھ ساتھ رہا تھا۔ اچھے وقت میں خادم کی طرح چند قدم پیچھے اور بُرے وقت میں ڈھال کی طرح آگے آگے۔

گھر میں اُس کی حیثیت نوکر کی بھی تھی اور مالک کی بھی۔ نوکروں کی طرح کام کرتا تھا اور مالکوں کی طرح گھر بھر پر حکومت چلاتا تھا۔ زندگی بھر اُس نے تنخواہ مانگی نہ کبھی وصول کی۔ دو وقت کا کھانا اور دو کپڑے یہی اُس کی ضروریات تھیں۔ چند کپڑے، ایک گلاس، ٹام چینی کی ایک پلیٹ، مٹی کا پیالہ اور گھر بھر کے لوگوں کی محبت.... یہی اُس کی کائنات تھی۔

کونین کی گولی پر شکر کی تہہ چڑھی تو آپ نے دیکھی ہوگی مگر شکر کی گولی پر کونین کی تہہ چڑھی نہ کبھی دیکھی نہ سُنی ہوگی۔ وہ شکر کی گولی پر کونین کی تہہ کی مانند تھا۔ اُوپر سے غصیلا، نیم کریلا، چھیڑ جائے تو بھڑوں کا چھتہ لیکن گائے کی طرح مہربان اور شفیق۔

کسی ماہر نفسیات کے لئے وہ بہت اچھا موضوع بن سکتا تھا۔ شاید یہ کڑواہٹ اُس کے تجربات کا ردِّعمل تھی۔ زندگی بھر کسی کے کومل بازو، نرم بدن، حریری آنچل یا پھر ماں کی ممتا، باپ کی شفقت ان سب کی محرومیت کا ردِّعمل اُس کی گونگی زبان کی کڑواہٹ تھی!

لیکن ہم سیدھے سادے معصوم بچوں کو نفسیات کی بھول بھلیوں کی بھلا کیا سمجھ؟ ہمارے لئے تو وہ دادا جان کے کھیت میں اُگی سرخ مرچ کی مانند تھا۔ دادا جان ساہوکاری کے علاوہ مرچوں کا بیوپار بھی کرتے تھے۔ مرچوں کے دو ایک کھیت بھی تھے.... اور ہم سب بچے اُسے لال مرچ ہی کہہ کر یاد کرتے تھے، تیکھی کڑوی لال مرچ.... جس کی کڑواہٹ میں بھی ایک چٹخارہ ہوتا ہے!

محبت تو اُسے گھر بھر کے سبھی افراد بلکہ ڈھور ڈنگروں تک سے تھی۔ مگر دادا جان کے پسینے پر تو اپنا خون گراتا تھا۔ اُن کے بعد ایک گھوڑی پر سب سے زیادہ جان نچھاور کرتا تھا۔ دادا جان کے پاس ایک گھوڑی تھی جس کا تیز رفتاری میں دور دور تک کوئی جوڑ نہ تھا۔ اردگرد کے ڈاکو جب کبھی کوئی اہم ڈاکہ ڈالنے جاتے تو یہی گھوڑی چوری کر لے جاتے اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد گھوڑی چپ چاپ واپس چھوڑ جاتے۔ کیوں کہ گونگے سے لوہا لیتے ہوئے وہ بھی ڈرتے تھے۔

جب ہماری قسمت کا اُلٹا چکر چلا تو اُس گھوڑی کو باؤلے کتے نے کاٹ ڈالا۔ جس سے وہ پاگل ہو گئی اور پاگل پن میں اس نے سب جانوروں کو کاٹ ڈالا۔ جس سے تمام جانور یکے بعد دیگرے مر گئے اور دادا جان کی حویلی جہاں جانور باندھے جاتے تھے، یوں لگنے لگی جیسے قسمت نے جھاڑو پھیر دی ہو۔

باؤلی گھوڑی کو مروانے کے لئے بندوقچی کا انتظام کرنا پڑا۔ باہر میدان میں گھوڑی باندھ دی گئی۔ گونگا چپ چاپ سب نظارہ دیکھتا رہا۔ بندوقچی نشانہ باندھ ہی رہا تھا کہ وہ گھوڑی کے آگے کھڑا ہو گیا۔ کرتے کا دامن چاک کر کے سینہ تان کر کے کھڑا ہو گیا کہ پہلے یہاں گولی داغو پھر گھوڑی کی پیشانی پر داغنا۔ لوگ اُسے پکڑ کر ایک طرف کرتے مگر نہ جانے اُس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ سب کو دھکا دے کر پھر گھوڑی کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ بہت مشکل سے اُسے قابو میں کیا گیا اور گھوڑی کی پیشانی پر گولی داغی گئی۔ گھوڑی مردہ ہو کر زمین پر گر گئی تو اُسے چھوڑا گیا۔

وہ مردہ گھوڑی سے لپٹ کر یوں دھاڑیں مار مار کر رویا کہ چرخ نیلی فام بھی کبھی ساون بھادوں میں اس قدر نہ رویا ہوگا۔ پتھر سے پتھر دل بھی اس نظارے کی تاب نہ لا سکا۔

دادا جان کی ساہوکاری دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں اپنا روپیہ وصول کرنے، فصل، مکان یا زمین قُرق کروانے اکثر دور نزدیک کے دیہاتوں میں جانا پڑتا تھا اور گھر لوٹتے رات ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر کئی کئی سو روپیہ نقد ساتھ میں ہوتا۔ اُس زمانے میں ڈکیتی کے واقعات بہت ہوتے تھے لیکن جب وہ دادا جان کے ساتھ ہوتا تھا تو گھر بھر کے لوگ لمبی تان کے بے فکر سوتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی بوٹی بوٹی کٹوا دے گا مگر دادا جان پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

ایک مرتبہ دادا جان روپیہ وصول کر کے بہت رات گئے گھر لوٹ رہے تھے۔ اماوس کی گہری تاریک راتوں میں اکثر ڈاکو سڑک کے کنارے شکار کی تاک میں کھڑے رہتے تھے۔ جب تانگہ ٹمٹم فن کے قریب سے گزرتی تو وہ گھوڑے کی گردن پر ایک بھرپور ہاتھ ڈانگ کا ایسا مارتے کہ گھوڑا وہیں چت ہو جاتا اور ڈاکو سواریوں کو لوٹ کر چمپت ہو جاتے۔

اس رات کوکلا اسی گھوڑی کو ہانکے چلا جا رہا تھا گھوڑی ہوا سے باتیں کرتی اُڑی جا رہی تھی کہ دور سے سڑک کے کنارے مدھم سی روشنی اُسے دکھائی دی۔ اُس نے فوراً بھانپ لیا کہ ڈاکو شکار کے منتظر ہیں۔ کوندے کی سی لپک کے ساتھ اُس کے دماغ کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے گھوڑی کی لگامیں دادا جان کے ہاتھ میں تھما دیں اور خود اپنی ڈانگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ جب گھوڑی ڈاکوؤں کے قریب سے گزری تو ان کی ڈانگ کا بھرپور وار اُس نے اپنی ڈانگ پر سہہ کر پلٹ کر اپنی ڈانگ کا ایک بھرپور وار حملہ آور کی گردن پر جما دیا۔

ایک دردناک چیخ خاموش فضا کو چیرتی چلی گئی۔ وہ ڈاکو وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ باقی ڈاکو منہ دیکھتے رہ گئے اور گھوڑی سرپٹ دوڑتی ہوئی کئی فرلانگ آگے نکل گئی۔

ایک مرتبہ تاؤ صاحب کو نجانے کیا سوجھی کہ انہوں نے ڈاک کا استعمال شدہ ٹکٹ پھر استعمال کر لیا اِن پر مقدمہ چلا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ دادا جان اسی غم میں ہارٹ فیل ہو جانے سے راہی ملکِ عدم ہو گئے۔ وکیل نے تاؤ صاحب کا ڈیفنس چلانے کے لئے لاکھ سر پٹخا مگر کوئی تسلی بخش بچاؤ کی صورت نظر نہ آئی۔ اس پر کوکلے نے تجھا دیا کہ سب الزام وہ اپنے سر لے لیگا۔ عدالت بھلا کوکلے بہرے کو کیا سزا دے سکی؟

بھری عدالت میں اُس نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ہاتھ کے اشاروں اور زبان کی آوں آوں سے عدالت کو بتلایا کہ تاؤ صاحب نے اُسے خط پوسٹ کرنے کو دیا تھا مگر اس نے ٹکٹ کے لئے دیئے گئے پیسے کھا لئے اور لفافے پر استعمال شدہ ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیا۔

تاؤ صاحب صاف بری ہو گئے مگر اُسے تین مہینے جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی لگتے وقت اُس کے چہرے پر شہیدوں کی سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

اُس کی طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ گھر بھر کے لوگ اُس کے غصے سے ڈرتے تھے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب کو رگید ڈالتا۔ کوئی چوں تک نہ کرتا لیکن سنتا اور سہتا صرف دادا جان کی باتیں اور گالیاں۔ دادا جان کی گالیاں اور جھڑکیاں تو وہ شیرِ مادر سمجھ کر پی جاتا لیکن کبھی ضد پر آتا تو دادا جان سے بھی اپنی بات منوا لیتا۔

چچا جان کی شادی پر اُس نے 'نان کوآپریشن' کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔ عدمِ تعاون کی وجہ دریافت کی گئی تو اُس نے جواب دیا کہ جب تک اُس کے گرتے کے لئے زنجیر والے سونے کے بٹن تیار نہیں کروائے جائیں گے وہ شادی میں شریک نہیں ہو گا.... لوگ کیا کہیں گے اتنے بڑے رئیس کا خاص الخاص آدمی اور اس طرح بھکاریوں کی طرح پھرتا ہے۔

کسی نے مذاق اُڑایا، کسی نے ناک بھوں چڑھائی لیکن دادا جان نے اس کے لئے زنجیر والے سونے کے بٹن تیار کروا دیئے اور وہ آن بان سے سونے کے بٹن لگا کرتا، ریشمی تہمد اور کلف لگی ململ کی پگڑی پہنے دولہا کی گھوڑی کی لگام تھامے سب سے آگے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔

شادی کے اگلے روز اُس نے سونے کے بٹن دادا جان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "انہیں سنبھال لو کہیں گم نہ ہو جائیں پھر کبھی کام آئیں گے۔"

وہ گھر کے آمد و خرچ کی ایک ایک پائی پر کڑی نگاہ رکھتا تھا کیا مجال کہ ایک کوڑی کی چیز بھی فالتو خرچ ہو جائے حتیٰ کہ ہماری پھوپھیوں کو بھی چار چھ دن سے زیادہ میکے میں ٹکنے نہ دیتا تھا اور وہ انہیں اشاروں کی زبان میں سنا دیتا تھا کہ کیا چھاؤنی چھا کر بیٹھ رہی ہیں۔ آ جاتی ہیں دوسرے چوتھے چار چھ بچوں کو لے کر..... گویا ہمارے یہاں چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں جیسے انہیں دودھ مکھن کی ضرورت نہیں۔ ابھی کل میں نے پوری بھر گیہوں چکی پر پسا تھا آج پوری آدھی رہ گئی ہے..... جیسے یہاں حرام کی کمائی ہوتی ہے... چلو تیار ہو جاؤ، ابھی تمہیں سسرال چھوڑ کر آتا ہوں۔"

وہ بیچاریاں آنا کانی کرتی رہ جاتیں اتنے میں وہ ٹمٹم تیار کر کے لے آتا۔ ان کے بچوں کو ہانک کر ٹمٹم میں لا دیتا کیا مجال جو کوئی روک دیتا۔ ساں بیٹیاں ادھوری ادھ کہی دکھ سکھ کی باتیں کسی اگلی ملاقات کے لئے اٹھا رکھتیں اور اس 'منحوس' کو کوستی ہوئیں دل مسوس کر روانہ ہو جاتیں۔

ایسی ہی آپا دھاپی میں ایک مرتبہ ہماری ایک پھوپھی اپنا بیشتر زیور میکے میں ہی بھول گئیں اُسے معلوم تو تھا ہی۔ وہ دادی اماں سے کہتا رہا کہ اُس کا زیور اُسے پہنچا دو۔ دادی اماں یونہی ٹالا ٹالی کرتی گئیں۔ آخر اُس نے طعنے دینے شروع کر دیئے کہ تمہیں شرم نہیں آتی بیٹی کا زیور سنبھالے بیٹھی ہو اُس کی امانت اُسے پہنچاتی کیوں نہیں۔

ایک روز دادی اماں نے اُس کی طعنہ زنی سے تنگ آ کر تمام زیور

اُس کے آگے لاکر ڈھیر کردیا اور کہا کرلے جا کے دوسے آ۔ اُس نے تمام زیور سنبھال کر اپنی جبہ کے پلّو میں باندھ لیا اور روانہ ہوگیا۔ راستے میں ہمارا گھر پڑتا تھا وہاں آیا پہلے تو اگلی پچھلی تمام ہسٹری سنائی پھر تمام زیور نکال کر دکھایا اور پھر ایک ایک کرکے سب زیور اپنے بازوؤں ' گلے اور کانوں میں پہن پہن کر دکھا دکھا کر خوش ہوتا رہا۔ جب دل بھر گیا تو پھر اُتار اُتار کر سنبھالنے لگا۔ والدہ نے ازراہِ مذاق اس سے کہا کہ ایک آدھ زیور اُسے بھی دیتا جا۔

"تو بیسری.... "اُس نے دونوں کانوں کو چھوا "نہ بابا! مجھ سے ایسا نہیں ہوگا۔"

والدہ نے پھر لقمہ دیا "کسی کو کیا معلوم ہوگا کہہ دینا کہ میں سب زیور پہنچا آیا ہوں۔"

"خدا سب دیکھتا ہے" اُس نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی.... "بیٹی کا دھن رکھنا پاپ ہے" اور پھر تمام زیور سنبھال کر جبہ کے پلّو میں باندھ کر بحفاظت تمام پھوپھی کے سپرد کرآیا۔

جب کبھی موج میں ہوتا تو بڑے تماشے کرتا۔ جب چہرے سے حماقت کا خول اُتار دیتا تو بس بالکل بچہ ہی تو بن جاتا۔ اِن لمحوں میں اُس سے ہنسی مذاق لعن طعن سب معاف ہوتے۔ وہ خود بھی سب کا مذاق اُڑاتا۔ ہر ایک کی بول چال' عادات' خصلت' نشست و برخواست کی پوری پوری نقل اُتارتا اور سب کو ہنساتا۔

دادا جان کی موت کے ساتھ ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں کوئگے کی زندگی کا سنہری باب ختم ہوگیا۔ ایک طرح سے گھر بھر سے اس کی حکومت اُٹھ گئی۔

تایا اور والد صاحب تو الگ ہوچکے تھے اور اپنے گھر گرہستی کے گزارے لائق کما تے کھاتے تھے۔ دادا جان کا کاروبار تو اُن کی زندگی میں ہی کافی چوپٹ ہوگیا تھا۔ صرف وہ حویلی بچی تھی جس میں رہتے تھے۔ چچا کے حصے میں وہی حویلی آئی تھی' سب سے آخری اولاد ہونے کے باعث چچا لاڈ و پیار میں اس قدر بگڑ گئے تھے کہ اسکول سے بھاگ بھاگ آتے تھے۔ دادا جان کی وفات کے بعد ان پر بہت مشکل آن پڑی۔ تین چار چھوٹے چھوٹے بچے دادی اماں اور چچی کے ساتھ کوئگے کا بھی بوجھ۔ چچا نے چھوٹے موٹے کئی کام کیے مگر گزارہ بہت مشکل سے چلا پاتے۔ نتیجہ یہ کہ بہت چڑچڑے ہوگئے تھے اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا غصہ گھر والوں پر یا کوئگے پر اُتارتے۔ وہی کوئگا جو کبھی ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتا تھا چپ چاپ سب کچھ برداشت کرلیتا تھا بہت سوں نے اُسے لالچ بھی دیئے کر

چھوڑ اُسے ہمارے پاس چلا آ' حجرے میں پڑا رہ' مگر اُس کا ایک ہی جواب تھا "اس گھر کا نمک کھایا ہے اس کی دہلیز موت کے بعد ہی چھٹے گی۔"

کبھی کبھی والدہ بھی نیم مذاق نیم سنجیدگی سے اُس سے کہا کرتیں کہ کس لئے وہاں پڑے ہو ہمارے پاس آجاؤ' حجرے میں کھاؤ پیو عیش کرو.... مگر اس کا جواب وہی ہوتا "اس گھر کی چوکھٹ موت کے بعد ہی چھٹے گی۔ مرنے والے کی آتما مجھے دیکھ رہی ہے"

چچا کی مالی مشکلات میں وہ بھلا کیا مدد کرسکتا تھا۔ روپیہ پیسہ تو اس کے پاس تھا نہیں۔ محنت مزدوری بھی کرتا تو سارے گھر کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ پھر بوڑھا بھی کافی ہوچکا تھا۔

اُسے ایک ترکیب سوجھی' قریب کی مسجد کے مُلا سے دوستی گانٹھ لی۔ مُلا کو علاقے کے مسلمانوں سے کافی سے زیادہ روٹیاں مل جاتی تھیں' جن میں سے فالتو روٹیاں سُکھا کر چھان چوکر والوں کے ہاں بیچ آتا تھا کوئگے کے لئے دو چار روٹیاں رکھ لینا کیا مشکل بات تھی۔ اس طرح اُس کا گزارا چل نکلا۔ کچھ تھوڑی محنت مزدوری بھی کرلیتا تھا۔

باقی وقت چچا کے کام کاج اور ان کے بچے سنبھالنے میں صرف کردیتا۔ چچا کے بچوں کو یوں لئے لئے پھرتا' جیسے بندریا اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے پھرتی ہے اُس کے باعث چچی بچوں کی طرف سے بےفکر ہوکر سینے پرونے کا تھوڑا بہت کام کرکے گھر کی آمدنی میں کچھ اضافہ کرلیتی۔

ڈھلتی عمر میں انسان کو ہر آہٹ پر موت کی آمد کا گمان ہوتا ہے۔ یوں بھی دادا جان کی موت اور گھر کے افلاس نے اُسے دل برداشتہ کردیا تھا۔ اور وہ دادا جان کی وفات کے بعد اکثر آسمان کی طرف اشارہ کیا کرتا تھا..... "وہ تو چلا گیا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے جلد پہنچنے والا ہوں.... اب میرا اس دنیا میں کیا کام...."

اور ایک دن بیچارے نے آدبوچا۔ بہت علاج کیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخری لمحہ قریب آپہنچا۔ چچا جان کو قریب بلایا' "میں جا رہا ہوں میرا جنازہ دھوم دھام سے نکالنا اور مجھے باغچی والے قبرستان میں شان و شوکت سے دفن کرنا۔ اُس کا (دادا جان) نام بدنام نہ ہو.... لوگ اُنگلی نہ اُٹھا سکیں۔ اُس کی آن پر حرف نہ آئے.... مجھے تمہاری تنگ دستی کا احساس ہے" اور پھر جبہ کی گرہ سے بہت سے سکے اور میلے سے نوٹ نکال کر ہاتھ میں تھما دیئے "اُمید ہے کہ یہ میرے کفن دفن کے لئے کافی ہوں گے...."

جواہرِ قلم .... مصطفیٰ ملک

جناب مانک ٹالا نے اردو تحقیق کے حوالے سے دو امتیازی نشانات چھوڑے ہیں۔ ایک یہ کہ علم و ادب میں مقام و اعتبار، تعداد سے نہیں صرف معیار سے حاصل ہوتا ہے۔ درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مقالات لکھ جانے سے کوئی حاصل نہیں؛ لیکن فکر و نظر کی پوری توجہ کے ساتھ ایک آدھ چیز بھی سنجیدہ قارئین کو دے سکیں تو امر ہو سکتے ہیں۔ موضوعات کی رنگا رنگی یا کسی موضوع کی وسعت ہی وجہِ اعتبار کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ البتہ کسی خاص مصنف یا محدود موضوع پر پوری دیانت داری سے کچھ لکھ دیا جائے تو توقیر و تکریم کا باعث بن سکتا ہے۔ مانک ٹالا صاحب اور پریم چند پر ان کی دو کتابیں میرے ان الفاظ کا ثبوت ہیں۔ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

مانک ٹالا دستیاب مواد کی اساس پر حقیقت و صداقت پر پہنچنے والے محقق ہیں۔ نئے مواد کی روشنی میں اگر انہیں سابقہ فیصلے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو اس سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے متعدد نتائج اس لحاظ سے معرکہ خیز ہیں کہ انہوں نے اصل مواد تک رسائی حاصل کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر معروضی اور اظہارِ خیال میں والہانہ انکساری ان کی کتاب کو وقیع بناتی ہے۔ مجھے اس کتاب نے نئی روشنی عطا کی ہے اور یہ پریم چند کی تنقید میں بڑی مستقل معاون ہے۔
(ڈاکٹر انور سدید)

منشی پریم چند کے حوالے سے ایسی عالمانہ کتاب لکھنے پر میں جناب مانک ٹالا کو مبارکباد دینا چاہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مانک ٹالا نے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مانک ٹالا نے پریم چند کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو نہ صرف دور کر دیا بلکہ بہت سی نئی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ پریم چند شناسی کے باب میں یہ کتاب سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ (مشفق خواجہ)

مانک ٹالا صاحب نے اپنے نام کی نسبت موتیوں کی دکان تو نہیں کھولی لیکن ادب سے رشتہ جوڑ کر اپنے افسانوں، ناول اور تحقیق بالخصوص منشی پریم چند کے حوالے سے اردو ادب میں طرح طرح کے لعل، یاقوت، پکھراج اور زمرد بکھیر دیے ہیں جن کی منہ مانگی قیمت انہیں اس وقت ملی جب ان کی محنت اور فراست قلندرانہ ہو گئی۔ شہرت اور عزت ان کے پیچھے پیچھے اس طرح چلی آئی کہ انہوں نے اپنی بے نیازی کے سبب اس کی چاپ تک نہیں سنی۔ پریم چند پر ان کی کتابوں نے جب اردو دنیا میں دھوم مچا دی تو نہیں پتا چلا کہ وہ ایک نامور افسانہ نویس یا ناول نگار نہیں بلکہ قابلِ فخر محقق بن چکے ہیں۔ مجھے ان کی دوستی اور ان کا ناموں پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ (یوسف ناظم)

مانک ٹالا اردو زبان و ادب کا غالباً وہ پہلا ادیب ہے جس نے جامع اور منظم پیرائے میں پریم چند جیسے طویل اور طویل ادیب کے معترضین کا حرف حرف تجزیہ کیا اور اصل تصانیف کی جزئیات کے حوالے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ انہوں نے پریم چند کے خیالات اور نظریات کے متعدد ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو آج کے موضوعات اور مسائل سے ہم رشتہ ہیں۔ (جی۔ ڈی۔ چندن)

مانک ٹالا کی کہانیوں کی ستائش کی چاہ اس پرانے زمانے سے ہی میرے خون میں اتنی گھل مل چکی ہے کہ انہیں پڑھنے سے پہلے ہی میرے منہ سے واہ واہ کی کوئی آواز نکل جاتی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں ڈرامائی اتھل پتھل سے کام نہیں لیتے بلکہ روزمرہ کی نسبت میں ساری کہانی کہہ دیتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کردار ہماری اور آپ کی مانند معمول کی زندگی بسر کئے جا رہے ہیں۔ اس غیر محسوس کے دوران ان کی کہانی بڑی سرعت سے انجام تک آ پہنچتی ہے۔ افسانے پڑھ کر آپ اپنے ہی کسی تعاقب کو آئے ہوں۔ چند سال سے منشی پریم چند پر ان کی تحقیق و ریسرچ نے ان کی کہانی کی رفتار کو مدھم کر دیا ہے مگر حال ہی میں ان کی کہانیوں پر انہیں کا مضمون پڑھ کر مجھے ان کی تخلیقی بے چینی .... مگر وہ تو جتنے بے چین ہوں اتنے ہی پُرسکون دکھتے ہیں۔ (جوگندر پال)

مانک ٹالا کی یہ خوش بختی ہے کہ انہوں نے جب پریم چند پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اپنی حیات بے بہا کو پریم چند کے تحقیقی مطالعے کے لئے وقف کر دیا۔ اور اس تحقیق کو اس اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا جس کو اب اردو دنیا میں نہ صرف اعتبار حاصل ہے بلکہ اس کے حوالے کے بغیر منشی پریم چند پر کسی بھی طرح کی گفتگو ممکن ہی نہیں۔
(پروفیسر عبدالستار دلوی)

اردو ادب مانک ٹالا کے لئے ہمیشہ ایک ایسا پیاسا بنا رہا جسے یہ پانی میا جنون ہی کہ انہوں نے اردو ادب کی جھولی میں تحقیق و تنقید کے علاوہ انمول موتی ڈال دیے جو ان سے بڑا ایثار اور جوہری اور ادیب بھی نہیں ڈال سکا تھا۔
(مدن گوپال)

مانک ٹالا کے افسانوں کے پلاٹ کسی طے شدہ فارمولے کے تحت منضبط نہیں ہوتے۔ وہ معمولی واقعات کو اپنے افسانوں میں ویسے ہی جگہ دیتے ہیں جیسے سنجیدہ واقعات کو۔ اگر افسانہ پڑھنے کے بعد قاری فکرمند ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کرداروں میں بھی کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ کردار ہر کسی کو ہر جگہ پر مل سکتے ہیں۔ جن کی نفسیات کا افسانہ نگار نے بغور جائزہ لیا ہے مگر وہ اپنے پلاٹ یا کرداروں کی نفسیاتی گرہ کشائی یا سگمنڈ فرائڈ کے اصولوں کو اپنے قاری تک پہنچانے کے لئے ہرگز استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے معاشرے کے پچھڑے ہوئے لوگوں کے علاوہ فرقہ کی کہانیاں اور کردار اور فلمی دنیا سے کئی پلاٹ چن کر خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ مثلاً "شہرت کا کفن" "ساحل کا پتھر" "پنم اور شیخ اکبر" وغیرہ ان کی اکثر کہانیاں طنز و مزاح سے بھرپور ہوتی ہیں۔ بسا اوقات تو قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ کہانی ہے یا مزاحیہ خاکہ۔ سچ تو یہ ہے کہ مانک ٹالا نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔
(دیپک بدکی)

سخنِ آفتاب

کون اُس کو روک سکتا ہے!

وزیر آغا(لاہور)

زمیں پر دھجیاں
خیمے لگائے
منتظر بیٹھی ہیں
اُس جھونکے کی.... جو اِک روز
پژمردہ پہاڑوں سے اُتر کر آئے گا
خیموں کے پردوں کو
لرزتی اُنگلیوں سے چھو کے دیکھے گا
بڑے ہی پیار سے سہلائے گا
اور نیند سے نا آشنا
خیموں کے پردوں کے عقب سے جھانکتی آنکھیں
اُسے حیرت سے دیکھیں گی
پھر اک آنسو بھری نازک سی سرگوشی اُسے
آواز دے گی
اور کہے گی:
"خدارا آ
مجھے میرے بدن کے اس جہنم سے رہائی دے
مجھے آزاد کر مجھ سے!

مگر جھونکا کہ اک صحرائی بدو ہے
کبھی خیموں کی جانب چور قدموں سے نہیں آتا
دہکتی سُرخ آنکھوں
تیز لانبی برچھیوں سے لیس ہو کر
اِک سیہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے لپٹا
وہ آتا ہے تو دھرتی کانپ اُٹھتی ہے
پرندے پھڑ پھڑا کر آسماں کی سمت اُڑتے ہیں
دبک جاتے ہیں غراتے ہوئے کتے
طنابیں ٹوٹتی ہیں
لفظ مرتے ہیں
ہزاروں ساعتوں میں.... وقت
کٹ کٹ کر بکھرتا ہے
سُموں کی ضرب سے
خیموں کی ساری دھجیاں
چاروں طرف اُڑ اُڑ کے گرتی ہیں
خزاں میں جس طرح
شاخوں سے پیلے پات گرتے ہیں!

چمکتی ریت پر
چاروں طرف خیمے ہی خیمے ہیں
مکینوں سے کہو
پردوں سے مت جھانکیں
کہو پردوں سے لگ کر
یوں کھڑے رہنے کا آخر فائدہ کیا ہے!
اُسے آنا ہوا
تو کون اُس کو روک سکتا ہے!!

O

ہائیکو

محسن احسان (پشاور)

سورج کی تقدیر
ہر اک سایا بن جاتا ہے
پاؤں کی زنجیر

سرمائے کی دوڑ
تیرے میرے دکھ کا سیس
کوئی نہیں ہے توڑ

چڑیا بولتی ہے
بیٹھ کے گھر کی دیواروں پر
راز ہمارے کھولتی ہے

دریا بہتے ہیں
پنچھی پیڑ پرندے جنگل
ایک کہانی کہتے ہیں

زخموں کی تصویر
جاگتے سوتے ہم سے بولے
کچھ تو کرو تحریر

خیبر کی دیوار
سر پر رکھے برف عمامہ
دیکھتی ہے اُس پار

کیسا ماس اور ساکھ
رات کے ڈھیر سے ہم نے چن لی
بیتے دن کی راکھ

یہ بارودی کھیل
اتنا بھی مت کھیل کہ پیارے
جل جائے گی بیل

دریاؤں کے پار
میں نے اڑتے شام کو دیکھی
کونجوں کی اک ڈار

میں نے تیرے نام
اپنے کانپتے ہاتھوں لکھی
ایک گلابی شام

O

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (دہلی بھارت)

کارزارِ حیات

زندگانی کے سفر پر ہوتے ہیں جس دم رواں
ساتھ ہو لیتا ہے کرموں کا ہمارے کارواں

جذبۂ احساس، دستورِ عمل کے واسطے
اور کچھ سُود و زیاں، قلب و نظر کے واسطے

مشعلِ راہ کے لئے ہوتی ہے عقلِ سلیم
امتیازِ نیک و بد ہو، فرقِ ندیم و غنیم

طرزِ عمل کے واسطے ملتی ہے دل کو زباں
سفرِ حیات کو ہیں گردش میں ہفت آسماں

گرتے، پڑتے، لڑکھڑاتے، بے اماں، بے آسرا
پیچ و خم راہ، نشیب و فراز سے ناآشنا

وقت کی گردش تو ہے، ردِعمل اعمال کا
جو جو بویا تھا کبھی، بنا ثمر کا سلسلہ

طے شدہ ہے راہ مگر درپردہ منزل کے نشاں
نیک طینت کے لئے، اندیشۂ منزل کہاں

لاکھ کوشش پر بھی کھلتا نہیں بابِ حیات
ناتمام سی تشنگی، عمر بھر رہتی ہے ساتھ

جس کی سمجھ میں آ گئی، اے تشنہ دل کی رہبری
اُس کے لئے گلزار ساری زندگی یہ ہو گئی

طعنہ زن!

بچے امریکہ، کینیڈا وغیرہ میں مقیم ہو جانے پر کسی نے طعنہ زنی کی
کہ میرا بھارت میں کوئی نہیں ہے یعنی میں تنہا ہوں

ہر شخص ہے تنہا یہاں، ہر شخص سوداگر یہاں
کرنے آتے ہیں جہاں میں ہم حسابِ سُود و زیاں

ماتا پِتا، بھائی بہن، رشتے ناطے، دوست یار
اپنا سمجھتے ہیں انہیں، دراصل ہیں اپنے کہاں

مجھ پہ طعنہ زن ہے تُو ''کہ میرا یہاں کوئی نہیں''
اپنی کہو بندھو ذرا، تیرا بھی ہے کوئی کہاں

ہے چِتا کا کوئی ساتھی، کس کا لحد میں ساتھ ہے
آتے ہیں تنہا جہاں میں، چھوڑیں گے تنہا جہاں

زندگی کو تُو نے سمجھا، اِک ٹریجڈی گر ندیم
تیرے لئے ہر گام پہ ہے درد و الم کی داستاں

تُجھ پر ہے یہ منحصر، کس شئے کا اب طالب ہے تُو
رنج و غم، عیش و طرب، ہر طور کے ہیں رہبر یہاں

بھُول جا عہدِ گذشتہ، فکرِ فردا چھوڑ دے
حال کا ہر ایک لمحہ ہو جائیگا جنت نشاں

اور گر تشنہ کی صورت گاتا رہا ہر حال میں
تیرے لئے پھر زندگی ہے جامِ مئے ارغواں

O

تھوڑا وقت لگتا ہے

جاوید شاہین (لاہور)

درختوں سے اتر جاتے ہیں
جب سوکھے ہوئے پتے
تو موسم کو
برہنہ زرد شاخوں کو
نیا ملبوس پہنانے میں
تھوڑا وقت لگتا ہے

زمیں میں بیج ڈالو تو
اُسے اک پودا بننے
اور اس پودے پہ پھل آنے میں
تھوڑا وقت لگتا ہے

پہاڑوں کے سروں پر
برف کی تہ کو پگھلنے
اور پانی کی چمکتی دھار بن کر
خشک اور پایاب دریاؤں کو
بھر دینے میں
تھوڑا وقت لگتا ہے

مری جاں!
خواب جو ہم سب نے دیکھا ہے
وہ سچا ہے
کبھی اس خواب کی تعبیر سے مایوس مت ہونا
بس اتنا ذہن میں رکھنا
کہ ایسے خواب کو
زندہ حقیقت میں بدل دینے میں
تھوڑا وقت لگتا ہے

کھڑکی

انور سدید (لاہور)

مجھے احساس ہے میں نے
ابھی کچھ کام کرنے ہیں
ستارے جو مری پلکوں پہ آنسو بن کے چمکے تھے
انہیں میں نے نئے منکوں کی مالا میں پرونا ہے
نئے مفہوم کے میں نے ابھی اشعار کہنے ہیں
پھر ان اشعار کو لوگوں کے دل میں
جاگزیں کرنا بھی اک دیرینہ خواہش ہے
جوانی میں جو میں نے شاعری کی تھی
وہ اب مجھ کو ادھوری شاعری لگتی ہے
ناپختہ خیالوں .... اور نا آسودہ جذبوں کی
اگرچہ زندگی کا ساتواں عشرہ بسر کرتا جا رہا ہے
مگر اب ایک کھڑکی دل میں اپنے کھول دی میں نے
خیالوں کی جو تازہ آکسیجن سے
مجھے سیراب کرتی ہے
یہ کھڑکی میرا داخل ہے
یہ کھڑکی میرا خارج ہے۔

O

''سب سے پہلے پاکستان''

ماجد سرحدی(پشاور)

خودکش حملوں کا طوفان
جاں سے گئے کتنے انسان
قائم ہے ان کا ایمان
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

ہرسُو گھور اندھیرے ہیں
مہنگائی کے ڈیرے ہیں
سارے کانٹے میرے ہیں
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

خودداری کا نام نہیں
یکجہتی سے کام نہیں
محنت کا انعام نہیں
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

چور اُچکّے رہبر ہیں
ان کے چرچے گھر گھر ہیں
''وہ'' کہتے ہیں بہتر ہیں
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

وہ کب ڈرتے ہیں رب سے
گویا ایک نئے ڈھب سے
کھیل رہے ہیں مذہب سے
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

موسم لیگ کی ذاتاں کی
بات کرو گجراتاں کی
کیا جچب ہے اِن راتاں کی
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

کچھ تو آخر کرنا ہے
دریا پار اترنا ہے
دیس کی خاطر مرنا ہے
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

دیپ سے دیپ جلانے دو
ہم کو مقتل جانے دو
صبحِ طرب کو آنے دو
پھر بھی بولو جانِ جان
سب سے پہلے پاکستان

میر قربان علی جوہر کی یاد میں

یونس صابر (پشاور)

گذشتہ شب، جب خیال آنگن میں آ کے اُس نے جھلک دکھائی
جو آجکل ہسپتال میں کچھ دنوں سے زیرِ علاج بھی تھا
تو میں نے اپنے سمندروں پار، یار کی بیکسی پہ لکھا
''اے شہرِ یارِ سخن! پشاور ترے لئے کچھ اُداس بھی ہے
تری شفا کے لئے دعا میں اُٹھائے ہاتھوں کو آس بھی ہے
تُو آن بیٹھا ہے میرے چمن جی، یہاں جو کر کے غزل بہانہ
ہو موڈ اچھا تو نرس اور ڈاکٹر سے پہلے مجھے سُنانا

اِس حجرۂ میر کا تھا والی بقولِ سیّد ضمیرؔ جوہر
بقولِ آنندؔ تھا بلاشک قلم قبیلے کا میر، جوہرؔ
وہی تو نیویارک میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا رہا تھا
وہی ادیب شہیر، روشن خیال ہے ''زاویہ'' کا بانی
جسے وہ جانِ عزیز تک بھی نچوڑ کر پالتا رہا تھا
میں اپنے کمرے میں بیٹھا بیٹھا نئے کیلنڈر کو دیکھتا ہوں
کہ لحظہ لحظہ یہ دن تو ہفتوں میں، پھر مہینوں میں ڈھل رہے ہیں
اور اتنی سُرعت سے واقعاتِ جہاں بھی تیور بدل رہے ہیں
بجا کہ کل کی طرح ہم اربابِ ذوق مل بیٹھتے ہیں اب بھی
پہ آج مرحوم اُس کو کہتے کلیجہ آتا ہے مُنہ کو صابرؔ!
میں جاؤں قُربان میر جوہرؔ پہ ہائے وہ اپنا جانِ جاناں
بھلائیں کیونکر اُسے جو رہتا ہے یاد بن کر دلوں میں مہماں!!

(''زاویہ'' نیویارک کی نئی ایڈیشن کی رونمائی بمقام نشتر ہال پشاور پڑھی گئی نظم)

ایک منظر....ایک پل

غالب عرفان (کراچی)

ریشمی زُلفیں ہوا میں اڑتی رہنے کا عمل
خامشی میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ برمحل

وقت کی ٹھہری ہوئی مہکی فضاؤں کا فسوں
ایک موسم، ایک ساعت، ایک منظر، ایک پل

جسم کا ہر زاویہ ملبوس سے اُلجھا ہوا
اُس پہ شانوں سے پھسلتا یہ ترا آنچل، پہ بل

کچھ ہواؤں کی شرارت پر نہیں ہے منحصر
کچھ تری فطرت ہی باغی ہو چلی ہے آج کل

O

اعتذار

خیال آفاقی (کراچی)

(کرشن کمار طور کی نذر)

دل میں مرے کجی، نہ مری عقل میں فتور
تضحیک آدمی کی کروں میں؟ نہیں حضور

میں کہ ہوں خاکسار بھی، عبرت نگاہ بھی
لے ڈوبا میرے سامنے ابلیس کو غرور

تضحیک آدمی مرے مسلک میں ہے حرام
انسان سے زیادہ مقدس نہیں ہے طور

میری زبان اور قلم سے خداگواہ
سرزد نہ ہو سکا کبھی ایسا کوئی قصور

لکھتا ہوں وہ کہ جس سے کسی کا نہ دل دُکھے
کہتا ہوں وہ کہ جس سے حقیقت کا ہو ظہور

میں سرتاپا دھڑکتا ہوا دل ہوں اور بس
روشن مرا ضمیر ہے، زندہ میرا شعور

یہ شعر و شاعری تو محبت کی ہے زباں
دیتی ہے یہ دلوں کو نئے زیست کا سُرور

سمجھے نہیں ہیں میری سخن گسترانہ بات
ورنہ تو بدگمان نہ ہوتے جناب طور

دراصل میرے ذوق سماعت پہ تھی گراں
''میں میں'' کی وہ ردیف کہ جس کا ہے یہ فتور

انداز میرا شوخ تھا، یہ اعتراف ہے
''آوازِ بُز'' کو لایا تھا تمثیل میں ضرور

لیکن نہیں تھا اس سے یہ مطلب کہ جو لیا
اس بات سے ہی میری طبیعت کو ہے نُفور

تضحیک ایک لفظ نہیں ہے یہ سنگ ہے
کہ جس کی ضرب سے مرا شیشہ ہے چُور چُور

پھر بھی اگر ہے مجھ سے شکایت تو برملا
میں مانتا ہوں اپنی کہی بات کا قصور

اک لفظ معذرت کا ہی بچّہ ہے میرے پاس
کیجیے قبول مجھ سے نہ کیجیے مگر نفور

سمجھوں گا میں کہ آپ ہیں بھگوان کے منش
کر دیجئے گا میل اگر اپنے دل سے دُور

پھر اتفاق کیوں نہ کریں درگذر پہ ہم
بندے کو کیا کلام ہے خالق ہے جب غفور

نیم کا درخت

ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج بھارت)

میرے گاؤں کے آنگن میں
وہ نیم کا درخت
آج بھی جوں کا توں کھڑا ہے
میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں
تو ایک یادوں کا سلسلہ
میرے ذہن میں
سینما کے پردے کی طرح
سامنے آجاتا ہے
اور ایک ایک تصویر
مجھے چیخ چیخ کر پکارتی ہے
اور نیم کا درخت
میری راہ تکتا ہے

O

تین رُخ

فیصل عظیم (کینیڈا)

وہ روح میری
ضمیر میرا
خدا وہ میرا
میں دائروں سے نکل چکا ہوں
مگر یہ تثلیث
جس میں اب میں بھٹک رہا ہوں
کہاں رکوں میں
ہر ایک نقطہ اک آئینہ ہے
جہاں سے میں
خود کو باقی کونوں میں نصب دیکھوں
جہاں بھی جاؤں
میں اس تکونے سوال میں اب الجھ رہا ہوں
کہ میں کہاں ہوں
ضمیر ہوں اپنی روح ہوں یا خدا ہوں
یا سب سے میں جدا ہوں
اور اس مثلث پہ میں
ازل سے جما ہوا ہوں

O

میں زمین کا وفادار رہوں.....ڈاکٹر جواز جعفری(لاہور)

سُنو!
میری آنکھوں کے کھیت میں
اجنبی سمتوں کا تجسس اُگتا ہے
میرے کانوں پر
اَن سنی آوازوں کا رزق اُترتا ہے
میرے پاؤں کو
کسی غیر منکشف سیارے کی ان چھوئی خاک پر
اپنے نقش چھوڑنے جانا ہے!
میری ناک
کسی اجنبی مٹی کی خوشبو کو
اپنے اندر اتارنے کی آرزو میں جاگتی ہے
اور زبان
کسی نامعلوم سیارے کی زرخیز مٹی میں جڑ پکڑنے والے
سایہ دار درختوں کی شاخوں پر لہراتے
رس بھرے پھلوں کی تمنا میں روزہ دار ہے!
مجھے زمیں سے خلا تک
روشن راستوں کا جال بچھانا ہے!
میں روشنی کے سرکش گھوڑے کو
اپنے اصطبل میں کھونٹے سے باندھ کر
تیرے پاس آیا ہوں!
اُس کی پُشت پر زین
اور رکاب میں پاؤں رکھنا
میرا خواب ہے
(کہ اکثر خواب ناممکنات ہی کی شاخ پر کھلتے ہیں)
مجھے روشنی کے گھوڑے پر بیٹھ کر
کائنات کے دور پار کے اجنبی خطوں میں
زندگی کے بیج چھینٹنے جانا ہے
کیونکہ زندگی نہتی ہے
اور موت کے نرغے میں ہے
میں زمین کا وفادار رہوں
زمین زادو! بول
چلے گی میرے ساتھ؟

بشارتوں کے ترجمان

شگفتہ نازلی(لاہور)

(جناب منیر نیازی کی رحلت پر)

اُن کا سفر تھا ہونا نامعلوم کی طرف
بھیدوں بھرا اُجالا اُن کے ساتھ رہتا تھا
خوابوں سے آگہی کا بھی طرفہ تھا راستہ
حیرانیوں کا ہالہ اُن کے ساتھ رہتا تھا!

جنگل میں ہو دھنک کہ چھپے رنگین دروازے
جو کچھ لکھا گیا وہ اسلوب منیر ہے
ہو پہلی بات آخری کہ بھولتی دُعا
جو کچھ پڑھا گیا وہ اُسی کا اسیر ہے!

کچھ شعبدے وہ شعر و نغمی میں یوں کر گئے
پانی میں آگ شعلوں سے گلزار کھل گئے
دُنیا کی آنکھ سے چھپایا اپنے درد کو
حزن و ملال سب کے سب مصرعوں میں ڈھل گئے!

اِک خواب کی سی کیفیت میں شعر پڑھتے تھے
تھی خوابناک شاعری اور بھیدوں سے گندھی
قاری کی جستجو کو وہ مہمیز کرتی تھی
منظر میں اس کے کیا تھی سوچیں ہری بھری!

وابستہ اُن کی ذات سے کوئی سحر سا تھا
کیا شخصیت تھی اور کیا انداز و ناز تھے
گو کہ وہ خاص و عام میں مقبول ہی رہے
لیکن وہ اپنی شہرتوں سے بے نیاز تھے!

رونے والا چہرہ لے کر....!

سید تحسین گیلانی (بورے والا)

کب تک رینگتے وقت کو بیٹھے
پہروں تکتے رہنا ہے
کب تک ہنستے ہنستے ہم نے
دُکھ کو سہتے رہنا ہے
کب تک خون یا آنسو بن کر
آنکھوں سے یوں بہنا ہے
کب تک لاشے دیکھ کے خود کو
''گھبرو'' ہم نے کہنا ہے....!

رونے والا چہرہ لے کر
کب تک ہنستے رہنا ہے....؟

O

رباعیات

قیصر نوری (کراچی)

پاکیزہ حکایت کو بدلنے والو
مضبوط روایت کو بدلنے والو
کھو بیٹھو نہ پہچان کہیں خود اپنی
سورج کی حقیقت کو بدلنے والو

مانوس نہ ہو پائے تری الفت سے
ہر آن ہی دوچار رہے نفرت سے
اک عمر گزاری تری ہمراہی میں
ہم تشنۂ احساس رہے مدت سے

دنیا کے حوادث کا نہ کھٹکا ہوتا
گمنام اگر ہوتا تو اچھا ہوتا
ہر شخص نے پہچان لیا ہے مجھکو
اے کاش کہ منظر پہ نہ آیا ہوتا

کس طرح تمدن کا چمن لٹتا ہے
شادابیٔ تہذیب کا دم گھٹتا ہے
افسوس کہ کس درجہ برا وقت آیا
ہر شاخِ ثمرور سے دھواں اُٹھتا ہے

O

چلو ہم بھول جائیں

علی آذر (کراچی)

چلو کچھ دیر کو ہم بھول جائیں
کہ آنگن میں ہمارے
چودھویں کی رات کو بھی
چاندنی آتی نہیں ہے
چلو ہم بھول جائیں
کہ سایہ ہم سے بے حد سرگراں ہے
اور تپتی دھوپ میں ہم کو جھلسنا پڑ رہا ہے
چلو ہم بھول جائیں کہ
سفینہ زندگی کا
ہمیشہ ہی بھنور میں ڈولتا ہے
ڈُباتا ہے نہ ساحل ہی پہ لاتا ہے
چلو تقدیر کے تارے کو کر دیں
ہم نظر انداز کہ
ہر وقت رہتا ہے
وہ بُرج نحس کے اندر
اگر ہم بھول جائیں
تو تارا مسکرائے
اور بُرج نحس سے باہر وہ آئے
سفینہ تھک کے ہم کو پھینک دے ساحل پہ جاناں
نکل کے سایہ دلدل سے ہمارے سر پہ آئے
اور آنگن میں ہمارے چاند اُترے
کہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ
جس کو پوجتے ہیں وہ خدا بن بیٹھتا ہے
اور جس کو چھوڑ دیتے ہیں
وہ اپناتا ہے ہم کو
چلو ہم بھول جائیں!

ایک پرندہ

شارق بلیاوی (کراچی)

چل رہی تھیں کلہاڑیاں پیہم
پیڑ کا جسم زخمی زخمی تھا
اک پرندہ اُداس بیٹھا تھا
اک لرزتی سی شاخ کے اوپر
کتنا مغموم اور دُکھی تھا وہ
اس نے چن چن کے ڈھیر سے تنکے
گھونسلا چھوٹا سا بنایا تھا
اس کے انڈوں سے آج بچوں نے
اپنی چونچیں نکالی تھیں باہر
اور اب پیڑ گرنے والا ہے
سوچ میں گم ہے شاخ پر اپنی
پچھلا موسم بھی ایسا گذرا تھا
آشیاں میرا یونہی اُجڑا تھا
کیا بنے گا ہماری نسلوں کا
گر یہی بار بار ہوتا رہا!

O

حسابِ دوستاں

پروفیسر محسن احسان

خاکہ نگاری ایک دلچسپ مگر بڑی دیدہ ریزی والی صنفِ ادب ہے۔ خاکہ نگاری کی پہلی شعوری کوشش ہمیں محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں پہلی مرتبہ ملتی ہے۔ آزاد نے قدیم تذکروں کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ "ان میں نہ کسی شاعر کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے اور نہ اس کی طبیعت اور عادات اور اطوار کا حال کھلتا ہے۔" سو محمد حسین آزاد نے یہ واجب جانا کہ ان بزرگ شخصیتوں کے احوال جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں انھیں یکجا کر کے اس طرح لکھیں کہ "ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آ کھڑی ہوں...." آزاد کا کمالِ فن یہ تھا کہ انہوں نے شاعروں کی شکل و صورت جسامت وضع قطع لباس تراش خراش بول چال عادات اطوار مزاج چلبلاپن غرضیکہ ظاہری و باطنی ہیئت کذائی کے ہر پہلو کی آئینہ داری کی اور اس میں قاری کی دلچسپی کو بھی پیش نظر رکھا اور ادبی حسن کو بھی پورے نکھار کے ساتھ پیش کیا.... مولانا آزاد کے بعد تو پھر یہ صنف ایسی مقبول ہوئی کہ بہت سے لکھنے والوں نے اپنے دوستوں جاننے والوں ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کے وہ وہ خاکے لکھے کہ پڑھنے والے پر اس کی شخصیت کے سارے پہلو نمایاں ہو گئے۔ ان سے نہ صرف اس شخصیت کو سمجھا بلکہ اس کے آئینے میں اپنی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی اور دلی کا یادگار مشاعرہ لکھ کر اس صنفِ نثر کو مزید آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے "کیا خوب آدمی تھا" کے عنوان سے اپنے احباب کی نشست و برخاست، رہن سہن خانگی زندگی کی مختلف کیفیات بیان کیں۔ اور اس عہد کی تہذیبی وضعداریوں کا تذکرہ کیا۔ مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گراں مایہ" جان پہچان کے معروف و غیر معروف لوگوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں ہیں۔ یہ دونوں حضرات تاریخی پس منظر بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور سیرت کردار اور نظریات پر بھی بحث کرتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے اور پھر اس کے بعد شخصیات کا ایک کتابی سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں بہت سے ہم عصروں نے اپنے ہم عصر لکھنے والوں کی بڑی دلچسپ معلومات افزا اور فکر انگیز قلمی تصویریں پیش کیں۔ سعادت حسن منٹو کی کتاب "گنجے فرشتے" اس دور میں ایک اہم اضافہ ہے جن میں شخصیتیں اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ تو سامنے آتی ہیں۔ صوبہ سرحد میں فارغ بخاری نے پہلا البم اور پھر دوسرا البم لکھ کر اپنے احباب کے بڑے دلکش خاکے لکھے۔ حال ہی میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی تازہ کتاب "حسابِ دوستاں" منصۂ شہود پر آئی ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ایک ماہرِ تعلیم بھی ہیں۔ محقق بھی ہیں کالم نگار بھی ہیں۔ سفرنامے بھی لکھے ہیں اور ان کی دوستوں کے خاکوں پر مشتمل یہ کتاب ان کی شخصیت کے ایک اور رخ کو سامنے لاتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ خاکہ نگار بھی ہیں۔ یہ کتاب ان ایک سو ادبی سیاسی، سماجی اور تعلیمی شخصیات کے بڑے دلچسپ خاکوں پر مشتمل ہے جن کا ظہور احمد اعوان سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی ہلکا سا واسطہ بھی رہا ہے۔ یہ ڈاکٹر اعوان کی ژرف نگاہی اور نکتہ رسی ہے کہ انہوں نے ملنے والے کی شخصیت کو نہ صرف باہر سے بلکہ ذات کے اندر بھی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ان شخصیات کے تعلیمی، علمی، ادبی، تحقیقی، تخلیقی، تہذیبی یا ثقافتی کارناموں پر بحث نہیں کرتے ان کے بارے میں کوئی تفصیلات مہیا نہیں کرتے بلکہ ان کارناموں کے پیچھے جو تصویر ہے اس کا اصل چہرہ پیش کر کے اپنے ذاتی تاثرات بیان کر دیتے ہیں۔ وہ خوبیاں بھی اجاگر کرتے ہیں اور کوتاہیوں کے بیان میں بھی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ان کے ان خاکوں میں ایک زندہ متحرک گوشت پوست کا انسان آپ کے سامنے آتا ہے جس کی ذات کے سارے پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اعوان ان شخصیات کے جسموں پر سے علمیت، فضیلت، افسرانہ جاہ و جلال، رئیسانہ ٹھاٹ باٹ یا دیرانہ لبادہ کو اتار کر روزمرہ کے سیدھے سادے لباس میں پیش کرتے ہیں۔ وہ انہیں ویسا ہی بیان کرتے ہیں جیسے وہ سچ مچ کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اعوان لوگوں کے کردار کی اونچ نیچ مزاج کے ایچ پیچ عادات کی بلندی و پستی طبیعت کے رجحانات اور ذہنی کیفیات پر زور رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے لگتا ہے کہ شخصیت کاغذ پر ایک زندہ پیکر کی طرح سامنے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن سب کچھ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ان خاکوں کی اصل روح یہی جذبات تاثرات اور احساسات ہیں۔ واقعات کا انتخاب اور ان کا بیان ان کو دلکش و دلپذیر رنگوں سے زینت بخشتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاکہ نگار کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ کون شخص فی الحقیقت کیسا ہے۔ ڈاکٹر اعوان اس فنی تقاضے کو کچھ یوں نبھاتے ہیں کہ وہ شخص ان کو کیسے لگا۔ بعض مقامات پر ڈاکٹر اعوان نے اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے واقعات و عادات کے بیان میں اس کے چاروں طرف روشنیاں کچھ اس طرح پھیلا دیں کہ نظریں چکا چوند ہونے

گئیں۔ وہ کسی شخص کی عادت کو بیان کرتے ہوئے اسے خوبی سے ملا دیتے ہیں لیکن اس بات پر مجبور نہیں کرتے کہ قاری بھی اس کو خوبی سمجھے۔ یہ خاکہ نگار کا ذاتی تاثر ہے اور یہ تاثر بڑا مہذب شریفانہ اور مثبت پہلو لئے ہوئے ہے کہیں متعصبانہ یا منافقانہ لب و لہجہ دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر اعوان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہمدردانہ رویہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور وہ شخصیت کے خدوخال کو پیش کرتے ہوئے اسے نظر انداز نہیں کرتے۔ سو کے لگ بھگ ان خاکوں میں سے کسی ایک شخصیت سے بھی آپ کو اس کے انداز چال ڈھال وضع قطع گفتگو رویے یا سوچ سے نفرت نہیں ہوتی۔ پورا خاکہ پڑھنے کے بعد شخصیت کے اچھے پہلو ہی آپ پر واضح ہوتے ہیں۔ اور یوں احترام کا جذبہ آپ کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے اور اس شخصیت کے رنگ گہرے اور نقوش تیکھے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی طرز تحریر کی یہ خوبی بھی قابل ستائش ہے کہ تاریخی سوانحی اور تنقیدی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی خدوخال سے مزین ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اعوان 'حساب داستاں' میں اپنی بات میں یوں گوہر افشاں ہیں "میرا یہ بھی عقیدہ ہے ہر برے سے انسان میں بھی ایک اچھا انسان پایا جاتا ہے۔ اس کو اس وقت ڈھونڈا جا سکتا ہے جب ڈھونڈنے والا تعصب، تنگ نظری خود پرستی اور انانیت کی عینکیں اتار کر ایک طرف رکھ دے۔ صرف اپنے ساتھ محبت کرنے والا آدمی بہت سے دوسرے انسانوں کی محبت کھو دیتا ہے۔" یہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ دوستوں کے اچھے پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور بشری خامیوں والے پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن انہیں جہاں شخصیت کے سب پہلو بیان کرنے ہوں تو بقول ان کے "قصاب کے چھرے کی جگہ ایک نرم دل سرجن کا نشتر" استعمال کرتے ہیں.... وہ بہتر خاکہ نگار ہونے سے زیادہ بہتر انسان ہونا پسند کرتے ہیں.... لیکن میرے نزدیک ڈاکٹر اعوان نہ صرف بہتر خاکہ نگار ہیں بلکہ بہتر انسان بھی... کہ ان کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انسان کو ایک ارفع درجہ عطا کرتی ہیں۔ وہ ایک ہمدرد استاد ایک مشفق والد ایک قابل اعتماد دوست ایک عمدہ رفیق کار اور ایک باشعور قلمکار ہیں۔ میں انہیں 'حساب داستاں' پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

یہ کتاب ادارہ علم و فن کے صدر کرنل حمایت اللہ خان کی نگرانی میں چھپی..... کمپوزنگ پر ذرا سی توجہ اس کو مزید بہتر بنا سکتی تھی... اس کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے۔

O

منزل نہ کرقبول

(سفرنامہ پنجاب)

نامور ادیب' دانشور اور سفرنامہ نگار جناب داؤد طاہر نے جس برق رفتاری سے اردو ادب بالخصوص سفرنامہ کے باب میں اپنا مقام منوایا اور اعلیٰ ادبی حلقوں سے داد حاصل کی ہے اُس کی ایک نمایاں مثال اور اعتراف حکومت پنجاب کی وزارت ثقافت اور نوجواناں کی جانب سے 2004 ء کے ثقافتی کتب کے انعامی مقابلے میں جناب داؤد طاہر کی کتاب ''منزل نہ کرقبول'' کو اوّل انعام سے سرفراز کرنے کی صورت میں نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے۔ زیرِنظر انعام و اعتراف کے ہمراہ حکومت پنجاب کی جانب سے ایک لاکھ روپے کا چیک بطور انعام بھی پیش کیا گیا ہے۔ ادارہ چہارسُو جناب داؤد طاہر کو اعلیٰ ادبی فتوحات پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے مستقبل کی بابت بہتر توقعات کے ساتھ ہدیہ تبرک پیش کرتا ہے۔

O

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

امتزاجی تنقید

ہر دور میں تخلیق اور خالق کے اٹوٹ رشتے کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے لیکن مغرب میں نئی تنقید سے وابستہ ناقدوں میں ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے فن پارے میں خالق کے وجود پر پہلی بار سوالیہ نشان قائم کیا' اس لئے کہ اس کے عہد کی تنقید میں فن کار کے سوانحی حالات اور معاملات پر زیادہ اصرار کیا جانے لگا تھا۔ ایلیٹ نے جہاں اس تنقید کے عمل کو بے سود قرار دیا' وہیں تخلیق میں تخلیقکار کی شمولیت سے تخلیقی عمل میں شدید رکاوٹ کا احساس بھی دلایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب کی تخلیق کے لئے فن کار کو کلیتہً مسترد نہیں کرتا' وہ متن میں اس کے بھاری بھرکم وجود کو داخل ہونے سے تخلیقی عمل پر جو غلط اثر پڑتا ہے' اس کی نفی کرتا ہے مگر رولاں بارت نے یہ کہہ کر Writing Writers, Not the Writer (لکھت لکھتی ہے' لکھاری نہیں) تخلیق کار کی تخلیق میں شمولیت سے ہی انکار کردیا۔ سوسیور کے لانگ اور پارول کے نظریے کو بنیاد بنا کر بارت نے مصنف کی عملی کارکردگی کو جس طرح متن سے باہر پھینک دیا تھا' اس سے نیا دبستان اور مدلل انداز میں دریدا نے پیش کیا۔ دریدا نے خالق اور تخلیق کی بحث میں معنی کے التوائی عمل کو نشان زد کیا۔ معنی کی مرکزیت کے خلاف اس نے جو نظریہ پیش کیا' اس کے تحت معنی ہر ہر قدم پر ملتوی ہوتا چلا جاتا ہے اور معنی کا التوائی عمل ایک گورکھ دھندا یا Labyrinth جو آزاد کھیل (Free Play) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے ساختیات' پس ساختیات اور ساخت شکنی جیسے نئے مغربی نظریات کا مطالعہ بھی کیا اور ان سے اردو ادب کو روشناس بھی کرایا مگر وہ اپنے عہد کے دیگر ناقدین کی طرح مغرب پرستی کے رجحان کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے ان کے شگافوں کو تلاش بھی کیا اور مختلف موازنوں کے ساتھ ایک ایسا متوازن موقف اختیار کرنے کی کوشش کی جو تخلیق و تنقید دونوں راستوں کو کشادہ کرسکے۔

امتزاجی تنقید

کے "پیش لفظ" سے مختصر اقتباس بہ قلم جناب اسلم حنیف

جدید فکر کے حامل تیرہ مضامین کے مجموعے کی ضخامت ایک سو چھتیس صفحات پر محیط ہے جبکہ دستیابی کا پتہ:

اردو سائنس بورڈ' 299 اپر مال لاہور قیمت: ایک سو پچاس روپے

اگلے پل کی طرف

آئینوں میں عکس ہو کر صورتیں رہ جائیں گی
سب کی آنکھوں میں بلا کی حیرتیں رہ جائیں گی

ساتھ ہم کو وقت کا دھارا بہا لے جائے گا
وہ جو ہاتھوں میں لکھیں ہیں قسمتیں رہ جائیں گی

قربتوں کی آرزو تھی یہ مگر سوچا نہ تھا
کرب دل بن کر ہماری قربتیں رہ جائیں گی

روشنی سے ایک دن محروم ہو جائیں گے لوگ
جگنو کا قتل ہو گا ظلمتیں رہ جائیں گی

گھر ہمارے بچے ہی پھر شہر اُجاڑا جائے گا
اور ہمارے واسطے پھر ہجرتیں رہ جائیں گی

آندھیوں کے سامنے جب بادباں ڈٹ جائے گا
ٹوٹ کر طوفاں کی ساری شدتیں رہ جائیں گی

لوگ کہتے ہیں کہ دولت ہی سب کچھ ہے فصیح
میں یہ کہتا ہوں' دہری سب یہ دولتیں رہ جائیں گی

کم وقت' کم جگہ اور کم الفاظ میں جامع بات کہنا بصری ضرورت بھی ہوا کرتی ہے اور مجبوری بھی۔ قطع نظر اس کے خواہش اور ترجیح کے بھی اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ اس بار خواہش اور ترجیح کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپ کو شاہین فصیح ربانی کی تازہ شعری تخلیق سے نمائندہ اشعار کی بجائے صرف ایک غزل سے متعارف کرا کر وقت کی رفتار اور مزاج سے نہ صرف باخبر کریں بلکہ اپنے دور کے اس نادر و نایاب شعری نسخے کی بابت اُن بلند قامت تخلیق کاروں کی آرا سے بھی آپ کو متعارف کرائیں جنہیں اس دور کا معراج سمجھا جاتا ہے۔

"شاہین فصیح ربانی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جوش میں بھی ہوش کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں اپنی اپنی فکر میں کھوئے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر میدان حشر کا گمان ہوتا ہے۔ وہ جب استحصالی قوتوں کو قوی ایٹمی اور قوانین کا تحفہ

محروم طبقات سے پر پر پھیلا دیکھتے ہیں تو برملا کہہ اُٹھتے ہیں کہ جھونپڑی جلاتے وقت ذرا خیال رہے کہ یہی آگ ہوسکتا ہے کہ محلوں تک پہنچ جائے..... امین راحت چغتائی۔

"شاہین فصیح ربانی کی غزل میں شعری تصاویر کے کئی ایک مرقعے جگمگا رہے ہیں، تخلیقی کمال اور حقیقی وصال کے ساتھ انہوں نے اپنی غزل میں جو کچھ کہنا چاہا ہے وہ کہہ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے شعر میں وہ اتنے ہی مہربان ہیں جتنا کہ سراغِ حقیقت کو پا لینے سے کوئی بلوان ہو جاتا ہے۔ شاہین فصیح ربانی انتہائی ذہین اور فطین شاعر ہیں۔ اردو غزل کے قدیم اور جدید دبستان ان کی پہچان میں جلوہ ساماں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مسلسل محنت سے اپنے اصل ہدف کو جلد پالیں گے".....ناصر شہزاد

"شاہین فصیح ربانی کے شعر کی سب سے بڑی خوبی 'تازگی' ہے وہ پیدائشی شاعر ہیں اور روحِ عصر سے اپنی شاعری میں اثر و تاثیر کا جادو جگاتے ہیں".....ڈاکٹر جمیل جالبی

دو صد چھتیس صفحات مجلد کا یہ نمائندہ شعری نسخہ صرف دو صد پچاس روپے کے عوض بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان، پوسٹ بکس نمبر 17667، کراچی سے دستیاب ہے۔

حرفِ بارباب

"غلام مرتضیٰ راہی کی غزل کا روایت سے رشتہ" "معاصر جدید غزل گویوں میں راہی کا مقام" "راہی کی غزل میں آفاقی جمالیات و زمانی تصور" "راہی کے شعری مجموعوں امکان اور لاشعور کے نئے شعری افق" "راہی کی غزل میں تمثال سازی و حواس و عناصر کی درجہ بندی" "راہی کی غزل اور بیسویں صدی میں غزل کے نئے موڑ" "راہی کی غزل جمالِ فطرت کی جولان گاہ" "راہی کی غزل کا فنی تجزیہ" سب سے پہلے ظفر احمد صاحب جو عشرت ظفر کے نام سے 'نوشتہ'، 'بخت پرکار'، 'اشب'، 'سفال' جیسے اعتبار کے حامل شعری مجموعوں کے خالق "آخری درویش" جیسے وسیع کینوس کے حامل ناول 'احتساب'، 'حرفِ بارباب' اور 'تکوین' جیسی بلیغ تنقیدی کتب کے خالق اور پیشے کے اعتبار سے ماہر معاشیات ہیں۔ اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ جناب عشرت ظفر نے غلام مرتضیٰ راہی صاحب جو خود معروف صحافی اور نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعوں کے حامل نئے ذائقے اور بلیغ امکانات کے شاعر ہیں انہیں جناب عشرت ظفر نے کن کن نامور بلند قامت اور منفرد شعرا کی میزان میں تولا ہے۔ جناب غنی کاشمیری، جناب آنند رام مخلص، جناب رتنی داس، جناب صائب، غالب، سعدی، میر، ناسخ، قائم، مصحفی، سیماب، وحشت کلکتوی، مجروح، کوثر جائسی، شمس الرحمٰن

فاروقی، شہریار، وزیر آغا، مسعود سبزواری، عرفان صدیقی، زیب غوری، ظفر اقبال، سلطان اختر، مشتر خانقاہی، ساقی فاروقی، شہزاد احمد، شکیل رضا، عبداللہ کمال، آزاد گلاٹی، اور اسعد بدایونی وغیرہم۔ جس شاعر کے کلام، اُٹھان اور اڑان میں اس قدر مقدم اور موادب آوازیں اپنا رنگ دکھلا رہی ہوں اُس کی بابت نئے نئے زاویوں، عنوانات، میلانات کی بابت گفتگو اور اس کے نتائج سے آپ کی دلچسپی نہ صرف آپ کو بلکہ جناب عشرت ظفر کو بھی بامراد کر سکتی ہے جنہوں نے جناب غلام مرتضیٰ راہی کے کلام سے نئے نئے نکتے اور نئے نئے امکانات تراش اور تلاش کر کے عصر کی انتہائی اہم اور معتبر شعری آواز کو نمایاں تر کر کے ہماری اور آپ کی توجہ اُس عظمت آمیز کلام کی جانب مرکوز کرائی ہے جو اپنے وقت کی نمائندہ، طاقتور اور منفرد آواز بھی ہے اور مستقبل کی بابت جس کی نسبت بہت سی خوش اُمیدیاں باندھنا اُس طرح قرینِ قیاس ہے جس طرح شاعر اپنی دانست میں آئینہ بکھیر رہا ہے۔

چہرے کو اپنے دیکھنا چاہا تھا چاند نے
آئینہ لے کے پہونچا سمندر زمیں کا

پہلے اُس نے مجھے پھیلا دیا عالم عالم
اور پھر سوئی کے ناکے سے نکالا مجھ کو

آذر ہے کب سے میرے اشارے کا منتظر
سنگِ وجود سے مرے تیشے کا ڈر نکال

نکلا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے
چبھے تو دونوں مگر ایک مہرباں ٹھہرا

جناب غلام مرتضیٰ راہی کا شعری مجموعہ "حرفِ بارباب" ایک سو چھتیس صفحات مجلد پر مشتمل ہے جس کی قیمت ایک سو پچاس ہندوستانی روپے اور دستیابی کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج دہلی ہے۔

تحسینیات

میرے والد مرحوم پروفیسر عابد صدیقی اردو ادب کے اُستاد تھے۔ اردو، عربی، فارسی، پنجابی، انگریزی اور ہندی کے شعر و نثر پر قادرانہ گرفت کے علاوہ سرائیکی اور ریاست بہاولپور کی ریاستی زبان پر بھی انہیں عالمانہ عبور حاصل تھا۔ برہا نوی زبان بھی لکھ پڑھ اور بول لیتے تھے۔ اردو کے کسی صاحبِ علم سے ملتے تو اردو شعر و نثر پر گفتگو ہو رہی ہے یا کسی جملے، ترکیب، املا پر بحث جاری ہے۔

انگریزی کے کسی اُستاد کے ہاں تشریف لے گئے ہیں تو انگریزی نثر نگاروں اور شعرا کے کلام پر بحث اور اردو ادب پر اُن کے اثرات کے حوالے دیے جا رہے ہیں۔ عربی فارسی جاننے والوں کے ساتھ الفاظ کی تشکیلات پر مفصل اور بلیغ تقاریر فرما رہے ہیں۔ پنجابی شعر و ادب پر پنجابی کے مادری زبان ہونے کی بنا پر صاحب زبان کا زعم نہیں بلکہ علمی اور ادبی تناظر میں خاص علاقہ رویہ رکھتے ہیں۔ لفظ کے استعمال میں احتیاط اور تحقیق اُن کے مزاج کا حصہ تھی۔ کچھ الفاظ کے املا کے سلسلے میں اُن کی اپنی رائے تھی اور مشرقی بالخصوص اردو زبان کے مزاج و منہاج سے گہری واقفیت، الفاظ کے بین اللسانی تعلق اور ماخذ کے بھرپور علم اور زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کا حق بھی رکھتے تھے۔ اب رہی بات املا کی تو ہم جان کے گزشتہ تقریباً چالیس سال میں ہاتھ سے لکھے اور قلم بند شدہ مضامین میں کئی الفاظ کا املا مختلف نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان میں جمود نہیں ہوتا اور ایک آدمی اپنے موجودہ علم میں اضافے کی بنیاد پر لفظ کی ایک وضع کو ترک کر کے دوسری وضع کو اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس کام میں انتہائی احتیاط کے باوجود مجھے اس اعتراف میں باک نہیں ہے کہ میں نے اپنی علمی بے بضاعتی یا ناسمجھی کے باعث ٹھوکریں کھائی ہوں اور نادان دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے اہلِ علم کے لئے تضحیکِ طبع کا سامان کر دیا ہو۔ اس لئے اگر کہیں ایسا ہو جائے تو ان ٹھوکروں کے لئے مجرم مجھے گردانا جائے اور ہو سکے تو درگزر بھی کیا جائے۔..... حافظ صفوان محمد چوہان

مبصر کی بساط آرائی سے کہیں بہتر اُس عمل میں شرکت ہے جس سے مصنف، مرتب، محقق کا بار تربیت کار گزرتا ہے۔ حافظ صفوان محمد چوہان نے "معروض" کے عنوان کے تحت احساسات و تاثرات میں جو کچھ بیان فرمایا اُس کی تلخیص اوپر کی سطور میں آپ کی نذر کر کے ہم نے فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ فرض ابھی پوری طرح ادا ہوا نہیں ہے اُس وقت تک ہو بھی نہیں سکتا جب تک ہم آپ کو پروفیسر عابد صدیقی صاحب کی اُن قلمی کاوشات کی نسبت باخبر نہیں کرتے جو پروفیسر صاحب کی زندگی کا حاصل اور عرق ریزی کے امین ہیں۔ (۱) حمد و نعت کیا ہے (۲) غزل، علامتیں اور مرزا غالب (۳) دورِ قدیم میں رنگِ جدید (مرزا اسد اللہ خان غالب) (۴) شعر اور اصولِ انتقاد (۵) اقبال کا تصورِ ملت (۶) اسلامی ثقافت، اردو شاعری اور اقبال (۷) آزاد نظم کی غنائیت (۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رجز یہ کلمات (۹) اقبال کے فن کا پس منظر اور اُس کا تصورِ فن (۱۰) عزیز احمد کا تصورِ فن (۱۱) مہر صاحب (۱۲) اقبال اور تصورِ پاکستان (۱۳) انوار انجم کی نظم (۱۴) مسلم تشخص اور ہماری ملی شاعری (۱۵) عبدالعزیز خالد کی شاعری (۱۶) ہماری کلاسیکی موسیقی کی ثقافتی اہمیت (۱۷) محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری (۱۸) اردو کی ترقی میں بہاولپور کی ادبی انجمنوں کا کردار (۱۹) سرسید احمد خان اور رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند (۲۰) دو غزل (۲۱) جابر صاحب کی باتیں (۲۲) شاعری کا کارٹون۔ عنوانات اور فاضل مصنف کی بابت معلومات کی روشنی میں کتاب کی دستیابی سے باخبری بھی نہایت ضروری ہے۔ صفحات ایک سو باون قیمت ایک سو پچاس روپے ناشر بزمِ پاکستان اردو اکادمی جعفریہ کالونی غلہ بخش روڈ ملتان۔

پاکستان سے انگلستان تک

انگلینڈ، ویلز، سکاٹ لینڈ، شمالی آئرلینڈ اور مختلف جزائر پر مشتمل علاقے کا نام برطانیہ عظمیٰ ہے۔ یہ ملک براعظم یورپ کے آخری کنارے پر رود بار انگلستان کے بیچ بہت سے جزائر پر واقع ہے۔ شروع میں انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ دو الگ الگ ملک ہوا کرتے تھے لیکن ۱۷۰۷ء میں دونوں کا آپس میں ادغام ہونے سے یہ ملک یونائیٹڈ کنگڈم آف گریٹ برٹین کہلانے لگا۔ ادغام سے قبل ۱۶۱۳ء سے ان دونوں ملکوں کا بادشاہ بھی ایک تھا۔ چونکہ ملک کے چاروں طرف سمندر ہے اس لئے دوسرے ملکوں کو جانے کے لئے لوگوں کو ہوائی یا بحری سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ کی موجودہ آبادی 57,092,000 اور رقبہ 94,248 مربع میل پر مشتمل ہے......

برطانیہ کی تاریخ کافی دلچسپ اور پرانی ہے۔ اس ملک پر طویل عرصہ تک رومی حکومت کرتے رہے ہیں۔ ملک کا نام برطانیہ (Britannia) رومیوں کا عطا کردہ ہے۔ برطانیہ سلطنتِ روم کا ایک صوبہ تھا۔ ۴۲۷ء میں رومیوں نے برطانیہ کو آزادی دے دی......

برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کے محل میں بہت سے ایشیائی ملازم تھے۔ جن میں سے محمد بخش اور عبدالکریم کے بڑے چرچے ہوئے۔ یہ دونوں ۲۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو ملکہ عالیہ کی گولڈن جوبلی کی تقریب کے موقع پر بھرتی کر کے سکاٹ لینڈ میں واقع شاہی رہائش بالمورل (Balmoral) میں تعینات کئے گئے۔ یہ دونوں نوجوان ملکہ عالیہ کے ذاتی خدمت گار تھے جو ہر وقت ملکہ کے قریب رہتے۔ ملکہ وکٹوریہ نے ان کو انگریزی سکھانے کے لئے ایک اُستاد کا بندوبست کیا تھا......

منشی محمد سعید ۱۷۷۷ء میں انگلستان آئے۔ وہ یہاں اردو، فارسی اور عربی پڑھاتے رہے۔ تنخواہ کم ہونے کے باعث منشی محمد سعید نے ٹیوشن پڑھانے کا پروگرام بنایا اور 5 نومبر 1777ء کے ڈیلی ایڈورٹائزر میں اشتہار دیا کہ اردو، فارسی اور عربی سیکھنے کے خواہش مند ان سے رابطہ کریں......

پاکستانی سیاحوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو برطانیہ سیاحت کے لئے

انہیں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے آتی ہے۔ ایک طرح سے یہ لوگ اپنے دوسرے گھر میں آتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں انگلش طرز کی سیاحت ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ جو بھی سیر کی غرض سے آتا اس کے آنے جانے کا کرایہ ولایت والے رشتہ دار ادا کرتے اور بے شمار قسم کی دعوتوں کے بعد تحفے تحائف دے کر رخصت کرتے......

ہم جسے دل دے سکیں اس پر جان بھی وار دے سکیں لیکن جب دل بھر جائے گا تو دل و جان واپس لے کر اس زور سے لات مارے گی کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

آغازِ عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

کے مصداق جناب یعقوب فلائی کی کتاب "پاکستان سے انگلستان تک" اس قدر روانی، سلاست اور دلچسپی کی حامل ہے کہ اس کے پہلے دوسرے ایڈیشن ہاٹ کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک چکے ہیں۔ حال ہی میں "پاکستان سے انگلستان تک" کا تیسرا ایڈیشن نگارشات پبلی کیشنز 38 مین اردو بازار لاہور سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ایڈیشن بھی دلچسپ معلومات اور منفرد اندازِ بیان کے باعث اسی ذوق و شوق سے فروخت ہو رہا ہے جس ذوق شوق سے پہلے دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ آپ محروم نہیں رہنا چاہتے تو اولین فرصت میں درج بالا پتے پر رابطہ کر کے اپنے حصے کی کاپی بک کرا لیجئے جس کی قیمت چار صد روپے پاکستانی مقرر کی گئی ہے۔

تعبیرِ ہنر

میری آنکھوں میں جو ٹھہرا ہے وہ دریا تو ہے
میرے دل سے جو اُبلا ہے وہ چشمہ تو ہے

دن رات رہتا ہوں میں سرشار صہبائے کرم
اللہ اللہ ساقیٔ کوثر کا جائے کرم

ہمیں معلوم ہے ہم پر جو غیروں کے ستم ہوں گے
زیادہ سے زیادہ ہو کے بھی اپنوں سے کم ہوں گے

فروغِ سوزِ حسرت باعثِ تسکینِ جاں ہو گا
چراغِ برق سے روشن ہمارا آشیاں ہو گا

سخن زبان پہ رہے اور زباں دہن میں رہے؟
یہ دیکھنا ہے کہ اب کون اُس انجمن میں رہے

حمد، نعت، نظم اور غزلیہ کلام کی یہ چاشنی جناب ایاز صدیقی کے تازہ مجموعہ سخن "تعبیرِ ہنر" سے آپ کی نذر کئے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ احبابِ ہنر جناب ایاز صدیقی کی نسبت کس طرح کی توقعات اور حسنِ ظن قائم کئے ہوئے ہیں۔ "ایاز صدیقی کمال کی رفعتوں پر ہیں۔ اُن کی شاعری ہم سب کے لئے لائقِ تحسین بھی ہے اور لائقِ استفادہ بھی۔ اُن کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے روایت کے قابلِ قبول اجزا کو بطور حسنِ روایت اپنی شاعری میں جذب کیا اور عصری تقاضوں کے مطابق جرأتِ اظہار کی"...... ڈاکٹر عاصی کرنالی۔ "ایاز صدیقی کی غزلوں میں اثر انگیزی ہے، ترنم ہے، سادگی ہے۔ وہ سب جو ایک غزل کو منفرد بناتی ہے اور پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ تمام خوبیاں ایاز صدیقی کے کلام میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہیں۔ اس لئے میں انہیں اپنے دور کا بہترین غزل گو مانتی ہوں"...... ثریا نوباشی۔ "ایاز صدیقی شمعِ غزل کے ایسے پروانے ہیں جو غزل کے اشعار میں تاثیر اور روشنی بھرنے کے لئے چند معیارات کے قائل ہیں۔ ان کی غزل کے مطالعے سے قبل خود اُن کے متعین کردہ معیارات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے تا کہ ان کی غزل کو ان ہی کے معیارات پر جانچا اور پرکھا جا سکے۔ بقول ایاز صدیقی۔

اسلوبِ فکر، حسنِ بیاں، ندرتِ خیال
ان مشعلوں سے شعر میں آتی ہے روشنی

......عذرا شوذب

"تعبیرِ ہنر" قریب چار صد پچاس صفحات مجلد پر مشتمل ہے اور تین صد روپے کے عوض بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان پوسٹ بکس نمبر 17667 کراچی پر دستیاب ہے۔

ابھی اُمید باقی ہے

میں نے اس کتاب میں جذبات و احساسات کی رنگینیوں اور تلخیوں کے علاوہ تہذیبی، معاشرتی اور ملکی مسائل کو بھی اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ زیرِ نظر شعری مجموعے کے مطالعے کے بعد آپ کی آرا، تبصرے اور تنقید میرے لئے مشعلِ راہ ہوں گے اور میں اُن کی روشنی میں اپنی اصلاح کر سکوں گا۔ میرا نام محمد نعیم، آبائی شہر سیالکوٹ اور ڈاکٹر علامہ اقبال سے خاندانی نسبت کے باعث قدرت نے شعری نعمتوں کا کچھ حصہ میری جھولی میں بھی ڈال دیا اور میں زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و سخن کی طرف مائل ہوں مگر حضرت میر تقی میر کے اس قول کا بھی دل سے قائل ہوں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم اتنے کیے جمع تو دیوان کیا

آپ نے "ابھی اُمید باقی ہے" کے تخلیق کار جناب نسیم نازکا تعارف اور قلمی رجحان کی بابت اُن کی زبانی معلومات حاصل کیں جس کے بعد اُن کے شعری فن سے تعارف لازمی ہے۔ فیصلے کا اختیار ہمیشہ کی مانند اس بار بھی آپ کے اختیار میں ہے۔

رخصت ہوا یقین تو ابہام آ گئے
اِک پارسا کی موت پہ بدنام آ گئے

وہ آ کے آج سامنے اس شان سے گئے
ہم دیکھتے ہی دیکھتے ایمان سے گئے

ناخدا اپنی جگہ ہے اور خدا اپنی جگہ
مصلحت اپنی جگہ ہے' مدعا اپنی جگہ

جو دشت شکن تھا آ گیا وحشت طراز تک
جائے گا اب نشیب سے کیسے فراز تک

دولت میں کتنا زور ہے تم جانتے نہیں
میں نے خدا کو خرید کر رکھا ہے جیب میں

"ابھی اُمید باقی ہے" کسی بھی طرح کی قلمی سفارش و وکالت اور نمائندگی سے قطعی پاک ہے یعنی ہمارا اپنا تعارف آپ ہے کے مصداق جناب نسیم نازکا شعری وصف ہی اُن کا تعارف اور شناخت ہے جسے جانچنے اور پرکھنے کی جستجو کے حامل احباب کے لئے "ابھی اُمید باقی ہے" کی قیمت اور دستیابی کا پتہ درج کیا جا رہا ہے۔ دنیائے ادب' ریگل چوک' صدر کراچی پر یہ کتاب مبلغ ایک صد پچاس روپے میں دستیاب ہے۔

مخزن 6

کچھ حقیقتیں اس قدر ٹھوس' واضح اور نمایاں ہوا کرتی ہیں جن سے آنکھیں چار کئے بنا چارہ نہیں ہوتا۔ ایسی ہی ایک صدق اور مدلل حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب و شاعری میں جس قدر بھی ہلچل و حرارت دستیاب ہے اس کا بڑا حصہ مستند یا مقیم اہل علم' اہل ادب اور اہل قلم کو جاتا ہے۔ دیارِ غیر میں بسنے والے عاشقانِ اردو کی خدمات سے اس زبان اور ادب کو جس قدر پھلنے پھولنے اور عالمی زبانوں کے مقابل شناخت پیدا کرنے کے مواقع ملے ہیں شاید تیسری دنیا کی کسی زبان کو اس طرح کے مواقع میسر نہ ہوں۔ اردو زبان کے مستند پارسا عاشقان کی فہرست اس قدر طویل ہوتا جا رہا ہے کہ اُس کا احاطہ ایک وقت' ایک تحریر یا ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ جناب مقصود الٰہی شیخ نامور افسانہ نگار اور اردو زبان و ادب کے قابل اعتبار محافظ و نگہبان اور شناور ادب ہی نہیں بلکہ مشق مدیر اور مشاق ناشر بھی ہیں۔ ایک مدت تک آپ کی ادارت میں نکلنے والا ادبی جریدہ "راوی" بریڈ فورڈ برطانیہ کے پلیٹ فارم سے اہل قلم کی خدمت میں سرگرداں رہا ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے جناب مقصود الٰہی شیخ "مخزن" کے نام سے سہ ماہی جریدہ شائع کر رہے ہیں۔ جریدہ کیا ہے اردو ادب سے لبریز ایک ایسی دستاویز ہے جس میں تمام طرح کے دستیاب نگینے ہوئے تا کہ جناب مقصود الٰہی شیخ نے اس حوالے کی سند عطا کر دی ہے۔ "مخزن 6" کی اس خصوصی اشاعت میں شیخ صاحب نے برطانیہ میں مقیم نامور افسانہ نگاروں کی نگارشات' اُن کے اپنے قلم سے تعارف اور "مخزن" میں شامل ہر افسانے کی بابت ایک اور افسانہ نگار کی رائے' تبصرہ اور تنقید کی شکل میں شائع کر کے نئی طرز کی بنیاد رکھی ہے۔ "مخزن 6" کی خاص اشاعت قریب پانچ صد صفحات کو محیط ہے جس میں افسانوی تخلیقات کے علاوہ حمد' نعت' مضامین' تراجم' اردو شاعری' مکالمہ' عمرانیات' مراسلات' یادنگاری اور یورپ میں اردو سوچ کے حوالے سے بے پناہ علمی' ادبی' تحقیقی مواد شامل ہے۔ عالمی شناخت کے حامل چند اہل قلم کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی' ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط' آغا محمد سعید' ڈاکٹر امجد پرویز' نصیر احمد ناصر' بانو ارشد' ڈاکٹر فوزیہ سعید' ڈاکٹر مولا بخش' پروفیسر حامد سروش' ڈاکٹر محمود الرحمٰن' عطیہ خان' ڈاکٹر عمران مشتاق' قیصر تمکین' نشا یاذ غیر جہاں' ڈاکٹر نسیم اختر' ڈاکٹر احمد بختیار اشرف' ڈاکٹر خاقان قیوم' مسعود اختر شیخ' اکبر حیدری' حسین شبیر علوی' پروفیسر آفاق صدیقی' ڈاکٹر انعام الحق جاوید' پروفیسر ریاض نقوی' حمایت علی شاعر' ڈاکٹر معصوم شرقی' ساحر شیوی' مصطفیٰ کریم' ڈاکٹر نذر عظیم' ڈاکٹر عطار خورشید' پروفیسر حامد کاشمیری' ڈاکٹر علی کمیل قزلباش اور جاوید دانش وغیرہم۔

"مخزن 6" پر قیمت درج نہ ہے البتہ رابطے کے لئے مکان 4' گلی 39' G-6/2 اسلام آباد (پاکستان) اور 24, Park Hill Drive, Brad Ford BD8 ODF (UK) درج ہے۔

سخنِ ماہتاب

ستیہ پال آنند

ایک ہی موضوع پر دو نظمیں

آیکارس ثانی

عمر کی منزل آج قریں ہے، تو شانوں پر
بال و پر بھی اُگ آئے ہیں
میں اک عمر رسیدہ راہب
دانائی کی کھوج میں اپنی عمر گنوا کر
اپنا صحت مند، توانا جسم منا کر
خون جلا کر
عقل و دانش کے بال و پر
اُگ آنے پر کتنا خوش ہوں!

سورج بھی کچھ دور نہیں ہے
ایک جست میں اُڑ کر پہنچوں
لیکن عمر رسیدہ اعضا
خستہ بال و پر یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں
اُڑ پاؤ گے؟
وقت تمہیں کیا مہلت دے گا؟

ICARUS، یونان کے قدیم کا ہیرو، جو اپنے باپ Daedalus کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں پر اڑتے ہوئے سورج کے بہت قریب پہنچنے پر اپنے بال و پر کے جل جانے کے بعد زمین پر گر کر مر گیا۔ علامت کی سطح پر اس آخری اڑان کو "گیان کی کھوج" کا آخری مرحلہ تسلیم کیا گیا ہے، جس میں شاذ و نادر ہی کوئی شخص کامیاب ہوتا ہے۔

(س پ آ)

گھر سے گھر تک راستہ

باغ تھا رستے میں میرے
پھول، پودے، جھاڑیاں تھیں
کیاریاں تھیں
اور ان کے پاس ستانے کی خاطر
بنچ بھی تھے
زرد رو چہروں میں پیری کو سموئے
عورتیں تھیں
ساتھ ان کے مرد بھی تھے
گھاس پر بچے 'چھوا چھوٗ' کھیلتے تھے
دھوپ تھی ہلکی سہانی
اور سورج
ماندگی سے سست
اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا
اپنی لاٹھی ٹیکتا میں پاس سے گذرا تو سوچا
بیٹھ جاؤں؟
بنچ اک خالی پڑا ہے
گومگو میں "ہاں نہیں" میں
دائیں بائیں دیکھ کر خود سے یہ کہتا ہوں میں آخر
"چلتا جاؤں
گھر سے گھر تک راستہ......
اب کچھ قدم ہی رہ گیا ہے!!"

دو پنجابی غزلاں

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

چلدے پھردے جوگی رمدے، بدل، سورج، دھپ تے وا[1]
کسے وی در تے کدی نہ رکدے، بدل، سورج، دھپ تے وا

ٹکّی میٹیٔ دن بھر کھیڈے ہسدے ہسدے بچیاں وانگ
رات دے دیوے نے بھو کے رکھے، بدل، سورج، دھپ تے وا

سون مہینے پائی مٹیاراں نے تیجاں[2] دی اک پینگھ ..... '
نال گبروآں کوڈی کھیڈے، بدل، سورج، دھپ تے وا

تیرے جان تو پچھوں سجنا، دل دا موسم بدل گیا .... '
اس گلشن دا رستہ بھلّے، بدل، سورج، دھپ تے وا

میرے گھر دے آلے دوالے مسیا[3] دی اک کالی رات
تیرے گھر دے اگے پچھے، بدل، سورج، دھپ تے وا

غزلاں دے چینڈے توں پہلوں کجھ سامان ضروری سی
میں اپنی گٹھڑی وچ بدھے، بدل، سورج، دھپ تے وا

شام پئی تاں یار آنند نے غزلاں دی بوتل کھولی .... '
اک اک شعر چ گھول کے پیتے، بدل، سورج، دھپ تے وا

رات دے ساگر ڈردے تارے، شام دی کھاڑی ڈبدا سورج
جمن مرن دا فرق اے کی؟ اوہ راز دنوں دن لبھدا سورج

دوری دی اس ٹھنڈی رت وچ برف چ جمیاں راتاں کتیاں
شاید میرے شہر وی نکلے، تیرے شہر چ چڑھدا سورج

رات دے تیجے پہر کسے نے چھیڑ دتی بلھے دی کافی ....
ہر پل رکدی نبض اے میری، ہر ساہ ڈبدا دل دا سورج

کس ڈاچی نوں لبھس ٹریاں عشق دے مارو تھل دیاں پیڑاں
پیراں تھلے بلدا ریتا، تے سر اتے بھکھدا سورج

جس اپنے گھر مسیا[3] بیجی، اس دے گھر وچ جمے ہیرے
چانن بیج بیا جس ویہڑے، اس ویہڑے وچ اگدا سورج

اس پچھلی بھلدی دنیا نوں، کیہڑے خدا دی نظر لگ گئی؟
تھلے بھٹ بھٹ رڑدی دھرتی، اتے کھو کھو ہسدا سورج!

ہوری لوک نے جنھاں نے پھڑیاں چڑھدے سورج دیاں لگاماں
ساڈے لئی تاں یار آنند جی، ہر ذرہ اے چڑھدا سورج

[1] "وا" ہوا کا مخفف۔ شمالی شرقی پنجاب میں "وا" بولا جاتا ہے۔

[2] "تیج" کا ہندو تیوہار جب لڑکیاں بالیاں جھولا جھولتی ہیں۔

[3] "مسیا" اماوس کی اندھیری رات

میلاد سے مرثیہ تک

(طرحی غزل)

''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا''

صفوت علی صفوت

وہ بن بُلائے گھر پہ خداداد آ گیا
کہتے ہیں سُن کے محفلِ میلاد آ گیا

اِس خوب صورتی سے پڑھی اُس نے حمد و نعت
ہر شعر پہ مکرر و ارشاد آ گیا

پوچھا یہ ہم نے اُن سے کہ کرے گا ساتھ حج
کہنے لگا کہ ماہ کیا ذیقعد آ گیا

پوچھا ثبوتِ عشق میں لاؤں میں جوئے شیر
شیریں دہن پہ اُس کے بھی فرہاد آ گیا

میلاد ختم ہو گیا اس گفتگو کے ساتھ
وقتِ فراق لمحۂ ناشاد آ گیا

ہم نیم خواب شب کی سیاہی میں کھو گئے
کیا دیکھتے ہیں شہر اک آباد آ گیا

سب منتظر ہیں آمدِ عیسیٰ کو شہر میں
پر جانے کیا ہُوا کہ یہ بُش زاد آ گیا

پھر عرش کو رواں تھے کفن پوش قافلے
بولا تھا کوئی مقتلِ بغداد آ گیا

گاڑی رُکی تھی چند ہی لمحوں کو خون میں
اپنی ارم کو چھوڑ کے شداد آ گیا

کہنے لگا کہ کرتا میں دارورسن کی بات
گردن سے ٹوٹتا ہُوا سر یاد آ گیا

سیل cell فون بھی گواہ مقرر ہوں حشر میں
حجت نہیں لئے ہوئے فریاد آ گیا

اک مرد نے کہا تھا یہ قاتل کے رُوبرو
رکھ کر میں اپنی قبر کی بُنیاد آ گیا

طوقِ غلامیت ہے یہ امریکیوں کی فوج
زندانِ جسم توڑ کے آزاد آ گیا

مُیت پہ ناچتے ہوئے نغمہ سرا تھے زاغ
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

میزان کب کا لگ چکا دشتِ عراق میں
میں اپنے حشر کی لئے روداد آ گیا

میلاد سے جُڑا ہے پسِ ذہن مرثیہ
کیا یاد آ رہا تھا کہ کیا یاد آ گیا

غلمانِ شمع لائے ہیں اے صفوتؔ خیال
حوریں یہ کہہ رہی ہیں کہ اُستاد آ گیا

O

رس رابطے

مجوزہ ترتیب و تدوین

اعجاز کھوکھر

عزیز محترم گلزار جاوید صاحب تسلیمات

آپ نے جس طرح مشرق کی انسانی و اخلاقی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے بے مثال علالت پر دراز بے غیض شخص کے لئے "چار سُو" کی انجمن آراستہ کی ہے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ افسوس فقط اتنا ہے کہ میں اس مہم جوئی میں آپ کا اس طرح سے ساتھ نہ نبھا سکا جس طرح میرا فرض بنتا تھا مگر دل کو یہ اطمینان ضرور ہے کہ ہمارے بعد اردو زبان اور اردو ادب اس قدر مفلس و قلاش ہرگز نہ ہوں گے جس قدر اندیشے اس حوالے سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے خصوصاً احباب لاہور نے جہاں ٹیلیفون اور خطوط کے ذریعے چار سُو کی اس خاص اشاعت کو سراہا ہے وہیں اس شمارے میں ناچیز سے کئے گئے آپ کے مکالمے کی نسبت چند تاریخی اغلاط اور امکانات نا زہ کے عنوان سے شامل کئے گئے مختصر کلام میں بحر و اوزان کے سقم کی جانب توجہ بھی دلائی ہے میرے خیال میں کچھ دخل اس میں آپ کے عجلتی سفر لاہور کے باعث اور کچھ میری شکستہ تحریر کے باعث در آیا ہے مگر بہ اعتبار مجموعی زیر بحث شمارہ ہر لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے ایک تاثر آپ کے مکالمے سے یہ بھی نمایاں ہوتا ہے جیسے علمی اور ادبی ادارے میری جانب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں نہیں ہو رہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دامے درمے سخنے وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو ہونا چاہیے۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)

گرامی قدر جناب گلزار جاوید صاحب!

کل شام چار سُو اپنی روایتی نرالی شان یعنی کسی نہ کسی اہل قلم پر قرطاس ابیض کے ساتھ ملا لیکن ایک روز پہلے ہی جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا فون آیا جس میں موصوف نے بڑے پیار اور محبت سے مجھے یاد بھی فرمایا اور شکوہ بھی کیا کہ جلدی ملو بہت دنوں سے تمہاری صورت نہیں دیکھی۔ اور پھر فرمایا کہ آج کل بہت شاعری کر رہا ہوں.... چلئے ابھی ڈاکٹر موصوف کی ان باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ "چار سُو" مل گیا اور اس میں ڈاکٹر صاحب بھی دستیاب ہو گئے۔

آپ جو اس طرح اہل قلم کے بارے میں "چار سُو" کے خاص نمبر نکال رہے ہیں پاکستان کی ہر لائبریری کو چاہیے کہ "چار سُو" باقاعدگی کے ساتھ منگوائے اور پھر اسے محفوظ بھی رکھے۔ اگر پاکستان میں پچیس ہزار لائبریریاں ہیں تو پھر آپ کو چار سُو پچیس ہزار کم از کم چھاپنا پڑے گا۔

آپ جانتے ہیں میری غزلیات کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں اور چوتھا پانچواں بھی تیار ہیں۔ اور نظمیں ابھی خاموش پڑی ہیں میرا مطلب ہے وہ چار مجموعے نظموں کے بھی ہو جائیں گے۔ نثر بھی لکھ رہا ہوں۔ نثر کی تازہ کتابیں ایک ماہ تک چھپ کر بازار میں آجائیں گی۔ اول "قرآن پاک میں حقیقتِ انساں" اور دوم "غالب کا جمالیاتی شعور"۔

(مشکور حسین یاد)

بھائی جان آداب۔

میں جیسے تیسے بھی ممکن ہے علالت سے نباہ کر رہا ہوں۔ ریڈی ایشن تھراپی کا کورس ختم ہو چکا ہے اب ادویات اور انجکشنوں کی انگلی پکڑ کر قدم بقدم صحت (یا دم آخری) تک چل رہا ہوں۔

قریشی صاحب کے توسط سے "اخبار اردو" کا وہ شمارہ پہنچ گیا ہے جس میں میرا مضمون "اردو کی ابتدائی ڈکشنریاں" شامل اشاعت ہوا ہے۔ مقتدرہ کے ملک صاحب کا گرامی نامہ تو ضرور ملا تھا کہ رسالہ بھیج دیا گیا ہے لیکن آج تک نہیں پہنچا آپ کو اب تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔

نیا شمارہ توقعات سے بڑھ کر ہے ڈاکٹر وحید قریشی کا گوشہ انواع اقسام کے گل و ثمر اپنے باغیچے میں اکٹھا کیے ہوئے ہے۔ بقول وحید قریشی صاحب وقت واقعی 'ریگِ رواں' ہے مجھ سے ڈاکٹر قریشی پانچ چھ برس بڑے ہیں۔ میں نے پہلی بار انہیں ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پڑھا جب ان کی کتاب "شبلی کی حیات معاشقہ" نہ جانے کیسے میرے ہاتھ لگ گئی۔ ۱۹۷۰ء میں مرحوم گوپال متل کے ادارے سے ان کا شعری مجموعہ "نقد جاں" شائع ہوا۔ (اسی برس گوپال متل کے ہاں سے میرا شعری مجموعہ بھی شائع ہوا تھا)۔ 'ریگ رواں' کا استعارہ ہم سب پر صادق آتا ہے جو تین چوتھائی صدی تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ان کا زیر طبع مجموعہ "ڈھلتی عمر کے نوحے" شائع ہونے پر پڑھنا چاہوں گا۔ زوال عمر میرا بھی مرغوب ترین موضوع ہے۔ ان کے مجموعے کی سنگت میں بیٹھ کر ان کی شاعری کے ساتھ کچھ اپنا دکھ بھی بانٹوں گا۔ اللہ ان کو حیات خضر دے۔

"سخن معرفی" یعنی غزلیات میں محسن احسان، انور سدید، کرشن کمار طور، علیم صبا نویدی، ملک زادہ جاوید، صاحبان کا کلام ایسا ہے جسے ایک بار پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ سائی انصاری صاحب کی رباعیات حسب دستور اعلیٰ پائے کی ہیں۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ چوتھا مصرع نقارے پر چوٹ کی طرح وارد ہوتا ہے اور اپنی صدائے بازگشت چھوڑ جاتا ہے۔

میں بے حد نقاہت محسوس کر رہا ہوں اس لیے آج زیادہ لکھ نہیں پا رہا۔

(ستیہ پال آنند)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔
"چہارسُو" کا تازہ پرچہ ملا۔ آپ کا خط بھی موجود تھا۔ خطے مختصر اور "چہارسُو" سے ایک طویل ملاقات آپ کے ساتھ ہوگئی۔

اگلے روز اسلام آباد سے منصور الٰہی شیخ صاحب کا فون آیا جو ان دنوں "مخزن 6" کی اشاعت کے لیے بریڈفورڈ (لندن) سے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آپ کے انٹرویوز کی کتاب "براہِ راست" کا ذکر کیا اور اس میں اپنے بڑے بھائی منظور الٰہی شیخ صاحب کا نام دیکھ کر حیران ہوئے کہ میرا بچپن ان کے سائے میں گزرا تھا۔ ان کے وسیلے سے ظفر الٰہی سے رابطہ ہوگیا جو میرے بچپن کے دوست تھے۔ لیکن گذشتہ ساٹھ سال کے دوران ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات "چہارسُو" کا فیض ہے۔ اور میں آپ کا شکریہ تہہ دل سے کرتا ہوں کہ ایک فسانوی ملاقات کرادی۔ یہ بات برمحل تذکرہ تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ "چہارسُو" کے انٹرویوز اور ادیبوں کے گوشے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے بنیادی حوالے کا کام دے رہے ہیں۔ میں کسی مقالے میں جب "چہارسُو" کے حوالے دیکھتا ہوں تو آپ کی "خدمت" پر داد بے اختیار دل سے نکلتی ہے۔ یہاں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ دلاور فگار مرحوم پر کتاب لکھنے میں مجھے "چہارسُو" سے بہت معاونت ملی تھی۔

یہ ناچیز انور سدید آج پھر ایک ایسی ضرورت سے ہی دوچار ہے اور حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ مجھے "چہارسُو" کے دو پرچوں کی فوری ضرورت ہے۔
اول۔ مارچ ۱۹۹۲ کا شمارہ جس میں بانو قدسیہ کو "نشانِ سپاس" پیش کیا گیا ہے۔
دوم۔ نومبر دسمبر ۱۹۹۷ کا شمارہ جس میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر پر مضامین اور انٹرویو شائع کیا گیا ہے۔

یہ دونوں پرچے میری لائبریری میں محفوظ تھے لیکن پتا چلتا ہے کہ وہ طالبات جو ان پر کام کر رہی تھیں لے گئیں اور واپس نہیں کیے۔ اب آپ کو زحمت دے رہا ہوں کہ اپنے سٹاک / ریکارڈ سے مجھے عنایت فرمائیے۔ اگر ان پرچوں کی زائد کاپی نہ ہو تو اپنے فائل سے ان (بانو قدسیہ اور غلام جیلانی اصغر) کے گوشوں کی فوٹو کاپیاں عنایت کیجیے اور حسابِ دوستاں در دل پر ہرگز نہ رکھیے۔ اس کرم کے لیے میں آپ کا شکر گذار ہوں گا اور قیامت کے روز آنکھیں شہادت کھڑی کر کے داورِ محشر کے سامنے کہوں گا کہ آپ ادیبوں کے ادبی منصوبوں میں عملی طور پر شرکت کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو خصوصی انعام سے نوازا جائے گا اور ہم جنوم ادیباں میں آپ کو فخر سے دیکھیں گے۔
(انور سدید)

برادر عزیز، السلام علیکم۔
"چہارسُو" کی پیشانی پر آپ نے مجلس مشاورت اور زر سالانہ کے لیے قارئین چہارسُو اور دل مضطرب اور شگفتہ شگفتانہ بالترتیب لکھ کر دل موہ لیا ہے۔ دل تو پہلے ہی آپ نے موہ لیا تھا کہ مرحوم ضمیر جعفری کی یاد کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔ یاد آتے ہیں تو مرحوم کی بہت سی خوبیاں یاد آتی ہیں۔ کیا باکمال شخصیت تھی۔

اس بار ڈاکٹر وحید قریشی کو آپ نے قرطاس اعزاز پیش کیا ہے۔ یہ تو اس کے بہت پہلے حقدار تھے۔ آپ نے ذرا دیر کر دی لیکن خیر تفصیلی معلومات سے اس ادیب شہیر کی زندگی اور کارناموں پر تفصیلی معلومات مل گئیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے جید عالم اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے میرے دوسرے شعری مجموعہ "ناشنیدہ" پر مجھے "تنہائی کا مُغنّی" لکھا تھا۔ اور میری شاعری کے حوالے سے بڑی کارآمد باتیں کی تھیں۔ اللہ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون فلسفہ خودی کے عمرانی پہلو میں اقبال کے افکار پر نئے گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔ سخنِ آفتاب میں ڈاکٹر صابر آفاقی کی نظم پڑھ کر لطف آیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے سخن گو ہیں اور مدیر صاحب کو برجستہ جواب دیا ہے۔ غزلیں اچھی ہیں مگر ذرا انتخاب کر لیتے تو مزید اچھا ہو سکتا تھا۔ پرچہ معیاری ہے لیکن معیار کو برقرار رکھنے کے لئے تھوڑی سی بے مہری کی چھری چلانا ضروری ہے۔
(محسن احسان)

عزیز محترم!
چہارسُو کا تازہ شمارہ ملا۔ ممنون ہوں۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی سے ۶۱-۱۹۶۰ء (مدینہ) تعلق خاطر ہے۔ موصوف محترم اور برادر عزیز استاد رہے ہیں۔ تنقید و تحقیق میں دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں اور ژرف نگاہی سے تحقیق کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی پاتال کی خبر لاتے تھے اور معروضیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر بھی محض روایتی محقق نہیں تھے بلکہ دیگر عمرانی، معاشرتی اجزا کا معروضی تجزیہ کر کے نتیجہ نکالتے تھے۔ جستجو اور تحقیق کا یہ عمل مادی جدلیاتی ہے جو بیسویں صدی کے علوم برصغیر میں پھیلنے سے مذکورہ علما ہوا دانش جو اور دانشور اس سے پیش از پیش مستفید ہوئے۔ مسعود حسن ادیب کے علاوہ جنوبی ہند (حیدرآباد دکن) کے اور شمالی ہند میں دیگر محققین نے اس سے استفادہ کیا۔ بہار میں قاضی عبدالودود نے جس تحقیق کا چلن اختیار کیا اس نے تحقیق کی افادیت کو عروج کیا اور [illegible] کا مذاق پیدا کیا۔ نیاز فتح پوری نے جمالیات کی تحقیق اور احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری نے مارکسی تنقید میں (مادی جدلیاتی تجزیہ نگاری) کا راستہ ہموار کیا۔ اثر لکھنوی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے علمی اور ادبی روایات سے خیابان کی طرح جھاڑ جھنکار کر کے اقدار کے استنباط سے متاعِ گراں قدر کو ضائع ہونے کی تدبیر کی۔ تحقیق و تنقید میں یہ عمل تحقیق شناسی سے پیدا ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اسی روایت کے امین ہیں۔ نظریات میں افراط و تفریط کے تصادم سے یہ جہت پیدا نہیں ہوتی بلکہ متوازن امتزاج سے وضع ہوتی

ہے تاثراتی تحت مندرجہ سے ڈاکٹر وحید قریشی کی تخیل عبارت ہے۔

(ڈاکٹر آغا سہیل)

بے مثال گلزار جاوید خوش رہو۔

'چہارسُو' کا تازہ شمارہ بابت ماہ جنوری فروری باصرہ نواز ہوا۔ دیکھتے ہی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ سرورق پر ڈاکٹر وحید قریشی کی بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کا امتزاج بھی خوب رہا۔ یقیناً درپیش عبرت ہے جو اپنی جوانی پر نازاں ہیں۔ دیکھ کر ششدر سا رہ گیا اور ریگِ رواں کے زیرِ عنوان ہر دو نظمیں "ابھی یاد کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ مقدر بکھر جائے گا۔ ہجور کہیں قریبی گھتیاں آرزوؤں کا دھواں ازل سے ابد تک وہی داستان پڑھ کر یوں لگا جیسے کوئی نشتر آ چبھے یا پانی ہو اور کبھی عالم ہول نیا آخر رہا۔ جوہر شناسی میں آپ اپنی مثال آپ ہیں۔ شکیل ہوشیارپوری اور حافظ لدھیانوی کی شرب محبت تو ستائش سے گریز ہی اور صلے سے بے نیاز۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے متعلق خوب خاکہ پیش کیا ہے اچھا لگا۔

'چہارسُو' میں وحید قریشی کے بارے میں پڑھ کر یقین سا ہونے لگا کہ جو حافظ لدھیانوی نے کہا ہے "نظر کو روشنی دیتا ہے انداز سخن تیرا" انہی راہیں جھانا ہے ادب کی علم و فن تیرا۔" اور اسرار احمد راہروی کی غزل کا یہ شعر "ان کا ادراک رفعتوں کا امین/ اوج پر ہے شعور انسانی" بے راہ راست میں آپ نے اپنی پوری دیانتداری اور قوت سے ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے سب کچھ بہ تفصیل سپردِ قرطاس کر دیا۔ ان کا یہ شعر "یہ رات وہ ہے جس میں نوجوں غم بھی ہے جاگی دلہن کے لئے جس طرح جاوانت کی رات" کیا خوب کہا ہے مزا آ گیا۔ دراصل بعد ایک طویل مدت کے ایک ایسے شاعر کو آپ سپردِ قرطاس کر رہے ہیں جو حقیقتاً عالم فاضل ہے محض شعری نہیں کہتا۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ سو عرض ہے کہ یہ کسی کے بھی علم سے الگ نہیں کہ سیاسی لوگوں نے اُردو زبان کو پامال کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ان لوگوں کو اس سے کیا حاصل ہو رہا ہے مگر اس قدر پیاری زبان کو اُردو والوں نے بھی کم نہیں لتاڑا ہو دونوں میں اس کے ساتھ اسی طرح کا سلوک ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے بارے پڑھ کر مزید دکھ ہوا کہ ایک ایسے دانشور سے اس قسم کا سلوک عالم احباب نے روا رکھا اور وہ بھی ہر موقع پر کہ عقل نہیں سکے شرمناک ہے اپنے ملک میں ایک عالم کے ساتھ اس قسم کا سلوک ہو کر روح کانپ اُٹھے۔ غالب پر ان کا مضمون بے حد پسند آیا اور یہ کہ انہوں نے کس قدر دیانتداری سے لکھا ہے اس سے قبل اس حد تک غالب کے بارے میں اُن کے ذہن و احساس کا کسی نے نہیں لکھا۔ یقیناً وہ قابلِ تحسین ہے۔ "کمیاب کا ایک علم پرور خاندان" ڈاکٹر احمد حسین قلعہ داری کا مضمون جس میں انہوں نے شجرہ نسب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اس سے قبل اس طرح تصنیف کسی نے نہیں بیان کیا۔ ان کا مضمون اچھا لگا۔ ہر ایک مضمون جو ڈاکٹر وحید قریشی پر لکھا گیا ہے پسند آیا۔ بستی کے لوگوں تا ذہنی کا مضمون کافی دلچسپ ہے جب مجید ملک کو لاہور اُردو بورڈ کا ڈائریکٹر بنایا گیا تو منشی نے کہا "تو بھی اب تو سوچ ہو گئی اطمینان سے اُردو اوڑھ کر رہو" مجید ملک ہنسا اور بولا "منشی تو نہیں سمجھے گا تو سیاست میں کورا ہے یہ بورڈ اس لئے بنایا گیا ہے کہ اُردو کے نفاذ میں التوا پیدا کرے لوگوں کو تسلی دے کہ کام ہو رہا ہے۔ مقصد کام کرنا نہیں، تسلی دینا ہے سرکار بھی کیا شے ہے کچھ کمیٹے اس لئے بنائی ہے کہ کام ہو، کچھ کام ہوتا نظر آئے لیکن ہو نہیں۔ یہی اور ایسی ہی صورتِ حال بھارت میں بھی ہے آخر Basic character ہم لوگوں کا ایک سا ہی ہے ذرہ بھر بھی فرق نہیں ہے۔

'فلسفۂ خودی کے بعض عمرانی پہلو' علامہ اقبال پر ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون بھی پسند آیا۔

مصطفیٰ کریم کا افسانہ ایک جہاں وہ بھی ہے۔ منشا داحمد کا جہنم کرامات، مہر بانی "بخشش" اور خوبی کی "کونپلیں" باوجود طوالت کے اچھا ہے اور علیمہ تقی کا دوسرا رنگ پسند آئے۔

شمسی آفتاب کے زیرِ عنوان جواب آں غزل ڈاکٹر آغا آل عبا کی نظم کے جواب میں بہت خوب ہے "بافصو وراق" دل نواز دل کی تاثراتی نظم پسند آئی۔ ایک شاعر ماجد سرحدی کی نظم اچھے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے پسند آئی اور شاہد اقبال شاہد کی سالِ نو کی پہلی دعا اچھی لگی۔ عطار کے لفظ اچھے لگے۔ حسبِ معمول آپ کا ڈرامہ آخر میں پہنچ کر چونکا دیتا ہے شمسی ماہتاب ستیہ پال آنند کی نظمیں پسند آئیں۔ اُن کا پنجابی کلام بھی اچھا لگا۔ اس مرتبہ چہارسُو پر پورے طور سے ڈاکٹر وحید قریشی چھائے رہے۔

(یوگیندر بہل تشنہ)

محترم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

قرطاس اعزاز ڈاکٹر وحید قریشی کے نام دیکھ کر ایک بار پھر آپ کی تجسس طبیعت کا قائل ہونا پڑا۔ علم و ادب کے ایسے مشاہیر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلاش کیا اور پھر اُن کی حیات و کارناموں کی تفصیل کو وقار کے ساتھ "چہارسُو" کے گراں قدر صفحات پر اس طرح بکھرا دیا کہ علم و ادب کے ہر قاری کی تسکین ہو جائے اگر ایک طرف آپ کی یہ جو فطرت کا حصہ ہے تو دوسری طرف آپ کے اس مزاج کا بھی عکس منور ہے جس کا سرنامہ "حق بہ حق دار رسید" سے عیاں ہوتا ہے بہر صورت آپ کا یہ کار مسلسل ہر نئے شمارے کے ساتھ حجم در حجم اختیار کرتا جا رہا ہے جو یقیناً قابلِ صد تحسین ہے۔

اس مرتبہ جو ایک نئی چیز دکھائی دی وہ ہے شاعری کو دو حصوں یعنی معرّٰی اور نثری نظم میں تقسیم کر کے شائع کیا۔ مجھے نہیں معلوم آپ نے ایسا کیوں کیا۔ معرّٰی کے لغوی معنی جو کچھ بھی ہوں لیکن اصطلاحی معنوں میں اسے منضبط شاعری کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے جب آپ نے جن شاعروں کی غزلیں

اس عنوان کے تحت چھاپی ہیں کیا وہ غیر معطر ہیں اگر ایسا نہیں تو پھر یہ تقسیم بے معنی
ثابت ہو رہی ہے۔ بھائی میرے اگر سینئر اور جونیئر شعرا کو الگ الگ
خانوں میں بانٹنا ہی ٹھہرا تو پھر ”غزلیں“ اور ”پھر غزلیں“ کے عنوانات دے دیجیے
تو شاید حسین لگے۔ اب رہی بات غزلوں کے انتخاب کی تو اس حوالے سے میں
افسانہ نگار شمشاد احمد کے اس مفید مشورے (رس رابطے نومبر/دسمبر ۲۰۰۶ء) سے
متفق ہوں کہ ”حمد شاعری میں ذرا ہاتھ سخت رکھیے“ یہاں اس سلسلے میں دو ایک
مثالیں دینا مناسب ہوگا۔ علیم صبا نویدی جو خیر سے کہنہ مشق شاعر ہیں اور کئی ایک
کتابوں کے مصنف بھی اُن کی غزل کے تیسرے شعر کا دوسرا مصرع ”ہمارا اپنا
ہے نام نسب نور میں“ اور آخری شعر کا پہلا مصرع ”مرے فن کا عکس جمیل“ دونوں
خارج از بحر ہیں۔ اس کے علاوہ جناب محسن احسان کی غزل کے تیسرے شعر کا
دوسرا مصرع ”گنہگاروں سے کار خطا تو ہوتا ہے“ بحر میں ”گناہ گاروں سے
کار خطا تو ہوتا ہے“ پڑھا جا رہا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کی
اشاعت چہار سو جیسے جریدے میں کھٹکتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ایک غزل کی ردیف
”تھا ہوا ہو“ کے ذریعے آخر شاعر کون سی زبان کی تبلیغ کر رہا ہے اور یہ کس
مسلک کے قاری کے لیے ہے یہ کچھ اور تو ہو سکتی ہے شاعری کی زبان ہرگز نہیں
ہو سکتی آگے بڑھیے تو صفحہ 86 پورے کا پورا ایک شاعر کی طویل غزل سے 46
منتخب اشعار پر محیط ہے اور وہ بھی کیسے اشعار جن میں ایسی اوٹ پٹانگ لغویات پر
مبنی شاعری (اگر یہ شاعری کہلا سکتی ہے) موجود ہے۔ بس ہو چکا تماشا/دھکا بدل
رہا تھا/تختی بدل رہی تھی/تختہ بدل رہا تھا/چہرے کو دیکھ کر وہ/رنگا بدل رہا تھا۔
آخر یہ شاعر ایسی شاعری کے ذریعے اپنے قاری کو کیا ادب کو کیا دینا چاہتا ہے پھر
آپ ایسی شاعری کو ”چہار سو“ کے قیمتی صفحات کے لیے منتخب کیوں کرتے جا
رہے ہیں کیا آج کل آپ کی ڈاک میں معیاری شاعری موصول نہیں ہو رہی
ہے؟ مصطفیٰ کریم کا افسانہ جتنا مختصر ہے اتنا ہی بھرپور ہے۔ گلزار جاوید کا ڈرامہ
”عطار کے لونڈے“ بھی پسند آیا لیکن اس موضوع کو آپ مختصر افسانے میں بھی
سمیٹ سکتے تھے تو پھر ڈرامہ؟ شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ اب آپ کا قلم کسی
دوسری صنف کی جانب مڑنا چاہتا ہے اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ آپ کو مزید
صلاحیتوں سے نوازے۔ غزلیں ویسے تو بہت ساری پسند آئیں مگر جاوید شاہین
اور خیال آفاقی کی غزلیں اپنے منفرد آہنگ کے سبب دل کو چھو کر گزر رہی ہیں بالخصوص
بھائی خیال آفاقی کی غزل کا یہ شعر ”مشاطگی زلف خرد بھی ہے ضروری/آئینے
جنوں سے مگر صرف نظر کر“ ایک مکمل نظم کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

(غالب عرفان)

محبی تسلیم!

’چہار سو‘ کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ ممنون کرم ہوں۔ بزرگ ادیب،
نقاد، محقق، شاعر ڈاکٹر وحید قریشی کے نام گوشہ شائع کر کے آپ نے بڑا
مفید کام کیا ہے۔ پاکستان میں وہ ایک بہت بڑی اور رنگا رنگ شخصیت کے مالک
ایک نامور ادیب ہیں۔ مشفق خواجہ مرحوم کے خطوط میں متعدد بار ڈاکٹر وحید
قریشی کا ذکر پورے ادب و احترام کے ساتھ ملتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اردو
برادری ان کے نام اور کام سے خوب واقف ہے۔ ”خوفزدہ غالب اور عصری
صورت حال“ ان کا بڑی سوچ بچار سے لکھا گیا ایک اچھا مضمون ہے تاہم ان
کے نتائج سے اختلاف کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ مرزا غالب کی نفسیات
میں خوف کا عنصر شامل نہیں تھا بلکہ خاندانی امارت اور رئیسانہ شان بنائے رکھنے
کے لئے دولت کے وسائل کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور غیر اخلاقی سطح
تک جانے سے بھی ان کو گریز نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ۱۲ روپے آٹھ آنے
ماہوار کی خاندانی پنشن ہی ایک متوسط خاندان کے خرچ کے لیے ضرورت سے
زیادہ تھی لیکن امیرانہ ٹھاٹ باٹھ کے لئے بہر حال بہت کم تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی
کے بارے میں ممتاز مفتی (مرحوم) کا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ ان کے اس
تجربے کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے کہ ”سرکار ذہنی کیا شے ہے کچھ محکمے اس
لئے بنائی ہے کہ کام ہو اور کچھ اس لئے کہ کام ہوتا نظر آئے لیکن ہو نہیں۔ کچھ
اہلکاروں کو چھوٹے گریڈ دے کر ہاتھ میں ہتھکڑا دیتی ہے کچھ لوگوں کو صدر
نشین بنا کر ہاتھ میں جھنجھنا تھما دیتی ہے۔“ (ص ۲۵)

ہمارے ملک میں بھی بالکل یہی صورت حال ہے بڑی بڑی
لبھاؤنی سکیمیں جنتا کو خوش کرنے کے لیے بنتی ہیں۔ میڈیا کے ذریعے ان کا
خوب پرچار ہوتا ہے لیکن اصل میں ہوتا کچھ نہیں۔ صرف دکھائی پڑتا ہے کہ کچھ ہو
رہا ہے۔ بہر حال یہ سب سیاسی گول مال ہے۔ ہم جیسے لوگ شاید ہی اس صورت
حال کو بدلنے میں کچھ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

آپ کا تحریر کردہ ڈرامہ ”عطار کے لونڈے“ نام کی کشش کی وجہ
سے میں نے پورا پڑھا لیکن آخر میں اپنی کم فہمی کا اعتراف کرنا پڑا کیونکہ اس کا
آخری حصہ میرے بالکل پلے نہیں پڑا۔

(نامی انصاری)

گلزار جاوید صاحب۔ سلام مسنون

چہار سو پہلی مرتبہ اطمینان و سکون سے دیکھا اور پچھتایا کہ شروع
دن سے اس کی خوشہ چینی کیوں نہ کر سکا۔ آپ کی کہانی ”شہر چنگ“ میں جن
گلیوں کا تذکرہ ہے ان سے وابستہ یادوں کے سہارے وہاں وہاں گھوم پھر آیا پر
باوجود خواہش کے جا نہیں سکا۔ ”شہر چنگ“ آپ نے لکھ کر اس ادب کو مالا مال
کیا ہے جو تقسیم سے متعلق مگر انسان دوستی کا چارٹر ہے۔ ”براہ راست“ میں ہر
انٹرویو آپ کی ذہانت اور متانت اور مدیرانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
ڈاکٹر انور سدید سے مکالمہ نے مجھے یوں حیران کیا کہ آپ کے گوش گزار تقریباً
اپنا پورا تجربہ کر دیا اور جب اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا تو وہ اپنے مہربان اور

کرمغرما کے بیٹے کا فون نمبر لے کر (تاباں) اس سے رابطہ کر چکے ہیں۔
میرے اس خط میں ان دنوں کا ذکر ہوگا در اصل ان دنوں میں حالت انتظار میں ہوں ملول ہوں کہ وطن میں پردیسی اور پردیسیوں کو لوٹنے کی وہی پرانی کہانیاں نئے چوکھٹوں میں پڑھ رہا ہوں۔ لیکن آپ کی عطا فہمائش سے جتنا کچھ "پڑھا" اس سے ذہنی تسلی اور روحانی سکون پایا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

ماشا اللہ... چند دنوں تک مجرن 16 آپ کو بھیج کر نئے وطن جواب اصل وطن کی طرح پیارا لگنے لگا ہے کہ وہاں جوڑ کے ہیں تو لے لو کر دے ہیں مگر پرانے وطن کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے بڑے بڑے دکھوں سے بچے لگتے ہیں اب تو نہ خواہش ہے نہ کسی سے درخواست ہی کروں گا کہ مجرن پر تبصرہ کر کے میری کتابوں پر بھی کچھ لکھا ہو لیے گا۔

(مقصود الٰہی شیخ)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب۔
پرچہ اس بار دیر سے شائع ہوا پھر اس سے پہلا پرچہ مجھے نہیں ملا اس بار استاد گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا گوشہ چھاپ کر آپ نے بڑی خوش کر دیا۔ گوشہ بہت بھرپور ہے اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی محنت سے بسر کی اور علم و فضل کے بڑے مقام پر فائز ہوئے۔ مقتدرہ قومی زبان میں بھی ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ انہوں نے تین وزارتوں میں اردو کو دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کے متعلق وزراء سے اعلان کروائے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کو اپنی کنٹریکٹ ملازمت پر ترجیح دی اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آپ لائق مبارکباد ہیں کہ آپ نے ان کا گوشہ شائع کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

(اکبر حمیدی)

عزیزم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔
اس دفعہ محسوس ہوا کہ رسالہ بہت جلد مل گیا۔ احساس بھی تو اضافی چیز ہے۔ تقریباً تمام حصہ پڑھ لیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے غالباً ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے مجھے پہچانا تھا یا نہیں مگر بہت اچھی طرح ملے تھے۔ جو اردو کے بڑے ادیبوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ ان کے حالات زندگی میں مجھے اپنے والد کی زندگی کا عکس نظر آیا۔ ان کے بارے میں فردوسیہ کا مضمون مختصر اور بہت اچھا تعارف ہے۔ سجاد باقر رضوی نے بھی ان کی شخصیت کی پیاری خصوصیت کی طرف توجہ دلائی۔ حضرات نے ان کی شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ شکریہ اتنی بہت سی معلومات کا۔ افسانوں میں ضرور کچھ کہنا چاہوں گی۔ مصطفیٰ کریم کا افسانہ بہت اہم موضوع پر لکھا گیا ہے تاہم مجھے اس میں ایک کمی محسوس ہوئی۔ کنکشن نہیں ہے اور انجام قنوطیت سے بھرپور ہے

رات کی سحر ہوتی ہے نہیں بیداری کو ٹالنا چاہیے ہیرون کا انجام اداسی پر ہوتا ہے یقین کی نفی کے بعد اثبات نہ ہو تو زندگی کا حوصلہ کہاں سے آئے گا لکھنے والے کا یہ فرض ہے کہ مثبت قدروں کو عام کرے صرف بیہودہ دکھا دو تو نہیں ہوتا۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت یزید کی جیت نہیں تھی۔ یزید کبھی جیتا نہیں کرتے بلکہ ان اصولوں کی جیت تھی جس کے لئے آپؓ نے قربانی دی وہ زندہ ہی رہے گا۔ اگرچہ آج مسلمانوں کی تمام قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ کافر وہ نہیں جو غیر مسلم ہو کافر وہ ہے جو ہر قدر کا منکر ہو۔ افسوس ہے شمشاد احمد کا جہنم بھی منفی قدروں پر مبنی افسانہ ہے۔ دکھانا یہ چاہیے تھا کہ قدریں اگر کمزور ہوتا مقابلے کے لئے اور وہ کرنا جو صحیح ہے۔ کلدا احمد شرما کا افسانہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کے ساتھ اچھی قدریں بھی ترقی پا رہی ہیں مجھے ان کا افسانہ پسند آیا۔ ہیئت اور تکنیک میں کوئی افسانہ بھی کمزور نہیں مگر ..... عابدہ تقی کا افسانہ شروع سے انجام تک فنی حیثیت سے کامیاب ہے۔ نظم اور غزل کا حصہ ابھی پڑھا نہیں آپ کا ڈرامہ بھی دلچسپ محسوس ہوا۔

(حمیدہ معین رضوی)

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب! آداب۔
اس بار آپ کے وقیع جریدہ کے توسط سے وحید قریشی صاحب سے مکمل کر ملاقات ہو گئی۔ ان پر لکھے گئے کئی مضامین اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ بقیہ نثری و شعری حصے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ آپ بڑی دقت نظر اور سلیقے سے رسالہ کو ترتیب دیتے ہیں۔ اس سے آپ کی بے پناہ مدیرانہ صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کا تحریر کردہ ڈرامہ 'عطار کے لونڈے' بھی بہت جاندار ہے۔

(کاوش پرتاپگڑھی)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔
"چہارسُو" برابر موصول ہو رہا ہے اس مرتبہ آپ نے ڈاکٹر وحید قریشی پر بڑا بھرپور اور جاندار گوشہ شائع کر کے اردو ادب کا وہ قرض ادا کیا ہے جو اس پر عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک سیلف میڈ انسان اور خاموش ادبی کارکن ہیں جو "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کے مصداق ایک طویل عرصے سے زبان و بیان اور علم و ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں اور پھر یہ پڑھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنا پورا کتب خانہ پینتیس ہزار کتب پر مشتمل رفاہ عامہ کے لئے وقف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں طویل زندگی دے۔ بقول حالی۔
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

(سرور انبالوی)

جناب گلزار صاحب، آداب!
اس بار قرطاس اعزاز 'کم فاصلی' بہت ہی پسند آیا۔ "آئینہ خانہ

ہے دیر"، "کوئی ترمیم نہیں"، "زندگی کی کشتی"، "دیواروں کے بیچ" اور "روح روشن" نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی اور معیاری ہیں۔ مضامین کی selection آپ کی ادبی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ "براہ راست" کے سوال جواب دلچسپ ہیں پڑھ کر مزا آیا۔ کچھ ذاتی زندگی کے بارے میں سوال کرتے تو ادبا فاضلین کے بارے اور زیادہ معلومات حاصل ہو جاتیں۔ شعری حصہ کچھ کم لگا۔ تشنگی رہ گئی۔

افسانوں میں "چکر"، "کہیں داغ نہ لگ جائے" اور "تقدیس کا وہم" بے حد پسند آئے۔ شعری حصہ متاثر کن اور قابل داد ہے۔ اُمید کرتی ہوں اس طرح معیاری اور دلکش "چہار سُو" ہمیں پڑھنے کو ملتا رہے گا۔

(ڈاکٹر رینو بہل)

عزیزی گلزار جاوید! السلام علیکم۔

چہار سُو کا تازہ شمارہ حسبِ قدر خاص موصول ہوا۔ لگتا ہے آپ اپنے نام کے ساتھ ادب کا لاحقہ لگا کر گلزارِ ادب کے رنگ و بو میں خوب سے خوب تر اضافہ کرنے کی ٹھان چکے ہیں۔ ہر شمارہ ایک نئی بہار دکھاتا ہے، نہ جانے یہ رنگینیاں برقرار رہیں۔ قرطاس اعزاز کی روایت میں اس بار محترم وحید قریشی صاحب کو آپ نے روشناس کیا ہے۔ بہت ہی صحیح انتخاب کیا ہے۔ وہ تمام معاصر زندگی جو ایک بھاری بھرکم شخصیت کے خدوخال کو نمایاں کرتے ہیں، صاحبِ قرطاس میں بہ وجہ اتم موجود ہیں۔ موصوف نے جس محنت، لگن اور انہماک کے ساتھ صحرائے ادب کو عبور کیا اور اس منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو اس بات کے جائز حقدار ہیں کہ ان کو اسی طرح کا سپاس پیش کیا جائے۔ بلاشبہ قریشی صاحب ہمہ جہت ادیب کے شاعر ہیں اور آپ؟ جی ہاں گلزار میاں آپ بھی کچھ کم نہیں! منزل بہ منزل جھنڈے گاڑتے جاتے ہیں۔ قرطاس اعزاز کے عنوان سے کیسے کیسے چاند سورج سجا دیے ہیں آپ نے۔ لگتا ہے زمین آسمان سے بازی لے جائے گی۔ یقیناً چہار سُو کے قرطاس اعزاز کی کہکشاں، کاروانِ تحقیق کے لئے رہنما ثابت ہو گی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ زیرِ نظر مجلّے کے دیگر مندرجات بھی بہت افادیت لئے ہوئے ہیں۔ مختلف لکھنے والوں کی کاوشیں دھنک رنگ بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ اس نوع کے کسی بھی جریدے کا شمارہ میرے نزدیک وصالِ یار کا سبب ہے۔ بہت سے احباب کی نگارشات کے ذریعے گویا خود ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ دور دراز بیٹھے، دیکھے اور ان دیکھے ہم قلم ساتھیوں سے ہم جلیسی کا موقع میسر آجاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک طرح کی روحانی مسرت اور دلی طمانیت کا احساس گھر بیٹھے مل جاتا ہے۔ چہار سُو بھی نہایت عمدہ اور احسن طریقے پر یہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کارِ خیر کے لئے آپ شاباشی اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اب ذرا یہ سنئے کہ چہار سُو کی سیر میں مشغول تھا کہ یکایک دل رابطے کی مثال کلاس میں پیدا ہو گئی۔ محترم کرشن کمار طور صاحب کے مکتوب نے تڑپا کر رکھ دیا۔ گزشتہ شمارے میں بندہ خاکسار ان کے ایک شعر پر لب کشائی کی جسارت کر بیٹھا تھا۔ اس کو طور صاحب نے تضحیک پر محمول کیا حالانکہ میں نے ان کے ایک اچھے شعر کی ردیف "میں میں" کے صوتی عیب کی طرف اشارہ کیا تھا جو شعر کے حسن کو ماند کرتا دکھائی دیتا ہے۔ البتہ مجھے اعتراف ہے کہ "میں میں" کے حوالے سے از راہِ شوخی مجھے گاندھی جی کی بکری یاد آ گئی تھی، جس کا میں حوالہ دے بیٹھا اور یہی بات طور صاحب کو ناگوار گذری اور انہوں نے میری اس "ادبی چہل" کو تضحیک سمجھ لیا۔ حالانکہ تضحیک و توہین یا اس نوع کے دوسرے الفاظ اپنے اصل معنی کے ساتھ اس تحریر کی قبا میں سما ہی نہیں سکتے۔ جو کچھ ہوا سہواً اور از راہِ ظرافت ہوا کہ حیون ظریف کے عزت تو بہر حال اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم اگر میرے الفاظ سے کرشن کمار طور صاحب کی دل شکنی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں بلکہ اس لفظ معذرت کی جگہ طور صاحب کو جو لفظ بھی مترادف مل سکے اپنی مرضی سے رکھ کر میرے نام موسوم کر دیں میں ان کا نہایت شکرگزار ہوں گا کیونکہ دل شکنی اور انسان کی تضحیک میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اس موقع پر ایک حقیقت کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں، یہ شعر و شاعری، لکھنا پڑھنا اور نقد و نظر سب محض من بہلانے کی باتیں ہیں، میں ہوں یا اور کوئی، جو بھی تخلیق کرتا ہے وہ کوئی الہام نہیں کہ جسے بے عیب اور حرفِ آخر سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ہماری یہ باتیں خدا کی بستی میں کسی بڑے انقلاب کا سبب بن سکتی ہیں۔ لہٰذا یہ خیالی باتیں جسے ہم نے ادب کا نام دے رکھا ہے کوئی دین دھرم نہیں کہ جس کو عبادت اور پوجا پاٹھ کا درجہ دے دیا جائے۔ بس یوں جانئے کہ ایک دانائی کا منظر ہے، مختلف لوگ، مختلف دماغوں سے مختلف سوچوں کو جنم دیتے ہیں، زبان و بیان کے مختلف انداز و پیرائے ہوتے ہیں، اس نوع کو فن سے موسوم کر دیا گیا ہے اور یہ جو ہم ایک دوسرے کے لئے مبصرانہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں، اسے بھی بہ شکل تذکرہ سمجھنا چاہئے، پتھر پر لکیر نہیں ہوتی، اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔ انسان بہر حال غلطی کا پتلا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی جگہ بندے کا کلام لا ریب فیہ کہلاتا۔

(پروفیسر خیال آفاقی)

محترم گلزار جاوید۔ سلام و رحمت!

چہار سُو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ قرطاس اعزاز ڈاکٹر وحید قریشی کے نام دیکھ کر مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی۔ وہ ہر لحاظ اور ہر حوالے سے اس اعزاز اور ایسے سرفراز کیے جانے کے سزاوار ہیں۔ مجھے "چہار سُو" کی یہ ادا بہت پسند آئی ہے۔ ایک ایسا محقق، نقاد، معلم اور منتظم جس نے کئی نسلوں کی تعلیم و تربیت میں اساسی کردار ادا کیا۔ جس سے اکتسابِ فیض کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو پہنچ رہی ہے۔ جو بہت ہی شفیق اُستاد ہیں۔ جن کے فیضان کا سلسلہ سخت علالت پر بھی جاری ہے۔ ان کے نام چہار سُو کی اشاعت کا انتساب آپ کی علم دوستی اور ادب فہمی کی بہترین مثال ہے۔ مجھے اکثر ڈاکٹر

صاحب کی خدمت میں شرفِ باریابی کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ مرتبہ علم و ادب کا نیا
نکتہ لے کر واپس آیا۔ یقیناً ایک سطر کے اثرات کو بقائے دوام حاصل ہے۔
آپ نے نہایت جامعیت سے میرے محترم اُستادِ مکرم کی شخصیت کے جملہ
پہلوؤں کا اس اشاعت میں احاطہ کرلیا ہے۔ تحسین اور تہنیت کے لیے فی الوقت
میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ خوشبو کر از گفتار سے نہیں اپنی مہکار سے اپنے آپ
کو منواتی ہے۔ یقیناً چہارسُو کی مہکار ہر قاری کے کتب خانے میں محسوس کی جائے
گی میں بھی اس کی خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کر رہا ہوں۔

(ڈاکٹر غفور شاہ قاسم)

بہت محترم گلزار جاوید صاحب، سلام اور احترام۔

چہارسُو ملا اور پاکستان سے واپس آتے ہی ملا اس لئے پہلے سے
زیادہ اچھا لگا کیونکہ سفر کی تھکن کم محسوس ہوئی۔ سعد فاضلی صاحب کا انٹرویو اور ان
پر لکھے گئے مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ آپ کے انٹرویو پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ یہ
ہنر آپ سے سیکھا جائے کتنا کچھ انٹرویو کے سوال پڑھ کر سیکھنے کو ملتا ہے اس پر
حیرت بھی ہوتی ہے اور شکر گزاری کا موقع بھی ملتا ہے۔ محسن بھوپالی صاحب کی
نظم پڑھی۔ وہ اب ہم میں نہیں رہے۔ اللہ مغفرت کرے اور ان کے درجات
بلند کرے۔ بہت شفیق بزرگ اور انسانیت دوست شخصیت کے مالک تھے، ہمیشہ
حوصلہ افزائی کرتے تھے اور کیا خوب شاعر تھے۔ اس بار افسانوں میں آپ کا
''تقدیس کا شجرہ'' بازی لے گیا مگر ناچ مجھے بے چارے خود کچھ نہیں پارہے کہ ان
لوگوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ ''صاحب'' کے کرتوتوں کی وجہ سے ہے اور
''صاحب'' کب کسی کی سنتے ہیں۔

(فیصل عظیم)

محبی گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

''چہارسُو'' موصول ہوا۔ پڑھ کر حظ اندوز ہوا ہوں۔ اب کے آپ
نے اُردو زبان و ادب کے استاد کامل اہلِ نظر محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی
کو ''قرطاسِ اعزاز'' کے تحت پر بٹھلایا ہے۔ آپ نے یہ کام خوب کیا۔ بلکہ میں یہ
بھی عرض کروں گا کہ آپ نے اس سلسلے میں دیر کردی۔ جناب ڈاکٹر وحید قریشی
ایسے لوگ صحیح معنوں میں نابغۂ روزگار ہیں جن کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔
''چہارسُو'' کی اشاعت سے ان کی فضیلتوں کا تفصیلی حال مجھے پہلی مرتبہ معلوم
ہوا۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بھائی ''چہارسُو'' یقیناً ملک کے ادبی پرچوں
میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

(صدیق شاہد)

برادرِ دل کشا محترم گلزار جاوید صاحب!

''چہارسُو'' کے دونوں شمارے (سعد فاضلی نمبر اور ڈاکٹر وحید قریشی
نمبر) آپ کی عنایاتِ خاص کا وصف لیے میرے زیرِ مطالعہ ہے، دلِ مضطرب

اور تقاضۂ تحقیقات کا جواب کوئی کیا دے سکے گا!

''چہارسُو'' کا اعتبار اور باوقار اشاعتی تسلسل ادب سے آپ کی
سچی وابستگی کا ایک ایسا اعلان نامہ ہے جسے ہر انصاف پسند قلمکار نے ہمیشہ تحسین
سے یاد رکھا ہے۔ یہ جدید تحقیقی شعری اور نثری تخلیقات کا بلاشبہ ایک ایسا مرقع ہے
جسے یکجا کرنے میں آپ نے عمرِ عزیز کی موجودہ منزل تک آتے آتے اور اس کا
معیار وضع کرتے کرتے کئی صبر آزما مراحل کا سامنا کیا ہے اور سرخرو ٹھہرے
ہیں۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ ادبی سرگرمی کو زندگی کا حصہ ہی نہیں بنایا، آپ نے تو
اسے مکمل زندگی کی شکل میں ڈھالا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ادب دوستی کے اس
روشن استعارے کو یونہی زندہ و جاوید رکھے۔ جناب سعد فاضلی ایسے عمدہ شاعر و
گیت نگار اور ڈاکٹر وحید قریشی ایسے تحقیق و تنقید کے ایک باقاعدہ اسکول کی
خدمات کو معیاری انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

(ڈاکٹر نثار ترابی)

مدیرِ محترم، سلام و رحمت۔

اس مرتبہ محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے علمی و ادبی شاہکاروں
سے مزین و مرصع ''قرطاسِ اعزاز'' پایا جس کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب کے تہہ
دل سے شکر گزار ہیں ہی مگر ساتھ ساتھ آپ کے اور آپ کے معاونین کے بھی
بہت ممنون ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جیسی کثیر الجہات شخصیت کی تحریر پیش کش مرحلۂ
آساں نیست بہت کوہ کنی و سحر خیزی چاہیے۔

پھر آپ کا تو اسمِ گرامی ادا ہی یوں بھی 'دنادیا' کے درمیان ٹھہرا
(اس کا سارا کریڈٹ تو ڈاکٹر مسرور احمد زئی صاحب لے گئے) جب دانش و
بینش یکجا ہوتے ہیں تو منفرد و ممتاز قرطاسِ اعزاز کا حصول دیگر منظوم و منثور
تخلیقات کا ظہور ہوتا ہے جو تاریخ اُردو ادب میں مستقبل کے ریسرچ زدہ طالب
علموں کے لئے مستقل اہم حوالہ قابلِ تردید بغیر غنی بنتا چلا جا رہا ہے۔

غالب کے یہاں خوف و ہراس کی کیفیات اور عصری صورتحال
کے کرب و اندوہ کا تجزیہ بڑی خوبصورتی و گیرائی سے کیا گیا ہے۔ نیز او راست
میں کئے گئے سوالات کی روشنی میں قارئین کو ڈاکٹر صاحب کی ہمہ جہتی و ہمہ دانی
شخصیت کے مختلف ادوار میں مسائل و آزمائشوں کے متوازی علمی و ادبی
کامرانیوں، مختلف عہدوں پہ متمکن کئے جانے نیز اُن کو فعال و موثر بنانے کے
سلسلے میں مستقل مزاجی، ارادے کی پختگی و مسلسل جدوجہد کا بخوبی اندازہ ہوا۔ مشتق
کے لوگوں میں مشتق صاحب نے اُن کی ذات کے متنوع زاویے بڑے دلچسپ و
انوکھے ڈھنگ سے قلمبند کئے اور اس میں کیا اشتباہ کہ بقول محترم منیر جعفری
صاحب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب خود اپنے اندر انجمن سموئے ہوئے ہیں اور اُن
سے متعلق پر قلموں و متنوع جہات کا احاطہ کرنا قلمی کوہ کنی سے کم نہیں ان جیسے
شاعر اور امکان نازنے اُن کے کلام کی نظر فروز دھنک سے متعارف ہوئے

ہے اُردو ادب کا بخت خوش اُفتادی رو بعد کے منفرد قطعے برجستہ فقرہ اُچھالتے اور حسِ مزاح سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید و نفسیات تخلیق سے نفسیاتی نکتۂ نظر سے لاشعور کوشوں کی نقاب کشائی کا سراغ پایا اور منظر عام پر لانا نقد و نظر کی دنیا کی نہایت غیر معمولی پیش رفت ہے۔ اُردو ڈائجسٹ کی سالگرہ کے حوالے سے بھی نہایت لطیف پُر مزاح اسلوب سے محظوظ ہونے کا موقع ملا ''تجزنو بہار'' میں اُن کے معاصرین اور شاگردوں کی آراء اُن کی شخصیت کے لاتعداد و قیمت زاویوں وزاویوں سے شناسا کرواتی ہیں۔

محترم پروفیسر مشکور حسین یاد یقیناً دنیائے غزل میں کبھی منفرد روائتی و اچھوتے قوافی سے اور کبھی عمومی ڈگر سے ہٹے ہوئے مضامین کو دو مصرعوں کی تنگنائے میں سمو کر سرزمینِ شاعری کو سیراب و فیضیاب کر رہے ہیں اس کے لئے پذیرائی پانا اُن کا حق ٹھہرتا ہے اُن کی تازہ غزل کا یہ شعر دیکھئے:
ہم یہیں نہیں ہوتے ہم کہیں نہیں ہوتے آگے پیچھے رہتا ہے درمیاں کا یہ منظر۔

شمسی آفتاب میں جواب آں نظم اور ایک شاعر اپنے مخصوص تناظر کے ساتھ متاثر کرتی ہیں۔ لینے اور دینے کے مراحل میں حالات و واقعات کے باسودہ شری خامیوں و خوبیوں کا جو عمل و ردِ عمل ہوا کرتا ہے وہ ''تکفین'' سے فنکارانہ طور پر عیاں ہوا ہے۔ دوسرا رنگ میں سفید و سیاہ کے تضاد دو وارث نے کہانی کی معنویت کو گہرائی عطا کی ہے کیونکہ ہر رنگ کا انسانی ذہن اپنی نفسیاتی استعداد کے مطابق اثر قبول کرتا اور ردِ عمل ظاہر کرتا ہے کہانیوں سے آپ نے ڈرامے کی جانب مراجعت کی اور قارئین کو اظہار کی مختلف جہت سے متعارف کروایا۔ عطار کے لونڈے کے مختلف سین متنوع کرداروں کی باہمی بات چیت کو سموئے ہوئے بتدریج آگے بڑھتے ہیں کیونکہ ہر کردار کی نسبت سے طرزِ اسلوب نہایت موزوں دلچسپ و برجستہ ہے نیز بے تکلفانہ و پُر مزاح مکالموں نے ڈرامے میں زندگی کی لہر دوڑا دی رکھی ہے۔

(شگفتہ نازلی)

محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام و نیاز۔

اس بار ''چہارسُو'' میں ڈاکٹر وحید قریشی سے متعلق معلومات قابلِ ستائش ہیں نیز خوف زدہ غالب اور عصری صورتِ حال عمدہ مضمون ہے پسند آیا۔ کافی خرد افروزی اور خوردہ بینی سے کام لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک بڑا نام ہے اور جائز ہے۔ آپ کا ڈاکٹر صاحب سے سوال و جواب غضب کا ہے بہت کچھ کرید کرید کر معلوم کر لیا ہے اور قارئین کے لئے ایک تحفہ بن گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے باب میں دوسرے مضامین بھی نہایت علمی اور معلوماتی ہیں۔ شعری حصہ بھی اچھا ہے ابھی تو پڑھ ہی رہا ہوں۔ جستہ جستہ پڑھتا ہوں لطف لے لے کر پڑھتا ہوں۔ میری عادت ہے سنجیدہ مطالعہ کرنے کی۔ محترم جعفر

جعفری سے کراچی میں متعدد بار مشاعروں میں ملاقات رہی تھی نہایت خلیق اور باصلاحیت شاعر تھے۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں سدا رکھے (آمین)

(شارق بلیاوی)

''چہارسُو'' نہایت تواتر سے مل رہا ہے اپنے تساہل پر بےحد شرمندہ ہوں و یہی بہت میں آپ کی مستقل مزاجی کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ غیر حاضری کا باعث میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو ادب یورپ اور امریکہ میں'' تھا مگر مقام شکر ہے کہ یہ تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا بلکہ ڈگری بھی ایوارڈ ہو چکی ہے امید ہے کچھ ہی عرصے بعد یہ مقالہ قارئین کے ہاتھوں میں ہو گا۔

تازہ شمارے کی بیشتر تحریریں نہایت وقیع ہیں۔ مصطفیٰ کریم مشکور حسین یاد، صدیق شاہد، حسن عسکری کاظمی کی رباعیات اور آپ کی تخلیقی کاوشیں پسند آئیں۔ بالخصوص ڈاکٹر وحید قریشی کے لیے ترتیب دیا گیا قرطاسِ اعزاز نہایت جاندار ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے حوالے سے اتنی ساری اچھی تحریروں کا ایک جگہ دستیاب ہونا میں اسے ایک خوشخبری ہی سے تعبیر کروں گا۔ ایسے صاحبانِ علم و ادب کے لیے گوشے ترتیب دینا ایک ادبی نیکی ہے اور آپ ایسی نیکیاں مسلسل کیے جا رہے ہیں۔

(ڈاکٹر جواز جعفری)

جناب گلزار جاوید تسلیمات۔

معمول کے مطابق آپ نے اب کی بار بھی اردو تنقید و تحقیق کے لیونگ لیجنڈ جناب ڈاکٹر وحید قریشی پر گوشہ قائم کر کے اعتراف عظمت بزرگاں کا ثبوت دیا ہے بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کثیر الجہات حیثیتوں کے حامل ہیں ان کے اردو زبان و ادب پر متعدد احسانات ہیں عمر کے اس حصے میں بھی ان کا قلم اردو کی ترقی و ترویج کے لیے رواں دواں ہے آپ نے براہ راست میں بعض فکر انگیز اور اچھوتے سوالات کے ذریعے ان کی شخصیت کے کئی نہاں گوشوں کے دروا کیے ہیں۔ بھرپور مضامین کے ساتھ ساتھ شعروں کا عمدہ انتخاب ہے اس ادبی دستاویز پر ڈاکٹر صاحب اور آپ کو خصوصی مبارک باد و تحسین و آفرین۔ بیشتر تازہ تخلیقات جدید و مابعد جدید فکری تناظر کے تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ منظوم و منثور حصے بھرپور ہیں بالخصوص شمشاد احمد، کیدار ناتھ شرما اور عمران مشتاق کے افسانے اپنے اپنے موضوعات میں ڈوب کر لکھے گئے ہیں بہر حال آپ کے افسانوں سے قدرے واقفیت ہے مگر ڈرامہ نگاری کے بارے معلوم نہ تھا پہلی بار آپ کا ڈرامہ نظر نواز ہوا جس میں آپ نے عصری رویوں کو خوب سمویا ہے۔

(غلام شبیر اسد)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم!

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ ملک کے معروف ادیب، دانشور ڈاکٹر وحید